

جہانگاہ

PDFBOOKSFREE.PK

ریاض احمد

پیش لفظ

مظلوم اور پسے ہوئے طبقے کی نمائندہ تحریر، انتقام کے لئے طاقت حاصل کرنے کا جنون رکھنے والے نوجوان کی پراسرار زندگی کے پراسرار واقعات سے مزین آپ بیتی..... جاگیردارانہ نظام کے ظلم و استبداد کا لرزہ خیز سلسلہ جس میں آج بھی انسان کا استحصال اُسی طرح ہو رہا ہے جس طرح مطلق العنان بادشاہوں کے دور میں ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس کہانی میں اُونٹ اُس وقت پہاڑ کے نیچے آتا دکھائی دیتا ہے جب مذکورہ داستان کا مرکزی کردار ”زابد“ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر جادوئی علوم حاصل کر کے پراسرار قوتوں کے بل پر اپنے تباہ شدہ کنبے کا انتقام لینے کے لئے اس ظالمانہ نظام کے خلاف میدانِ عمل میں نکل آتا ہے۔ اور پھر معرکہ درمعرکہ یہ داستان دلچسپیوں کے افلاک کی طرف محور واز نظر آتی ہے۔

سانپوں کے قبیلے کی شہزادی ”کول“ اور جنات کے قبیلے کی شہزادی ”کرن“ ان دونوں کے ذکر کے بغیر کہانی کا تعارف مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں کردار حسن اور رومان کی دنیا کے نہایت اہم کردار ہیں جنہوں نے قدم قدم پر ایثار اور وفا کی ایسی اچھوتی مثالیں قائم کی ہیں کہ انسانوں کو مشورہ دینے کو جی چاہتا ہے کہ ان سے ایثار و وفا کا فن حاصل کریں۔

قارئین کرام! ”جلتا کفن“ کا طلسماتی ماحول، خوبصورت تانا بانا، واقعات کا بے ساختہ پن اور کہانی کا مجموعی تاثر آپ کو مدتوں اپنے حلقہ اثر میں رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

”جے ہو کرو بابا کی جے ہو۔“ زاہد نے گرد بابا کے پاؤں پکڑتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑا ہوا کفن گرد بابا کے سامنے رکھ دیا۔ آج پورے بیس دن بیت گئے تھے کہ زاہد ہر رات ایک کفن بابا کی خدمت میں پیش کرتا تھا۔

”بابا کل میرے عمل کی آخری رات ہے۔“ زاہد نے اپنے لیوں پر مسکراہٹ بکھیر کر کہا تو گرد بابا نے ایک بھر پور نظر زاہد پر ڈالی۔

انگارے برساتی ہوئی گرد بابا کی آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے زاہد نے نظریں نیچی کر لیں۔ گھناؤنے کام کرتے وقت زاہد کو کسی قسم کا خوف نہ آتا تھا لیکن گرد بابا کا سامنا کرتے ہوئے نجانے کیوں زاہد کانپ جاتا تھا۔

گرد بابا کی جلتی آنکھیں دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے گرد بابا اسے ابھی جلا کر راکھ کر دے گا۔ ابھی اس کا تمام جسم جھلسا کر رکھ دے گا۔ اتنا خوف آتا تھا گرد بابا کی آنکھوں سے۔ وہ پہلے دن ہی گرد بابا کو مان گیا تھا۔ پہلے ہی دن وہ گرد بابا کے قدموں میں گر پڑا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ بابا ہی اسے اس کی منزل تک پہنچائے گا۔ اسے وہ سب کچھ عنایت کر دے گا جس کی وہ تمنا رکھتا ہے۔

صبح کا اجالا پھوٹنے والا تھا۔ گرد بابا اپنے خیمے میں آگ جلائے بیٹھا تھا اور شاید اپنے مرید خاص زاہد کا ہی انتظار کر رہا تھا جو مسلسل کامیابی کی جانب رواں دواں تھا۔ جس کی آنکھوں میں بھی آہستہ آہستہ چمک آنے لگی تھی جس کی صورت میں دبدبہ دکھائی دینے لگا تھا۔

”ہاں بیٹا تم منزل کے بہت قریب پہنچ چکے ہو اور میں جانتا ہوں کہ تم ضرور کامیابی سے ہمکنار ہو گے۔ میں نے جیسا کہا، تم نے ویسے ہی کیا۔ کل رات کے بعد تمہارے ہاتھ میں تمام جنتی طاقتیں آجائیں گی اور جس مردے کو چاہو گے اپنا غلام بنا لو گے۔ ان سے جو چاہو گے، پاسکو گے۔ تمہاری آنکھوں میں اس قدر وحشت آجائے گی کہ جسے بھی گھور کر دیکھو گے،

کبھی حاصل نہ کر سکوں۔“ زاہد نے حسرت بھری نگاہیں گرو بابا پر ڈالیں۔
 ”دے دوں گا تمہیں اپنی ساری طاقتیں۔ دے دوں گا، ابھی صبر کرو۔“
 لیکن زاہد کو اپنی زندگی یاد تھی، اس کے اندر انتقام کی جلتی آگ تھی۔

زاہد پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ والد صاحب فوت ہو چکے تھے۔ گھر میں غربت نے ڈیرے بمار رکھے تھے۔ سارا سارا دن محنت مزدوری سے بھی گھر کا خرچ نہیں چلتا تھا۔ بہنوں کی خواہش پوری کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں اپنی بہنوں کو دیکھتا تو کڑھتا رہتا۔ ماں سارا دن جاگیردار کی حویلی میں کام کرتی رہتی۔ ان کی بچی کچھی باندھ کر لے آتی اور وہی روکھی سوکھی کھا کر سبھی سو جاتے۔ صبح کو فاقہ ہوتا، دوپہر کو ماں حویلی میں کام کر کے کچھ کھانے کو لاتی۔ جاگیردار کے ظالم کارندے جب چاہتے ان کے گھر میں گھس جاتے۔ بہنوں سے گھنیا اور ناقابل برداشت مذاق کرتے۔ جاگیردار کے بیٹے بھی گھناؤنی حرکتیں کرتے۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ کوئی کہنے والا نہ تھا۔

جاگیردار اور اس کے کارندوں کے چند ایک واقعات لوگوں کے سامنے تھے۔ ایک نوجوان کی ٹانگیں کاٹی گئی تھیں۔ ایک شخص کی دونوں آنکھوں میں چاقو چلا کر اندھا کیا گیا تھا اور چند عورتوں کے کپڑے پھاڑے گئے تھے۔ ایسے واقعات پر لوگ بے بسی کے عالم میں زبانوں کو تالے لگائے رکھتے، آنکھیں جھکائے رکھتے۔ وہ جو کچھ کہتے تھے، اس پر آمین کہتے۔ زاہد کے گھر میں خوبصورتی تمام گاؤں والوں سے زیادہ تھی کیونکہ ماں شہر کی تھی اور اولاد کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی تھی۔ انہیں سنواری رہتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب اپنا لباس صاف ستھرا رکھتے۔ بچے گھر کو صاف ستھرا رکھتے اور اپنے چہروں کو بھی صاف رکھتے لیکن جب سے جاگیردار نے زاہد کے والد کا قتل کر دیا تھا، تب سے ان لوگوں کے گھر میں کچھ نہ بچا تھا۔

اب نوبت یہ تھی کہ جسم کے کپڑے بھی جگہ جگہ سے پیوند شدہ دکھائی دیتے تھے۔ زاہد کی تین بہنیں اس سے بڑی تھیں، جوان تھیں جبکہ دو چھوٹی تھیں۔ زاہد کی اپنی عمر اس وقت 17 سال کی تھی، جب گھر کا تمام بوجھ اس پر پڑ گیا۔ بہنوں کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ جاگیردار کے ظالم بیٹوں اور ظالم ملازموں سے خوف آتا تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ انہیں تنگ کرتے۔ بڑی بہن نے خود کو بچانے کی غرض سے اپنے دل پر چھری چلا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ دوسری بہن بھی ان ظالموں کے ہاتھوں سے بچتے ہوئے گلے میں دوپٹہ ڈال کر دنیا سے منہ موڑ گئی تھی اور تیسری بڑی بہن کو ان ظالموں نے خود مار کر کھیتوں میں پھینک دیا

جلا ڈالو گے۔ تمہارے سامنے اس کے جسم کا تمام گوشت پگھلتا دکھائی دے گا۔ تمہاری آنکھیں ایک انسان کو ڈھانچہ بنا سکیں گی، عیش کرو گے پوری زندگی، عیش کرو گے۔“ بابا نے زاہد کے کندھے پر ہتھکی دی۔

”بابا آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اپنی منزل کے بالکل سرے پر ہوں۔ صرف ایک قدم آگے رکھنا ہے اور اس حصے پر پہنچ جاتا ہے جہاں سرتیں ہی سرتیں ہوں گی۔ جہاں وہ سب کچھ میرا منتظر ہوگا کہ جسے چاہا پالیا۔ گرو بابا جنات تو اب بھی میرے قبضے میں آچکے ہیں۔ جانتے ہیں، آج جب میں قبر کھود رہا تھا تو ایک سات سروں والا جن میرے سامنے آ گیا۔ کہنے لگا، میرے آقا میں یہاں کے تمام جنات کا سردار ہوں اور تمہارا غلام بن گیا ہوں۔ اب تمہیں عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حکم کریں، جلا ڈالوں تمام دنیا کو۔ آگ لگا دوں ارد گرد کے تمام دیہاتوں اور بستوں کو۔ سات سروں والے جن کی یہ باتیں سن کر میں قہقہہ لگانے لگا اور اس سے کہا کہ نہیں ابھی تم جاؤ۔ جب تک میں اپنا عمل پورا نہ کر لوں، تمہاری طاقت کا سہارا نہیں لوں گا۔ بابا جب وہ غائب ہونے لگا تو زمین پھٹتی دکھائی دی اور اس کے منہ سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ ایسے لگا جیسے وہ مجھے بھی جلا ڈالے گا۔ ایک لمحہ تو خوف آیا لیکن میری زبان پر آپ کا بتایا ہوا ورد جاری تھا۔“

گرو بابا زاہد کی یہ بات سن کر قہقہہ لگانے لگا اور بولا۔

”تم نے ٹھیک کیا ہے۔ جب تک اپنا عمل مکمل نہیں کر لیتے، ان جنات کی باتوں میں نہ آنا ورنہ تمہیں جان کا خطرہ ہے۔“

زاہد جو بھی کفن لا کر بابا کے سامنے رکھتا، بابا اسے آگ لگا کر ہاتھ میں پکڑ کر قہقہہ لگاتا اور زاہد بھی قہقہہ لگاتا۔ وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ وہ سب گھناؤنے کام کر رہا ہے۔ یہ شیطانی ہیں اور آخرت میں اس کی بہت عبرتاک سزا ہے۔ اسے تو صرف دولت چاہئے تھی، جنات پر قبضہ چاہئے تھا۔ مردوں پر حکمرانی چاہئے تھی۔ ہر کسی کا اپنے سامنے سر جھکانا چاہتا تھا۔ گرو بابا نے اسے ایسی ایسی سہانی باتیں سنا ڈالی تھیں کہ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ خیالات کی دنیا میں جنات پر حکمرانی کرتا تھا۔

آج اپنی کامیابی پر گرو بابا اور زاہد قہقہہ لگاتے جا رہے تھے۔ ”دیکھا میرے شیطانوں کی طاقت کو، جنات ابھی تمہارے سامنے غلام بننے کو تیار ہیں۔“ گرو بابا نے کہا۔

”ہاں گرو بابا ہاں، لیکن ایک بات ہے۔ جو طاقتیں آپ کے پاس ہیں، وہ شاید میں

پوری طرح زخمی اور خون میں ڈوبا پڑا ہوا پایا۔ پھٹے ہوئے کپڑے اس کے اپنے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ رات بھر وہ زخموں سے کراہتے ہوئے خود کو گھسیٹتے ہوئے قبرستان تک چلا گیا اور ایک گڑھے میں جا گرا۔

یہ قبرستان اس قدر خوفناک تھا کہ دن کی روشنی میں بھی لوگ یہاں آنے سے کتراتے تھے لیکن وہ 17 سالہ جوان ایک لمحہ کو بھی نہ گھبرایا۔ اپنی زندگی بچانے کی غرض سے اونچے اونچے سرکنڈوں والے قبرستان میں پناہ لے لی۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں گاؤں والے نہیں آئیں گے۔ وہاں دن بھر زخمی حالت میں لیٹا رہا اور جاگیرداروں سے انتقام لینے کا سوچتا رہا۔ جب سورج اپنی روشنی مدھم کرتے ہوئے غروب ہو گیا اور دن کی سفید چادر پر تاریکی نے اپنی سیاہ چادر پھیلا دی تو وہ گھٹانے قبرستان سے گرتے گرتے زخمی حالت میں دوسری طرف نکل گیا اور رات بھر کبھی بیٹھ جاتا اور کبھی چلتا ہوا اپنے گاؤں سے نکل کر دوسرے اور پھر تیسرے گاؤں تک جا پہنچتا۔ اب اسے اپنی جان کا خطرہ نہ رہا تھا۔

اب وہ زندہ رہ سکتا تھا اور جاگیرداروں کا مقابلہ کرنے کا پروگرام ترتیب دے سکتا تھا۔ اب وہ ہر رات سفر جاری رکھتا تھا۔ لوگ اسے خون آلودہ کپڑوں میں زخمی حالت میں دیکھتے تو کہانی پوچھنے کی کوشش کرتے تو وہ صرف اتنا کہہ دیتا کہ ”اس کا یہ حال چور، ڈاکوؤں نے کیا ہے اور وہ بڑی مشکل اور کوشش سے یہاں تک پہنچا ہے۔“

ایک گاؤں میں اسے اچھے کپڑے مل گئے۔ جسم کے زخموں پر لگانے کے لئے مرہم مل گئی۔ بھوکے پیٹ کے دوزخ کو بھانے کے لئے کھانا مل گیا۔ چند دن تک وہاں رہا۔ اس کے بعد وہاں سے بھی چل پڑا۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا، لہذا ایک دن چلتے چلتے وہ ایک قبرستان کے قریب سے گزرا تو وہاں ایک بوڑھے آدمی کو بیٹھے پایا۔ رات کی تاریکی میں گندے لباس میں ملبوس بوڑھے کو دیکھ کر پہلے تو وہ خوفزدہ ہوا لیکن پھر دل کو تسلی دی اور ہمت کر کے سردی میں بیٹھے ہوئے اس بوڑھے شخص کے پاس چلا گیا اور چپکے سے اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ ابھی چند لمبے ہی وہ بیٹھا تھا کہ بابا بولا۔

”زائد بچے تم بہت دگھی نظر آ رہے ہو۔۔۔۔۔“

بابا کی زبانی اپنا نام سن کر اور دل کی کیفیت پر کھنے پر زائد چونک سا گیا کیونکہ ایک تو بابا کا منہ دوسری طرف تھا، دوسری آنکھیں بند تھیں۔

ایک لمحہ کو تو وہ چونکا لیکن جلد ہی چہرے پر خوشی کے تاثرات بکھیرے۔۔۔۔۔ وہ بابا جی

تھا۔

ایک سال میں تین جوان بہنوں کی موت سے زائد تڑپ کر رہ گیا اور دل کو مضبوط کرتے ہوئے ماں کے منع کرنے کے باوجود بھی جاگیردار کے ڈیرے پر جا کر گالیاں نکالتا رہا۔ جو جومنہ میں آیا، بولتا رہا اور بہنوں کی موت کا انتقام لینے کو کہتا رہا۔

ایک چھوٹی عمر والے بچے کی زبانی رنگ رنگ کے الفاظ سننے کے بعد حویلی جیسے کانپنے لگی تھی۔ جیسے اس میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی زائد کی گردن اڑانے کی، اس کی زبان کھینچنے کی جدوجہد کر رہا تھا لیکن جاگیردار نے بھی کورو کے رکھا تھا۔ شاید وہ اسے انسانوں سے نہیں، اپنے کتوں سے مروانا چاہتا تھا۔ ماں کا آنسوؤں بھرا لہجہ بھی زائد کو جاگیردار کے ہاتھوں سے نہ بچا سکا۔ اس کے بندھے ہاتھ بھی زائد کو نہ بچا سکے، منت سماجت کبھی کچھ بیکار گیا۔ یوں سرشام ہی زائد کی دونوں ٹانگوں پر سے باندھ کر گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹا گیا اور ساتھ ساتھ اعلان بھی کیا جاتا رہا کہ جاگیردار کے سامنے زبان چلانے کی سزا یہ ہوتی ہے۔

گاؤں والے سر جھکائے زائد کے تڑپتے لہولہان جسم کو دیکھتے رہے۔ کبھی اس پر لاتوں کی بارش ہوتی، کبھی ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے اس پر برستے۔ پورے گاؤں میں گھسیٹنے کے بعد جب انہوں نے اس کی حالت دیکھی اور اندازہ لگا لیا کہ یہ اب زندہ نہیں بچے گا تو باہر کھیتوں میں پھینک آئے اور اعلان کر دیا کہ اگر کوئی شخص اسے اٹھا کر وہاں سے لایا تو اسے بھی گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹا جائے گا۔

لوگ خوفزدہ ہو گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جاگیردار صرف بولتا ہی نہیں، عمل بھی کرتا ہے۔ اب لوگوں نے اندازہ لگا لیا کہ زائد کے جسم کی رات بھر جاگیردار کے کتے بوٹیاں نوچتے رہیں گے۔ اس کی ہڈیاں پسلیاں چباتے رہیں گے۔

رات ڈھلتی گئی، لوگوں کو زائد کا مردہ چہرہ دکھائی دیتا رہا کہ صبح سب سے پہلے اس کی بکھری ہوئی ہڈیوں کی خبر ملے گی لیکن صبح کو ایسا نہ ہوا۔۔۔۔۔ وہاں چھپر کنارے کھیتوں میں زائد کی ہڈیاں نہ بکھری تھیں بلکہ وہ خود وہاں سے غائب تھا۔ لوگ یہی سمجھتے رہے کہ جاگیردار کے کتے زائد کا زمین پر بکھرا ہوا خون بھی چاٹ گئے ہیں۔ ماں، بہنوں کی زندگی کا یہی ایک سہارا تھا جو مٹی میں مل چکا تھا، لہذا ماں نے اپنی دونوں بچیوں کو ان درندوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر کسی رشتہ دار سے ملنے کے بہانے ہر چیز چھوڑ کر کہیں اور جا کر پناہ لے لی۔

ادھر دوسری طرف زائد کو اللہ نے بچانا تھا کہ آدھی رات کو اسے ہوش آیا تو خود کو

کے پاؤں دبائے لگا۔

”بابا جی آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں دھکی لڑکا ہوں اور میرا نام زاہد ہے؟“

زاہد کی اس بات پر بزرگ نے آنکھیں کھولیں تو آنکھوں کی پیش اور جلن سے اس کا تمام جسم ڈر اور خوف کے سینے سے بھگنے لگا۔ آنکھیں ایسی تھیں جیسے شعلے اگل رہی ہوں۔

”بچہ جو میرے پاس طاقتیں ہیں، انہوں نے مجھے تمہارا نام ہی نہیں، تمہارے دل کی تمام کیفیت تمہارے گھر کی تمام کہانی تک بتا دی ہے۔“

بزرگ کی زبانی یہ الفاظ سنتے ہی زاہد بے تابی کے سے انداز میں بولا۔

”بابا جی، کیا کہانی ہے میرے گھر کی؟ کیا بتایا ہے آپ کی طاقتوں نے آپ کو؟“

”بچہ تم جس گاؤں میں پانچ بہنوں اور ایک ماں کے ساتھ رہتے تھے، وہاں کے جاگیرداروں نے.....“

”ہاں بابا جی ہاں اور کیا.....“ زاہد چلانے لگا۔ بزرگ کو جھنجھوڑنے لگا۔

”سب کچھ بتاؤں گا بچہ، سب کچھ جانتا ہوں۔ تیرے اندر کو بھی جانتا ہوں اور باہر کو بھی۔ تیری تین جوان بہنیں جاگیرداروں کی وجہ سے قبروں میں دفن ہو گئیں۔ تمہیں گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹا گیا۔“

یہ الفاظ سنتے ہی زاہد بزرگ کے پاؤں میں گر گیا۔

”گرو بابا مجھے آپ ہی کی تلاش تھی۔ میں جس مقصد کو لے کر گھر سے نکلا تھا، آپ کی شکل میں پورا ہو گیا..... گرو بابا اپنی طاقتوں کو کہو کہ وہ جاگیرداروں کی حویلی کو جلا ڈالیں۔ ان بد معاش لوگوں کو جلا ڈالیں۔“

یہ سنتے ہی بابا کے منہ سے بھیا تک قہقہے ابھرنے لگے۔ ایک نظر زاہد کو دیکھا۔ زاہد کو پھر محسوس ہوا جیسے وہ گرو بابا کی آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے جل جائے گا، جھلس جائے گا۔

”بچہ یہ کام تم خود کرو گے۔ تم خود یہ طاقتیں حاصل کرو۔ تم خود اپنی جنگ لڑو۔“

”ہاں گرو بابا، مجھے بتاؤ کہ یہ طاقتیں کیسے ملیں گی؟ میں حاصل کروں ایسی طاقتوں کو مجھے بتاؤ گرو بابا۔“ زاہد روتے ہوئے گرو بابا کے پاؤں دباتا جا رہا تھا۔

”ابھی صبر کرو، جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ بہت مشکل کام ہے۔ ان طاقتوں کو جمع کرنا، حاصل کرنا دل گردے کا کام ہے۔ کیا تمہارے اندر دل ہے، جگر ہے؟“

”ہاں بابا میرے پاس مضبوط دل بھی ہے اور شیر والا جگر بھی ہے۔“

زاہد کی معصومانہ بات سن کر بابا قہقہے لگاتا ہوا چنچا۔

”دیکھ سکو گے بھیا تک صورتوں کو؟ قبروں سے نکلتے ہوئے مردوں کو؟“

گرو بابا کی یہ بات سنتے ہی زاہد ڈر اور خوف سے کانپ کر رہ گیا۔ جن بھوتوں کا تصور ذہن میں لاتے ہی اس کا جسم کانپنے لگا اور اسے ایسے لگنے لگا جیسے اس کے ارد گرد جن بھوت اور چڑیلیں بھیا تک شکلوں کے ساتھ منڈلا رہی ہوں۔ اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ قبرستان زلزلے کی مانند ہلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

”گرو بابا میں کیا کروں؟“ زاہد نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”بچہ کہا ہے کہ غیبی طاقتوں پر قبضہ جمانے کے لئے مشکل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور تم ابھی چھوٹے ہو۔ تمہارے اندر شیر کا جگر نہیں ہے۔ واپس لوٹ جاؤ۔ جن بھوتوں کے چکر میں مت پڑو۔“

لیکن زاہد کہاں جاتا۔ کس کے پاس جاتا، نہ تو اس کا کوئی ٹھکانہ تھا اور نہ ہی اپنے کنبہ کے لوگ۔ وہ تو بے گھر اور تنہا تھا۔ ہر چیز کو لٹانے کے بعد یہاں تک پہنچا تھا۔ دن رات وہاں ہی گزرنے لگے۔ وہ ہر وقت گرو بابا کی خدمت میں لگا رہتا کہ کسی طرح بغیر عمل کئے بابا اسے اپنی طاقتیں دیدے اور وہ جاگیرداروں سے بھیا تک انتقام لے۔

گرو بابا کے پاس رات کی تاریکی میں عجیب و غریب شکلوں والی عورتیں اور مرد آتے رہتے اور شاید یہ سب گرو بابا جان بوجھ کر ایسا کرتا تھا کہ کسی طریقے سے زاہد کا دل مضبوط ہو جائے اور زاہد بھی یہ بات جانتا تھا کہ گرو بابا کے ہوتے ہوئے یہ عجیب و غریب شکلوں والی مخلوق اسے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

چھ ماہ کا عرصہ اس ویرانے میں اسی خوفناک قبرستان میں بیت گیا۔ راتوں کی تنہائیوں میں وہ اکثر بھیا تک شکلوں کو دیکھتا رہتا اور نوبت یہ آگئی کہ اب اسے جن بھوت سے ذرا بھی خوف نہ آتا تھا۔ گرو بابا بھی ہر بات پر کھ گیا اور کہا۔

”بچہ اب تم عمل کر سکتے ہو۔ جس قدر میرے پاس طاقتیں ہیں، تم بھی حاصل کر سکتے ہو۔ تم بھی انہیں اپنا غلام بنا سکتے ہو۔ راج کر سکتے ہو۔ ان پر، ہر چیز کو قبضہ میں لے سکتے ہو۔“

”ہاں گرو بابا، اب مجھ میں ہمت پیدا ہو گئی ہے۔ بتائیں کون سا عمل ہے جو تم نے پڑھ کر یہ طاقتیں حاصل کی ہیں۔ کیسے انہیں اپنا غلام بنایا ہے اور کیسے ہر بات کی خبر رکھ سکتے

تمہارے قبضہ میں آ جائیں گی۔ مردوں کو چلا پھرا سکو گے۔ جس مردے میں چاہو گے، اپنی پسند کا جن بھوت داخل کر سکو گے۔ اس سے گھناؤنے اور بھیانک کام کروا سکو گے۔“

ان باتوں سے زاہد کا تمام خوف، ڈر آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ اسے انتقام لینا تھا، ایک بھیانک انتقام۔

”بچہ اس میت کا کفن میرے پاس لانا ہے تاکہ شیطانوں میں میرا رتبہ اور بڑھ سکے۔“ گرد بابا قہقہے لگانے لگا۔

”ٹھیک ہے گرد بابا، ٹھیک ہے۔ میں کل سے یہ عمل شروع کر دوں گا۔ میں کامیابی حاصل کر دوں گا۔ تمام جنات پر قبضہ کر لوں گا۔ ان سے اپنے گاؤں کو آگ لگوا دوں گا۔ قتل عام کرادوں گا۔۔۔۔۔“ باقی باتوں میں رات گزر گئی۔

صبح ہوئی تو گرد بابا نے کہا۔

”جاؤ اپنے عمل کو شروع کرو، نئی تازہ قبر تلاش کرو تاکہ اس قبر کی میت کے کان میں ورد کر سکو۔ بچہ اپنے شیطانوں کو خوش کرنا ہے۔ وہ جتنا خوش ہوں گے، تم اتنے ہی کامیاب ہو گے۔“

زاہد اجازت لے کر شیطانی ورد زبان پر جاری رکھے گاؤں کے چکر لگانے لگا کہ کس گاؤں میں کوئی مرا ہے تاکہ وہ اس پر اپنا عمل کر سکے۔ ایک گاؤں سے ایک چھری، ایک ڈول اور ایک کھرپے لیا تاکہ کسی بلی اور چوہے کو ذبح کر کے خون جمع کر سکے۔ یہ تینوں چیزیں اس عمل کو کامیاب بنانے کیلئے ضروری تھیں۔ دن بھر مختلف گاؤں کے چکر لگانے کے بعد ایک قبرستان میں کسی کو قبر کھودتے دیکھ کر اس قبرستان میں رکا اور ایک کونے میں کچھ دیر بیٹھ کر آرام کرنے کے بعد دوبارہ وہاں سے چل پڑا تاکہ بلی اور چوہے کو تلاش کر سکے۔ یہ کام بھی اسے مشکل دکھائی نہ دیا۔ بلیاں، چوہے وافر مقدار میں وہ حاصل کر سکتا تھا۔ وہ تورات کا انتظار کر رہا تھا کہ رات ہو اور وہ اپنا عمل شروع کرے۔ سردیوں کے موسم میں اسے اپنی فکر نہ تھی۔ فکر تھی تو صرف اپنے عمل کی۔

ایک آگ تھی اس کی آنکھوں میں جس سے وہ گاؤں کے جاگیرداروں کو جلا دینا چاہتا تھا۔ اس سے بہنوں کی لاشوں کا بدلہ لے سکتا تھا۔ دن گزر گیا، سورج ڈھلتے ڈھلتے رات کی تاریکی چھوڑنے لگا۔ اندھیرے کو سیاہ سے سیاہ تر کرنے لگا تو زاہد ایک ہمت کے ساتھ اٹھا۔ گاؤں کے باہر سے اس نے ایک بلی کو پکڑا اور چھوٹے سے چوہے کو پکڑا۔ دونوں کو گاؤں سے

ہو؟“

زاہد کی باتیں سن کر گرد بابا بولے۔

”میرے پاس شیطانی علم ہے۔“

شیطانی علم کا نام سنتے ہی زاہد کے جسم کو ایک جھٹکا لگا لیکن دوسرے لمحے جوان بہنوں کی موت نظروں کے سامنے دکھائی دی۔ جاگیرداروں کے ظلم و ستم دکھائی دیے۔ اپنا آپ دکھائی دیا تو بولا۔

”یہ شیطانی عمل کیا کرنا ہے مجھے؟“

”بچہ تمہیں ہر وقت گندارہنا ہوگا۔ گندگی کو اپنے اندر داخل کرنا ہوگا۔“

”بابا یہ مشکل کام نہیں ہے۔ یہ تو میں کر لوں گا۔ آپ مجھے عمل بتائیں۔“

گرد بابا نے ایک گہری نظر زاہد پر ڈالی اور کہا۔

”بچہ میں جانتا ہوں کہ تم میں اب ہمت پیدا ہو چکی ہے لیکن یہ صورتیں جو تم ہر رات دیکھتے ہو، یہ تمہیں خوفزدہ کریں گی، تمہیں ڈرائیں گی۔ اگر تم ڈر گئے تو سمجھ لو کہ وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ تم غیبی قوتوں پر قبضہ حاصل کرنے کی بجائے خود ان کے غلام بن جاؤ گے۔

ان کے اشاروں پر تاجو گے۔“

”نہیں بابا نہیں، میں یہ نوبت نہیں آنے دوں گا۔ میں اپنا عمل ضرور پورا کروں گا۔ ان سے کبھی خوفزدہ نہ ہوں گا۔ آپ بس مجھے اپنے والا عمل بتائیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری آنکھوں میں بھی وحشت ہو، چمک ہو۔ جسے گھور کر دیکھوں وہ جل مرے۔“

زاہد کی بات سن کر گرد بابا قہقہے لگانے لگا اور بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ اور ایک شیطانی ورد کرنے کو کہا۔

”اکیس دن تک یہ ورد روزانہ ایک تازہ مردے کو قبر سے نکال کر اس کے کان میں پڑھنا ہے۔ ورد شروع کرنے سے پہلے ایک بلی اور ایک چوہے کے خون سے اپنے جسم کو غسل دینا ہے۔ دوسری رات دو بلیوں اور دو چوہوں کے خون سے غسل کرنا ہے یعنی جتنے دن ہوں گے، اتنے چوہے اور بلیاں ذبح کر کے غسل کر کے ورد کرنا ہے۔“

بابا کی باتیں سن کر زاہد ایک دفعہ تو کانپا، جسم کو جھٹکا لگا۔ پاؤں سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی لیکن جب گرد بابا کی دوبارہ بات اس کے کانوں سے نکل گئی کہ

”بچہ اگر تم اکیس دن کے اس عمل کو کرنے میں کامیاب ہو گئے تو تمام غیبی طاقتیں

گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔

اس کی بگڑی ہوئی اور بھیا نک شکل دیکھتے ہی زاہد کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ اس سے قبل کہ وہ بھیا نک شکل والا زاہد پر وار کرتا، اس نے ورد پڑھ کر اس پر پھونکیں مارنا شروع کر دیں۔ ایسا کرنے سے وہ بھیا نک صورت والا غائب ہو گیا تو زاہد نے ڈرتے دل کے ساتھ خوفزدہ آنکھوں کے ساتھ قبر کی کھدائی شروع کر دی۔ مردے تک پہنچا اور اس کا کفن اتارا۔ ڈول لاکر میت کے سامنے غسل کرنے لگا تو بھیا نک چیخوں سے قبرستان گونجنے لگا۔ قبر لرزنے لگی۔ میت حرکت میں آنے لگی۔

وہ سمجھ گیا کہ یہ سب جنات کا کھیل ہے۔ اس نے بھی ہمت نہ ہاری۔ حرکت کرتی میت کو دونوں ہاتھوں سے گرفت میں لیا اور اس کی چھاتی پر بیٹھ کر کان میں ورد شروع کر دیا۔ بھیا نک چیخیں اور بھیا نک صورتیں قبرستان میں گھومتی رہیں لیکن اس نے اس وقت تک مردے کو اپنی گرفت سے نہ چھوڑا جب تک اس نے اپنا عمل پورا نہ کر لیا۔ عمل ختم ہوا تو حرکت کرنے والی میت ساکت ہو گئی۔ اس نے ہلا ہلا کر اسے چیک کیا کہ وہ زندہ تو نہیں ہے لیکن وہ زندہ نہ تھی۔

یہ آسبی کمال تھا۔ کافی دیر تک میت کی حرکت کے بارے میں سوچنے کے بعد اس نے قبر کو بند کیا۔ کفن کو ہاتھوں میں پکڑا اور اپنے ہتھیرا سنبھالے گرد بابا کی طرف چلے لگا۔ وہاں پہنچ کر کفن اسے تھمایا تو وہ حسب عادت کفن جلا کر تھپتھپانے لگا۔ جب زاہد نے تمام کہانی گرو بابا کو سنائی تو گرد بابا بولا۔

”بچہ یہ معمولی کام ہیں۔ آگے چل کر منزلیں مزید بھیا نک دکھائی دیں گی۔ یہ آسبی طاقتیں آزاد رہنا پسند کرتی ہیں۔ کسی کی گرفت میں رہنا پسند نہیں کرتیں۔ ان کو قابو کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔“ اب تو بلیوں اور چوہوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، منزلیں مشکل ہوتی جا رہی تھیں۔

دس دن بیت گئے۔ زاہد نے بھی ہمت نہ ہاری۔ اگر ہمت ہار جاتا تو اس کی اپنی جان بھی جاسکتی تھی۔ جب جاگیرداروں سے انتقام کا سوچتا، جنات کو قبضہ میں لینے کا سوچتا، مردوں کو اپنا غلام بنانے کا سوچتا تو دل میں منڈلانے والے خوف و خطرات دم توڑ جاتے۔ ایک نئی ہمت، نئی قوت جسم میں دوڑنے لگتی۔ ہر کسی کو اپنے قبضہ میں لینے کی غرض سے عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی تنگ دو کرتا۔ دن گزرتے رہے۔ راتیں بھیا نک سے بھیا نک ہوتی رہیں۔ ہر

باہر ہی ذبح کیا۔ ڈول میں ان کا خون جمع کیا اور قبرستان چلا گیا۔

وہاں اسی قبر پر جا کر رک گیا۔ ہر طرح سے تسلی کرنے کے بعد کھرپے کی مدد سے قبر کی کھدائی شروع کر دی۔ تقریباً دو گھنٹے کی مشقت کے بعد وہ مردے تک پہنچ گیا۔ اس کا کفن اتارا اور پھر خود ڈول میں پڑے خون سے غسل کیا اور مردے کے کان میں ورد شروع کیا۔ عمل پورا کرنے کے بعد قبر کو دوبارہ بند کیا اور کفن اٹھا لے کر گرد بابا کی طرف بڑھنے لگا۔ رات کے اندھیرے میں گرد بابا کے پاس پہنچا۔ کفن اسے دیا۔

کفن کو آگ لگا کر بابا تھپتھپانے لگا۔ اب تو ہر روز زاہد کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ دن بھر نئی قبریں تلاش کرتا رہتا۔ بلیوں اور چوہوں کے خون سے غسل کرتا اور قبریں اکٹیر کر مردوں کے کانوں میں عمل کرتا اور دوبارہ قبر کو بند کر کے کفن لئے گرد بابا کے پاس آ جاتا۔

آج ساتواں دن تھا۔ سات بلیوں اور سات چوہوں کا انتظام کرنا تھا اور نئی کھدنے والی قبر دیکھنی تھی۔ دن بھر مارا مارا پھرتا ہوا ایک گاؤں کے قریب سے گزرا تو عورتوں اور مردوں کا ہجوم دکھائی دیا۔ سمجھ گیا کہ رونے والے لوگ کسی میت کو سامنے رکھ کر رو رہے ہیں، لہذا گاؤں کے قبرستان چلا گیا۔ وہاں قبر کھدتی دیکھ کر ایک طرف دھوپ میں بیٹھ گیا۔ بلیوں اور چوہوں کے خون سے پورا جسم بدبو سے بھر گیا تھا کیونکہ اسے نہانا منع تھا۔ گندارہنا تھا۔ گندگی والے کام کرنے تھے۔ شیطان کو خوش کرنا تھا، لہذا اس کے سامنے ہی قبرستان میں میت کو دفن کیا گیا۔

جب شام ڈھلنے لگی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور چھوٹے چھوٹے چوہوں کو پکڑنے لگا۔ بلیوں کو جمع کرنے لگا۔ رسیوں سے ان سب کو باندھنے کے بعد سیاہ اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرنے لگا اور جب اندھیرا ہر چیز کو سیاہ کر گیا تو اس نے بلیوں، چوہوں کو ذبح کیا، خون جمع کیا اور قبرستان کی جانب چل پڑا۔ قبرستان کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اسے وہاں کوئی چلتا پھرتا دکھائی دیا۔

زاہد ایک طرف چھپ کر بیٹھ گیا تاکہ وہ شخص اسے دیکھ نہ لے اور زبان پر ورد شروع کیا۔ جب ایک گھنٹہ گزرنے کے باوجود بھی وہ شخص قبرستان سے نہ نکلا تو زاہد پریشان ہو گیا۔ اسے اپنا عمل ادھورا ہوتا دکھائی دیتا لیکن وہ اپنے اس عمل کو مکمل کرنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا، لہذا اس نے ایک ہاتھ میں چھری پکڑی اور دوسرے ہاتھ میں کھریا اور اس شخص کو قتل کرنے کے لئے قبروں میں چلے لگا۔ ابھی وہ اس شخص پر پیچھے سے وار کرنے ہی والا تھا کہ اس شخص نے

رات بھیا تک شکلیں اس کے ارد گرد گھومتی رہیں۔ قبریں بلتی محسوس ہوتی رہیں۔ آج عمل کا پندرہواں دن تھا۔ پندرہ بلیوں اور پندرہ چوہوں کا انتظام کرنا تھا۔

دن بھر وہ جگہ جگہ بلیوں کو رسیوں سے باندھتا رہا۔ چوہوں کو پکڑتا رہا۔ لوگ تو اس کے قریب بھی نہ جاتے تھے۔ جسم سے اٹھنے والی بدبو سے لوگ اپنے ناک چھپا لیتے اور بھاگ جاتے اور وہ اپنے مقصد کو پانے کی خاطر کبھی کسی گاؤں جاتا رہتا۔ جس گاؤں میں اسے کوئی میت دکھائی دیتی، لوگوں کو چیختے چلاتے، روتے پینتے دیکھتا تو اس گاؤں کے قبرستان چلا جاتا۔ قبر کی نشاندہی کر لیتا اور پھر دیوانوں کی طرح آوارہ گردی کرتا رہتا۔ گندگی کے ڈھیروں سے گلی سڑی چیزیں پکڑ کر کھا لیتا۔ اپنا پیٹ بھر لیتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا، تب ہر چیز پر قبضہ جمانے کے بعد اپنی من مانی کر سکے گا۔ خوف و ہراس پھیلائے گا۔ جنات کے ذریعے اپنی ماں اور بہنوں کا کھوج لگائے گا اور اپنے انتقام کو آخری شکل دے گا۔

آج کے عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے تمام انتظامات کر لئے۔ صرف ایک میت کی ضرورت تھی۔ اس کی تلاش تھی۔ آج اسی قبرستان میں قبر کھد رہی تھی۔ وہ چوکن گرد بابا کے پاس بیٹھا رہا۔ لوگ اس بزرگ کو جانتے تھے بلکہ اس کی خدمت بھی کرتے تھے کیونکہ جب سے اس قبرستان میں اس گرد بابا نے ڈیرہ جمایا تھا، گاؤں پر چڑیلوں کی گرفت ختم ہو گئی تھی ورنہ یہاں گاؤں میں ہر رات بھیا تک چیخیں بلند ہوتی تھیں۔ جو شخص اندھیرے میں باہر نکلتا، بھیا تک چڑیلوں کا سامنا کرتے ہوئے گاؤں بھاگ جاتا اور بنار میں مبتلا ہو جاتا۔ دو تین اموات بھی ہو چکی تھیں۔

جب سے لوگوں نے اس بزرگ کو قبرستان میں ڈیرہ جمائے دیکھا تھا، سبھی مطمئن اور پرسکون ہو چکے تھے اور زاہد کے بارے میں بھی کسی کو یہ شک نہ گزرا تھا کہ وہ رات بھر کیسی بھیا تک حرکتیں کرتا ہے۔ ایک پاگل انسان رات بھر کیسے گھٹاؤں کھیل کھیلتا ہے۔ اگر انہیں علم ہو جاتا کہ رات کو ان کے دفنائے جانے والے مردوں کے کفن اتارتا ہے، قبریں کھودتا ہے تو نجانے کب کا گاؤں والے اسے زندہ ہی جلا دیتے، اسے جلا کر رکھ کر دیتے۔

لیکن زاہد نے نہ تو کسی کو شک ہونے دیا اور نہ ہی کوئی ایسی نشانی چھوڑی کہ گاؤں والے قبر دیکھ کر شک کرتے۔ شام کے وقت ایک میت کو اسی قبر میں لا کر دفن کر دیا گیا تو اندھیرا پھیلتے ہی زاہد اپنی جگہ سے اٹھا اور جہاں جہاں اس نے چوہے اور بلیاں باندھے تھے، ان کو

ذبح کر کے خون جمع کیا۔ جب پندرہ چوہوں اور بلیوں کا خون جمع ہو گیا تو قبر اکھڑنے لگا۔ یہاں اسے ایک لمحہ بھی خوف نہ آیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہاں کی چڑیلیں گرد بابا کے قبضے میں ہیں لیکن جب قبر کھود کر مردے کے قریب ہوا، بلیوں، چوہوں کے خون سے غسل کیا تو اس نے دیکھا کہ جو مردہ سامنے پڑا ہے، اس کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور ان میں وہی چمک ہے جو گرد بابا کی آنکھوں میں دکھائی دیتی تھی جس سے وہ خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ یہ چمک دیکھ کر پہلے وہ خوفزدہ ہو گیا لیکن پھر مسلسل ان کھلی اور چمکتی آنکھوں کو گھورنے لگا، شاید وہ ان آنکھوں کی چمک کو اپنی آنکھوں میں جذب کرنا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹہ تک وہ مسلسل ان کھلی اور چمکتی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ پھر حسب معمول اس میت کے کان میں اپنا درد پڑھنے لگا۔ اپنے عمل سے فارغ ہو کر اس نے قبر دوبارہ بند کر دی اور کفن لئے گرد بابا کے پاس آ گیا۔

گرد بابا نے جب زاہد کی آنکھوں میں جھانکا تو ایک قبضہ اس کی زبان سے ابھرا۔ ”بچہ تم کامیابی سے آگے بڑھ رہے ہو۔ تمہارے اندر آسبی قوت بھری جانے لگی ہے۔ تمہاری آنکھوں میں وہی چمک پیدا ہو رہی ہے جس کی تم خواہش کر رہے تھے۔“

گرد بابا قبضہ لگاتے ہوئے بولے جا رہا تھا اور زاہد اپنی قسمت پر ناز کرتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی اب صرف چھ دن کا عمل باقی تھا۔ چھ دن بعد ہر چیز اس کے قبضے میں آ سکتی تھی۔ وہ شہنشاہ بننے والا تھا، حکمران بننے والا تھا۔ شیطانی قوت سے ہر کام کرنے کا سوچ رہا تھا۔ دین اسلام سے تو وہ بہت دور ہو گیا تھا۔ یہ علم اپنانے کی خاطر وہ اسلام سے خارج ہو گیا تھا۔ خدا سے مدد مانگنے کی بجائے شیطان سے مدد مانگنے والا بھلا دین اسلام میں کیسے رہ سکتا تھا۔ زاہد بھی دنیا کو قبضہ میں لینے کی غرض سے آخرت کو بھول بیٹھا تھا، اپنی موت کو بھول بیٹھا تھا۔ یہ بھی بھول بیٹھا تھا کہ اس کے گھٹاؤں نے کام دنیا والے تو نہیں دیکھ رہے لیکن خدا تو دیکھ رہا ہے۔ باقی رات وہ خوابوں میں گزارنے لگا۔ جب کانوں میں اذان کی آواز پڑتی تو سو جاتا۔

اسی طرح عمل کرتے سولہ، سترہ دن بیت گئے۔ کامیابی سے عمل کرتا رہا۔ آج بیسواں دن تھا۔ صبح ہی سے ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ بادل آسمان پر منڈلانے لگے تھے۔ لمحوں میں ہی سیاہ بادلوں نے پورے آسمان کو چھپا لیا اور گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔ آج کا بھیا تک موسم دیکھ کر زاہد کا رنگ اڑ گیا۔ سردی سے کانپتے جسم کے ساتھ وہ آج کی رات کے متعلق سوچوں میں گم تھا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔

رہا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو تیز بارش میں جب یہ قبر کے قریب پہنچا تو اسے ایک چھوٹی سی قبر دکھائی دی۔ ایسے لگا جیسے کوئی پانچ چھ سال کا بچہ ہو۔

باقی کا دن زاہد نے برستی بارش میں چمکتے اور گرجتے موسم میں گزارا۔ کئی دفعہ وہ آسمانی بجلی کی زد میں آتے آتے بچا۔ شاید ابھی اس کی زندگی کے دن باقی تھے کہ آسمانی بجلی اس کے قریب ہی گرتی رہی۔ بادلوں کی گرج کا یہ عالم تھا کہ ایسے لگتا تھا کہ وہ کانوں کے پردے پھاڑ دے گی۔ یہ موسم اس قدر بھیانک روپ اختیار کئے ہوئے تھا کہ اس سے قبل اس قدر تیز بارش اور گرج چمک نہ دیکھی تھی۔

وہ ننھی قبر کے قریب بیٹھا وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا تھا کہ اچانک اسے قبرستان میں ایک چہرہ دکھائی دیا۔ یہ چہرہ دیکھتے ہی زاہد اپنا آپ بھول کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ چمکتی بجلی میں وہ چہرہ ایک درخت کے نیچے خود کو بارش سے بچانے کی کوشش میں تھا۔ اتنے بھیانک موسم میں کسی کو تنہا اور بھیگتے دیکھ کر زاہد سوچوں میں گم تھا۔ کافی دیر تک سوچنے کے بعد وہ ہمت کر کے اس کے قریب ہوا اور پوچھا

”تم اس بھیانک اور خوفناک موسم میں یہاں قبرستان میں کیا کر رہے ہو؟“

زاہد کی بات پر وہ رو دیا اور بولا۔

”مجھے میرا باپ مار دے گا، وہ بہت ظالم ہے۔ میری جان نکال دے گا۔ یہ جو بچی مری ہے، یہ میری بہن ہے۔ ابو نے اس کا گلا گھونٹ ڈالا ہے۔ اسے مار دیا ہے۔ وہ میری ماں کو بھی مار ڈالے گا۔ وہ بہت ظالم ہے۔“

بچے کی کہانی سن کر زاہد بولا۔

”تمہارا وہ سگا باپ نہیں ہے؟“

تو معصوم بچہ بولا۔ ”نہیں وہ سوتیلا ہے۔ ہر وقت ہم تینوں کو مارتا پیٹتا رہتا ہے اور آج اس نے میری بہن کو مار ڈالا اور اب مجھے۔۔۔۔۔“

یہ کہانی سن کر زاہد نے اسے تسلی دی اور کہا۔

”میں لوں گا تمہارا اس سے انتقام۔ میں کروں گا تیرے باپ کو ختم۔“

”نہیں چاچو نہیں، وہ بہت سخت ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے بدمعاش ان کے دوست ہیں جو ہمارے گھر میں گھسے رہتے ہیں۔“

”جو بھی ہے، میں لوں گا تیرا ان سے انتقام۔ آؤ مجھے اپنی بہن تو دکھاؤ کہ وہ کسی

پھر جب اسے صرف دو دن کے عمل کا وقت یاد آیا تو تیز بارش میں بھیگتا ہوا چوہے اور بلیاں اکٹھی کرنے لگا۔ آج کہیں سے بھی اسے نہ تو کوئی چوہا نظر آیا اور نہ بلی۔ گرجتے چمکتے بادلوں اور بھرپور سردی میں چوہے، بلیاں کیسے کھیتوں میں دکھائی دیتے۔ کیسے گلیوں میں دکھائی دیتے۔ دن کا وقت ہونے کے باوجود بھی رات کا سماں دکھائی دے رہا تھا۔ گاؤں سنسان، ویران تھے۔ لوگ بستر وں میں آگ جلانے سردی سے بچنے کی کوشش میں تھے اور زاہد پاگلوں کی طرح چوہوں، بلیوں کی تلاش میں جگہ جگہ گھوم پھر کر چوہے بلیاں جمع کرنے میں مصروف تھا لیکن اسے کامیابی دکھائی نہ دے رہی تھی۔

چند ایک چوہے اس نے پکڑے تھے اور بلی ابھی تک اس کے ہاتھ نہ لگی۔ چہرے پر پریشانی کا یہ عالم تھا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ تمام گاؤں کو جلا ڈالے۔ جو چیز بھی اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالے، اسے ختم کر دے۔ وہ پاگلوں اور وحشیوں کی طرح ایک ایسے مکان میں جا گھسا جہاں سے لوگ خوف کھاتے تھے۔ جہاں اسے چڑیلوں کی بھیانک صورتیں دکھائی دیتی تھیں۔ یہ گاؤں گرد و بابا سے بہت دور تھا۔ یہاں قدم رکھتے ہی اسے بھیانک چیخوں کی آوازیں سنائی دیں۔ چمکتی بجلی میں جب ویران گھر کو دیکھتا تو اندر بھیانک صورتوں کو چلتے پھرتے پاتا۔ اسے یہاں اپنی موت یاد آئی تو گرد و بابا کی باتیں دماغ میں گھومیں۔

”بچہ درد کو زبان پر جاری رکھنا۔ یہ آئینی طاقتیں تمہیں صرف خوفزدہ کریں گی، جان نہیں لے سکیں گی۔“ لہذا زاہد درد پڑھتا ہوا اندر کمرے میں چلا گیا لیکن اندر بھیانک صورتیں نہ تھیں بلکہ بلیوں کے بچے گھومتے پھرتے اچھلتے کودتے دکھائی دیئے۔

یہ دیکھتے ہی زاہد کی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں پہلے والی چمک ابھری، اس نے جلدی سے بلیوں کے بچوں کو ذبح کرنا شروع کر دیا اور ان کا خون ڈول میں جمع کرنے لگا۔ ایک دو تین مسلسل بیس بچے ذبح کئے اور سکھ کی سانس لی کیونکہ چوہوں کو تلاش کرنا اتنا مشکل نہ تھا۔

وہاں سے یہ کام مکمل کرنے کے بعد وہ دوبارہ گاؤں کی گلیوں سے گھومتے ہوئے گاؤں سے باہر نکل گیا اور جہاں بھی چوہا نظر آتا، اس کی گردن پر چھری چلا دیتا اور خون جمع کر لیتا۔ تقریباً پانچ گھنٹے کی مسلسل جدوجہد کے بعد اپنا یہ عمل پورا کر لیا اور ایک میت کی تلاش شروع کر دی لیکن یہ کام ان دونوں کاموں سے آسان دکھائی دیا کیونکہ ایک قبرستان میں لوگ ایک بڑی سی چادر اپنے سروں پر پھیلائے کسی کو دفن کر رہے تھے۔ دور کھڑا وہ یہ سب منظر دیکھتا

تھی۔ لگتا ہے تیری طرح بہت پیاری ہوگی۔“

زاہد نے بہانہ تلاش کر لیا تاکہ اس کے سامنے اس ننھی قبر کو کھود سکے اور اپنا عمل پورا کر سکے۔ جب دونوں قبر کے قریب پہنچے تو زاہد نے کھرپے کی مدد سے قبر سے ابھی مٹی ہٹانی شروع ہی کی تھی کہ آٹھ سالہ بچہ اس کے پاؤں پڑ گیا اور بولا۔

”نہ چاچو، خدا کیلئے ایسا نہ کریں۔ میری بہن کو باہر نہ نکالیں۔“

یہ لفظ سنتے ہی زاہد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ پیار بھرے لہجے میں سختی ابھرنے لگی کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کا عمل کیسے پورا ہوتا۔

”اگر تم نے زبان چلائی تو یہ چھری دیکھ رہے ہوں، اس سے تیرا گلا کاٹ دوں گا۔“

بچہ روئے جا رہا تھا اور زاہد اپنا کام کئے جا رہا تھا۔

”چاچو، تم بہت ظالم ہو۔ میرے باپ سے بھی زیادہ ظالم ہو۔ میں ابھی گاؤں والوں کو بلا کر لاتا ہوں۔“

بچے کی زبانی یہ لفظ سننے ہی تھے کہ زاہد کا دماغ گھوم اٹھا۔ اس کے دونوں ہاتھ معصوم کی گردن تک جا پہنچے۔ قریب پڑی ہوئی تیز چھری سے اس معصوم کا گلا کاٹ دیا۔ اس کا دھڑ تڑپنے لگا لیکن وہ وحشی بنا اس کے پیٹ میں چھرے گھونپتا رہا۔ وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کے سیاہ گھٹاؤنے کارناموں کا لوگوں کو علم ہوتا اور اس معصوم کی قسمت دیکھو جس موت سے ڈر کر وہ اندھیرے قبرستان میں پناہ لئے ہوئے تھا، اسی موت نے اسے آپکڑا اور شاید باپ اسے معاف کر دیتا یا پھر اسی قدر بیدردی سے نہ مارتا، اس کا گلا نہ کاٹتا اور یہ درندہ صفت انسان اس کے تڑپتے جسم پر بھی چھریوں کے وار کئے جا رہا تھا۔

وہ معصوم تڑپ تڑپ کر اس کے ہاتھوں ٹھنڈا ہو گیا تو اس نے دوبارہ قبر کی کھدائی شروع کر دی۔ بچی کی میت نکال کر کفن اتارا۔ بلیوں، چوہوں والے خون سے غسل کیا اور اس کے کان میں عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ اپنے عمل سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک قبر میں دو میتیں رکھ کر مٹی ڈال دی اور کفن ہاتھ میں پکڑے گردو بابا کی طرف بڑھنے لگا۔

ایک ہاتھ میں اوزار اور دوسرے ہاتھ میں کفن لئے بچے کے متعلق سوچتے ہوئے آگے بڑھتا رہا لیکن اسے اس قتل سے ذرا بھی ندامت نہ ہوئی۔ وہ تو گھٹاؤنے کام کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اسے تو دنیا پر قبضہ جمانا تھا۔ آسبوں پر قبضہ جمانا تھا۔ اپنی من مانی کرنی تھی۔

اس کی نظر میں کسی کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ واقعی ایک انسان سے درندہ بن گیا تھا۔ وحشی بن گیا تھا۔ خونی بھیڑیا بن گیا تھا۔

میں دنوں میں یہ پہلی قبر تھی جو ایک بچی کی تھی ورنہ کوئی بوڑھا ہوتا، کوئی بچہ، کوئی جوان..... کوئی دشمنی کی بھیٹ چڑھ کر قبر میں آ پڑتا، کوئی سانپ کے ڈسنے سے، کوئی بیماری کی حالت میں مرتا۔

یہاں میں دن مکمل ہونے کے بعد اپنی تمام زندگی یاد آگئی تھی کہ اس نے یہ شیطانی عمل کیوں شروع کیا، کس مقصد کو پانے کے لئے کیا اور کیا حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اس عمل سے ”بچہ تم منزل پر پہنچ چکے ہو، صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ دیکھنا تمہارا یہ آخری قدم لڑکھڑانہ جائے۔ کہیں نیچے نہ گر جانا۔“ گردو بابا کے الفاظ نے زاہد کو سوچوں کے گہرے سمندر سے باہر نکالا۔

”ہاں، گردو بابا یہ سب تمہارا کمال ہے ورنہ میں کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتا۔ کبھی بھی یہاں تک نہ پہنچتا، اب صرف کل کی رات باقی ہے۔ اس کے بعد جادو گروں کی گردنیں میرے ہاتھوں میں ہوں گی۔ جنات میرے قدموں میں ہوں گے۔ میں شہنشاہ ہوں گا۔“ زاہد کے منہ سے ایک بھیانک قہقہہ بلند ہوا۔ اس کی آنکھوں میں بھی گردو بابا والی کشش آچکی تھی لیکن ابھی وہ طاقت میں ہاتھ نہ تھی جو گردو بابا کے پاس تھی۔ وہ گردو بابا کی تمام طاقتیں دیکھ چکا تھا۔

رات گزر گئی، آج صبح سویرے ہی زاہد نے بلیوں اور چوہوں کو پکڑنا شروع کر دیا۔ جہاں کہیں بھی اسے چوہا یا بلی ملتی، پکڑ کر باندھ لیتا۔ دن گزرتا رہا، زاہد اپنے مشکل ترین کام میں مصروف رہا۔ چوہے بلیاں جمع کرنے کے لئے اسے مختلف گاؤں میں جانا پڑتا کہ کسی کو شک بھی نہ ہو اور کام بھی چل جائے۔ ویسے بھی لوگوں کی نظروں میں وہ صرف دیوانہ، پاگل اور گندا انسان تھا۔ اس کے قریب سے گزرتے بھی لوگ کتراتے تھے۔

دن ڈھل گیا لیکن اسے کہیں سے بھی قبر کھدائی دکھائی نہ دی اور جوں جوں اندھیرا پھیلتا جانے لگا، توں توں اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ آج اس کا آخری دن تھا۔ اگر آج رات گزر جاتی تو اس کی تمام محنت رائیگاں جاتی اور ہو سکتا تھا، وہ خود بھی قبر میں پڑا ہوتا۔ جب کافی رات ڈھل گئی اور کچھ نظر نہ آیا تو اس نے جہاں جہاں بلیوں چوہوں کے ٹھکانے دیکھے تھے اور جہاں جہاں باندھے تھے، بے دردی سے ان کے گلے کاٹتا ہوا ڈول خون سے بھرتا ہوا

گرو بابا نے کہا۔

”بچہ ابھی وقت ہے، بھاگو دوڑو۔ اگر تم نے آج اپنا عمل نہ پایا تو پھر میں کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔ لوگوں کے گھروں میں گھس کر قتل عام شروع کرو۔ اپنا مقصد حاصل کرو، کسی کو ذبح کر کے اپنا درد مکمل کرو۔“

گھروں میں گھسنے کی باتیں سن کر زاہد کے مرجھائے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے اپنے قریب پڑے ہوئے چہرے کو اٹھایا۔ اگر آج وہ ناکام ہو جاتا تو اپنی بہنوں کے قاتلوں سے کیسے انتقام لے سکتا تھا۔ انہیں کیسے جلا سکتا تھا۔ ان کی موت پر کیسے جشن منا سکتا تھا۔

”ہاں گرو بابا، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اب ایسا ہی ہوگا۔ مجھے جنات پر قبضہ جمانا ہے۔ راجہ بننا ہے۔ مان گیا ہوں آپ کو۔ آپ دیوتا ہیں۔ بے ہو گرو بابا کی بے ہو“ کہہ کر وہ اٹھا اور بجلی کی تیزی سے گرو بابا کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا اور پھر بے در پے وار کر کے گرو بابا کو لہولہان کر دیا۔

گرو بابا کی لاش تڑپ رہی تھی اور زاہد قہقہے لگا رہا تھا

”میں اپنا عمل کرنے میں کبھی ناکام نہیں رہا۔ تمام جنات میرے قبضہ میں ہوں گے۔ میں سردار ہوں گا ان سب کا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ گرو بابا کو نوچنے لگا۔

گرو بابا کوئی معمولی انسان نہ تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کا جادو جگا دیا اور اپنی چمکتی آنکھوں کے ساتھ زاہد کو گھورنے لگا۔ زاہد کو ایسے لگا جیسے اس کے جسم کی طاقت ختم ہو رہی ہو۔ وہ گرو بابا کی آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور بھاگنے کے لئے جو نبی قدم اٹھانے ہی والا تھا کہ جہاں کھڑا تھا وہیں کا وہیں رک گیا۔

آخری لمحات میں بھی گرو بابا نے اسے بت بنا دیا لیکن اپنی آنکھوں کی تمام چمک زاہد کو دے گیا۔ زاہد بت بنے جادو کے زیر اثر بے حرکت کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ادھر گرو بابا نے زخموں کی تاب نہ لا کر تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ اس کے مرتے ہی اس کے بدن کے کپڑوں کو آگ گئی۔ اس کا جسم جلتے جلتے سیاہ ہو گیا۔ قبرستان آسبی چیخوں سے گونجنے لگا۔ قید شدہ جنات آزاد ہو گئے اور بھیانک صورتوں کے ساتھ گرو بابا کے جلتے جسم کو نوچنے لگے۔ اس کے جسم کی ہڈیاں چبانے لگے

جو گھناؤنے کام گرو بابا نے کئے تھے، ان کی سزا ظاہری طور پر اسے مل رہی تھی۔ اس کے جسم کا ایک ایک حصہ جنات کے حلق میں چلا گیا۔ ادھر دوسری طرف جادو کے زیر اثر بت

چمکتی آنکھوں کے ساتھ وحشیوں کی طرح کسی کے گھر سے اٹھنے والی چیخ و پکار سننے کو بے قرار تھا۔

جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو خون سے بھرے ڈول کو لئے اپنے ٹوٹے قدموں، مرجھائے چہرے کے ساتھ ایک قبرستان کے قریب سے گزرنے لگا تو وہاں اس نے ایک کفن میں لپی لاش دیکھی۔ یہ دیکھتے ہی اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ جلدی سے تمام خون اپنے اوپر انڈیل لیا۔ غسل کرنے کے بعد اس لاش کے گرد سے کفن اتارنے لگا تو لاش غائب ہو گئی۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کی چیخیں نکل گئیں اور ساتھ ہی اسے قبرستان سے بھیانک قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگی۔ یہ لڑکا پوری طرح ہماری گرفت میں آچکا ہے۔ اب یہ بچ کر نہ جاسکے۔

زاہد کا دل گھبرانے لگا۔ اسے گرو بابا کے الفاظ یاد آ گئے۔

”بچہ چلے کا آخری دن بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ وقت مجھے یاد ہے۔ پورا دن پاگلوں کی طرح چوہوں کی گردنیں کھنڈرات میں کاٹنے کے بعد خون سے بالٹی بھرنے کے بعد جب میت کی تلاش میں نکلا تو کہیں سے بھی مرا آدمی دکھائی نہ دیا۔ مجھے اپنے ارد گرد سے بھیانک قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں ڈر اور خوف سے گھبرا کر تقریباً ختم ہونے والا تھا کہ راستے میں ایک میاں بیوی کو جاتے دیکھا تو میں نے ان پر چھری چلا دی۔ انہیں لہولہان کر دیا اور مرد کی میت کے کان میں درد پڑھا تو ہر طاقت میرے قدموں میں آ گئی۔ میں راجہ بن گیا۔“

یہ خیال آتے ہی وہ دیوانوں کی طرح قبرستان میں خالی ڈول رکھے، چھری چمکا تا ہوا گاؤں کی طرف بھاگا کہ جو کوئی بھی دکھائی دیا، اسے قتل کر کے اپنا عمل پورا کرے گا۔ راجہ بنے گا۔ لیکن گاؤں کی گلیوں میں کوئی بھی شخص دکھائی نہ دیا۔ ٹھنڈی ہواؤں کے سوا اور سیاہ بادلوں کی وجہ سے لوگ اندر کمروں میں مست تھے۔

اب زاہد کو اپنے ارد گرد چڑیلوں کے بھیانک چہرے دکھائی دینے لگے۔ قہقہے سنائی دینے لگے۔ وہ مایوسی کے عالم میں چہرہ لٹکاے کبھی کہیں بھاگتا اور کبھی کہیں بھاگتا لیکن کچھ نہ بن سکا تو چڑیلوں کے خوف سے بچنے کی خاطر اس نے گرو بابا کی پناہ پکڑی چاہی۔ وہ بھاگتا ہوا گرو بابا کے پاس پہنچ گیا اور جاتے ہی اس کے پاؤں میں گر پڑا۔

”گرو بابا مجھے بچا لو۔ گرو بابا مجھے بچا لو۔ وہ مجھے مار دیں گی۔ میری ہڈیاں پسلیاں چبا دیں گی بابا۔ اپنی طاقتوں سے کہہ دیں کہ میری جان بخشی کر دیں۔“

جانے کی کسی میں ہمت نہ ہوتی کیونکہ گاؤں کے آدمی کی موت سے ہر کوئی واقف تھا۔ اس مجسمہ کے قریب جانا موت کو آواز دینا تھا۔ گرد بابا کا غائب ہو جانا، اس پاگل انسان کا بت بن جانا لوگوں کے اندر ایک عجیب کہانی چھوڑ گیا۔

اس مجسمہ کی خبر زاہد کے گاؤں کے جاگیردار تک جا پہنچی کہ فلاں جگہ ایک مجسمہ ہے۔ اس مجسمے کی دونوں آنکھیں حرکت کرتی ہیں اور جو کوئی ان آنکھوں کی لپیٹ میں آ جاتا ہے، اس کے جسم کی کھال پکھلنے لگتی ہے اور وہ انسان پکھل کر مر جاتا ہے۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتا ہے۔ جاگیردار یہ خبر سن کر خوب کھلکھلا کر ہنسا کہ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک انسان بت بن جائے اور آنکھیں حرکت کرتی رہیں اور آنکھوں سے شعلے ابھریں۔“

لہذا جاگیردار چند وفاداروں کے ساتھ اس گاؤں تک پہنچا اور اس مجسمہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ لوگوں نے منع کر دیا اور تمام کہانی سنا ڈالی۔ اپنی آنکھوں کا دیکھا حال بیان کر دیا۔ گاؤں میں جو کھرام مچا تھا، وہ بتا دیا اور ایک چھت پر لے جا کر دور سے قبرستان میں کھڑا مجسمہ دکھا دیا کہ قریب جانا موت کو دعوت دینا ہے۔ لوگوں کے منع کرنے پر جاگیردار کے دل میں بھی خوف پیدا ہوا لیکن زبان پر وہی دبدبہ تھا۔ وہی گرج تھی، وہی لہجہ تھا۔ اپنے ایک ملازم سے کہا

”تم وہاں جا کر ہر چیز کی خبر مجھے لا کر دو۔“

چاند چمک رہا تھا اور جاگیردار کا وفادار اپنی وفاداری نبھانے کی غرض سے اپنی جان ہتھیلی پر رکھے قبرستان کی جانب اکیلے ہی بڑھنے لگا۔ ابھی قبرستان نہ پہنچا تھا، دور سے قبرستان کا منظر دیکھنے لگا۔ ایک گھنٹہ وہ دور سے ہی قبرستان کا منظر دیکھتے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے چہرے پر رونق لئے واپس گاؤں۔

اس کے چہرے پر رونق اور لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر جاگیردار بولا۔

”گلتا ہے تم میرے لئے کوئی اچھی خبر لائے ہو۔“

ملازم بولا۔ ”سرکار ایسے ہی سمجھ لیں۔ وہاں قبرستان میں چاند کی روشنی میں ایک عجیب منظر دیکھ کر آیا ہوں۔“

وہاں بیٹھے لوگ اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کیونکہ لوگ تو اس مجسمے کے نام سے ہی خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ یہ واحد انسان تھا جو لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے

بنے زاہد کی گھومنے والی آنکھیں، شعلے ابھارنے والی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ جس چیز کو بھی گھور کر دیکھتا، اسی کو آگ لگ جاتی۔ جنات صرف اس مجسمہ بنے پتھر سے گھبراتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس مجسمہ کے لبوں پر گرد بابا والا ورد جاری ہے۔ وہ اگر اسے چھوئیں گے تو جل کر راکھ ہو جائیں گے۔

رات گزر گئی۔ صبح کا اجالا پھوٹا، روشنی ہوئی۔ سورج چمکا تو گاؤں کے چند ایک لوگ وہاں قبرستان کے قریب سے گزرنے لگے تو ایک شخص کی نظر کھڑے بت پر پڑی۔ انہوں نے اسے فوری پہچان لیا۔ یہ وہی دیوانہ تھا جو دن بھر چوہوں، بلیوں کو پکڑتا رہتا تھا۔ ان کی گردنیں کاٹا رہتا تھا۔ اسے وہاں ساکت کھڑے دیکھ کر اس کی جانب بڑھے، جا کر اسے چھوا۔ ہلایا جلا یا لیکن وہ تو پتھر کی مانند کھڑا تھا۔ صرف گھومتی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ جب گاؤں کا ایک شخص اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے ہوا تو اس کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں کی تاب نہ لاتے ہوئے تڑپتے لگا۔ چیختے چلانے لگا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو کانپ کر رہ گئے اور اسے اٹھا کر بھاگتے ہوئے گاؤں لے آئے۔ وہ شخص مسلسل چیختے جا رہا تھا۔ مسلسل تڑپے جا رہا تھا۔ بس اس کے لبوں پر ایک ہی آواز تھی۔

”میں اندر سے جل رہا ہوں۔ میرا جسم جل رہا ہے۔ وہ مجھے جلا کر راکھ کر دے گا۔“

لیکن بظاہر آگ دکھائی نہ دیتی تھی۔ سردیوں میں بھی گاؤں والے اس پر پانی پھینکتے رہے لیکن وہ جسم پر پانی پڑنے کے باوجود بھی تڑپے جا رہا تھا۔ چیختے جا رہا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہی اس کے جسم کی کھال پکھلنے لگی۔ یہ منظر دیکھ کر گاؤں والے تڑپ کر رہ گئے۔ اس شخص کی کھال پکھل پکھل کر زمین پر گرتی جا رہی تھی۔ جسم ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ سانس حلق میں انگی ہوئی تھی۔ لمحوں میں ہی وہ شخص پکھلتا ہوا دم توڑ گیا۔ جسم سے تمام کھال اتر کر زمین پر تیرنے لگی۔ گاؤں والوں کے لئے یہ منظر صرف حیران کن ہی نہ تھا بلکہ خوفناک بھی تھا۔ لمحوں میں انسان سے ڈھانچہ بننے کی خبر سن کر دور دور سے وگ اس گاؤں کی طرف آنے لگے اور وہ لوگ صرف یہ بات ہی سبھی کو بتا رہے تھے کہ قبرستان میں اس دیوانے کے مجسمے کی آنکھوں نے اسے جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والے تیزابی شعلوں نے اسے پکھلا کر رکھ دیا ہے۔

لوگ یہ الفاظ سن کر اس قبرستان سے خوف کھانے لگے۔ اس شخص کو بھی کسی اور قبرستان میں لے جا کر دفن کر دیا گیا۔ لوگ دور دور سے کھڑے اس بت کو دیکھتے۔ قریب

واپس آیا تھا، کہنے لگا

”دور سے ہی قبرستان کا منظر دیکھ کر آیا ہوں۔ چمکتے چاند کی روشنی میں ایک خوبصورت دوشیزہ کو مجھے کے قریب دیکھ کر آیا ہوں جو اس کے بالوں میں کبھی کنگھی کرتی ہے اور کبھی اس کے ارد گرد رقص کرتی ہے۔“

یہ بات گاؤں والوں نے پہلی بار سنی تھی کیونکہ وہ تو اس قبرستان کو دور سے دیکھنے سے خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ اکیلے کھڑے ہو کر یہ منظر کیسے دیکھتے۔ ملازم کے یہ الفاظ سنتے ہی جاگیردار گاؤں والوں کو ساتھ لے کر قبرستان کی جانب بڑھنے لگا۔

اس گاؤں کے نمبردار کی جاگیردار سے بہت پرانی دوستی تھی اور جاگیردار نمبر کا ہی مہمان ٹھہرا تھا، لہذا سبھی قبرستان کی جانب بڑھنے لگے۔ دور سے کھڑے ہو کر لڑکی کو دیکھنے لگے کہ وہ لڑکی کون ہے۔ قبرستان کیا کرنے گئی تھی اور مجھے کے بالوں میں کنگھی کیوں کر رہی تھی؟ وہ لڑکی کہاں سے آئی تھی، کس کی بیٹی تھی؟ لیکن انہیں قبرستان میں بت کے سوا صرف ویرانہ اور قبریں ہی دکھائی دیں۔

”کہاں ہے لڑکی؟“ جاگیردار گرجا تو ملازم کا رنگ اڑ گیا۔

کا پتی زبان سے بولا۔ ”سرکار چلی گئی ہوگی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے مجھے کے ارد گرد رقص کرتے دیکھا ہے۔ اس کے بالوں کو سنوارتے دیکھا ہے۔ یقین نہیں آتا تو ساتھ چل کر دیکھ لیں۔ مجھے کے بال ایسے ہوں گے جیسے ابھی ابھی انہیں کوئی سنوار کر گیا ہو۔ جیسے ابھی ابھی کوئی بالوں میں کنگھی کر کے گیا ہے۔“

ملازم کی اس بات پر نمبردار نے اپنے ملازم سے کہا کہ ”تم اس کے ساتھ جاؤ اور قبرستان کا کونہ کونہ چھان مارو۔ جہاں کہیں بھی لڑکی چھپی ہوئی ہے، اٹھا کر گاؤں لے آؤ تاکہ میں جان سکوں کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟“

دونوں مضبوط دلوں کے ساتھ قبرستان کی جانب بڑھنے لگے اور باقی کے تمام لوگ واپس گاؤں آ گئے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ قبرستان سے چیخیں ابھرنے لگیں۔ جاگیردار کا ملازم چیختے ہوئے گاؤں کی طرف بھاگنے لگا جبکہ دوسرا آدمی خوفزدہ چہرہ لئے اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا آرہا تھا۔ گاؤں میں پہنچتے ہی پہلے جلے انسان کی طرح یہ شخص بھی چیخنے لگا۔

”وہ مجھے جلا دے گا، میرے اندر آگ لگی ہوئی ہے۔ جسم جل رہا ہے۔“

لوگوں نے اس پر پانی پھینکنا شروع کر دیا لیکن گاؤں والے جان گئے تھے کہ یہ شخص

زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ تک زندہ رہ سکتا ہے۔ ویسا ہی ہوا۔

جاگیردار پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے ملازم کو دیکھنے میں مصروف تھا جس کے جسم کی کھال پکھل پکھل کر زمین پر گر رہی تھی۔ سانس حلق میں اٹکے ہوئے تھے اور ہڈیاں ایک ایک کر کے ٹنگی ہوتی جا رہی تھیں۔ جسم پانی کی مانند پکھل پکھل کر زمین پر تیر رہا تھا۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر ہی وہ شخص بھی تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ جسم کی جگہ ایک ڈھانچہ سامنے پڑا تھا۔

جاگیردار نے اس کی موت کے ساتھ ہی مجھے کی حقیقت کو تسلیم کر لیا اور صبح سویرے ہی ہڈیوں کا ڈھانچہ اٹھائے گاؤں والوں کے ساتھ نمبردار کے ساتھ اپنے گاؤں آ گیا۔

یہاں کہرام مچ گیا۔ دکھ اس کی موت کا نہ تھا، دکھ اس کے جلنے کا تھا۔ اس کی پکھلی کھال کا تھا۔ سامنے ہڈیوں کا ڈھانچہ دیکھ کر ہر کسی کا چہرہ خوف سے زرد پیلا پڑا ہوا تھا۔ دن بھر لوگ دور دور سے جلے ڈھانچے کو دیکھنے آتے رہے۔ پھر اسے دفن کر دیا گیا اور جاگیردار گر جا۔

”مجھے اس مجھے کی آنکھیں چاہئیں۔ میں وہ آنکھیں ہی نکال دوں گا جو لوگوں کو جلاتی ہیں۔ جو لوگوں کے جسموں کو پکھلاتی ہیں۔ کوئی ہے ہمت والا جو اس بت کی آنکھیں نکال کر میرے سامنے رکھ سکے تاکہ میں خود ان تیزابی آنکھوں کو آگ لگا سکوں۔“

یہ الفاظ سنتے ہی جاگیردار کا بیٹا چودھری ہاشم بولا۔ ”میں لاؤں گا اس مجھے کی آنکھیں، میں لگاؤں گا ان تیزابی آنکھوں کو آگ۔“

یہ دیکھ کر جاگیردار کانپ کر رہ گیا کیونکہ وہ کسی بھی صورت میں اپنے بیٹے کو موت کے منہ میں نہ دھکیل سکتا تھا۔ اس نے تو خود اپنی آنکھوں سے پکھلتی کھال کا منظر دیکھ لیا تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اس کو تڑپتے، اس کے چیخنے چلانے کا منظر دیکھ لیا تھا اور یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود بھی وہ اپنے بیٹے کو کیونکر اجازت دیتا۔

وہ تو چاہتا تھا کہ گاؤں کا ایک ایک فرد اس مجھے کا شکار ہوتا رہے اور وہ تماشا دیکھتا رہے۔ جاگیردار نے اپنے بیٹے کو منع کیا لیکن وہ منع نہ ہوا اور کل صبح ہی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جاگیردار اسے بار بار سمجھتا رہا کہ وہاں صرف موت ہے لیکن وہ بھی خدی انسان تھا، بہادر تھا۔ بولا

”ابا جان وہ مجسمہ بالکل ساکت ہے، ہل جل نہیں سکتا۔ میں پیچھے سے جا کر آرام سے اس کی دونوں آنکھوں میں چھریاں گھونپ دوں گا اور آنکھیں نکال کر لے آؤں گا، یہ کون سا مشکل کام ہے۔“

سامشکل کام ہے۔“

نمبردار کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ دن کی روشنی میں قبرستان کی طرف چلے گا۔ قبرستان پہنچ کر اپنا گھوڑا ایک درخت کے ساتھ باندھا۔ دور سے ہی مجھے کا جائزہ لیا۔ اپنا خنجر نکالا اور تیز تیز قدموں کے ساتھ مجھے کے قریب ہو گیا۔ پہلے تو اسے ہاتھ لگا کر چیک کیا، وہ ایک انسان تھا لیکن بالکل ساکت، بے حرکت اور بے جان سا تھا۔ جیسے اس پر کسی کا جادو چل گیا ہو۔ جادو کی گرفت میں جکڑا گیا ہو۔ پہلے تو وہ مجھے کے پیچھے کھڑے ہو کر اس کی آنکھیں نکالنے لگا۔ پھر نجانے اسے کیا خیال آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ روک لئے۔ دل اس کی تیزابی آنکھیں دیکھنے کو چلنے لگا کہ اس کی آنکھوں میں کیا چیز ہے کہ جس کی نظر پڑتی ہے اس کا جسم ہی کھٹکنے لگتا ہے اور وہ وہیں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتا ہے۔

یہ سوچ آتے ہی وہ پیچھے سے ہٹ کر اس کے سامنے آ گیا۔ جونہی مجھے کی نظروں میں جھانکا تو اپنی پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ آنکھیں پتھر گئیں۔ دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ مجھے کی آنکھوں میں ایسی کشش تھی کہ جب تک انسان کا جسم جھلنے نہ لگ جاتا، اس وقت تک وہ آنکھوں کے سامنے سے نہ ہٹ سکتا تھا۔ یہی حال ہاشم کا تھا۔ یہ بھی تکنیکی باندھے دنیا جہاں سے بے خبر مجھے کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ اس کے جسم کی کیفیت بدلنے لگی تھی۔ ہلکی ہلکی تپش سے جسم جھلنے لگا تھا۔ جب ہلکی ہلکی تپش ہو گئی تو ہاشم نے تڑپنا شروع کر دیا۔ چیخا چلانا شروع کر دیا۔ پاگلوں کی طرح قبرستان میں بھاگنا شروع کر دیا۔ بھاگتے بھاگتے گھوڑے پر جا بیٹھا اور گھوڑے نے اپنا رخ گاؤں کی طرف کرتے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا۔ تیز بھاگتے گھوڑے پر ایک تڑپتے ہوئے انسان کا منظر ہر کوئی دیکھ رہا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخوں کی گونج ہر کوئی سن رہا تھا۔ اس کی تڑپ اور چیخ و پکار سے ڈرتے ہوئے گھوڑا قل پیڈ کے ساتھ بھاگتا رہا۔ راستے میں ہاشم کے جسم کی کھال کھٹکنے لگی۔ راستے میں اس کا جسم خون کے تھوڑے بن کر زمین پر گرے لگا۔ گاؤں پہنچنے تک اس کی دونوں ٹانگیں ہڈیاں بن چکی تھیں اور تیزابی آنکھوں کی یہ تپش ٹانگوں کی کھال کو پانی بنانے کے بعد بازوؤں اور کمر تک آ پہنچی۔

جب وہ گاؤں پہنچا تو آدھا ڈھانچہ اور آدھا انسان دکھائی دیتا تھا۔ یہ پہلا منظر تھا جو گاؤں والوں کی عورتیں بھی دیکھ رہی تھیں۔ ہاشم چارپائی پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ جسم پکھل پکھل کر چارپائی پر سے ہوتا ہوا زمین پر گر رہا تھا۔ جب جلنے کی تپش حلق تک آئی تو ہاشم تڑپتے تڑپتے

یہ بات سن کر جاگیردار کا چہرہ بھی کھل اٹھا۔ وہ یہ بات بھول ہی گیا تھا کہ مجسمہ حرکت نہیں کر سکتا ہے۔ نہ بازو ہلا سکتا ہے، نہ چل سکتا ہے اور نہ ہی انسان کو پکڑ سکتا ہے۔ بیٹے کے دماغ کی داد دیتے ہوئے بولا۔

”ہاں بیٹا یہ کام تم ہی کرو گے۔ تم بہادر باپ کے بہادر بیٹے ہو اور ویسے بھی یہ ہماری ذمہ داری میں شامل ہے کہ ہم گاؤں والوں کی جانوں کی حفاظت کریں۔ آس پاس کے گاؤں کی حفاظت کریں۔“

جاگیردار دراصل گاؤں والوں کے سامنے اپنی مزید عزت بڑھانا چاہتا تھا اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ گاؤں کا کوئی اور فرد یہ بازی لے جائے اور میری بجائے گاؤں والے اس معمولی انسان کی تعریفیں کرنے لگ جائیں۔ تب جاگیردار بولا

”بیٹا مجھے اس مجسمے کی تیزابی آنکھیں چاہئیں۔ میں ان آنکھوں کو ہمیشہ کے لئے جلا دیتا چاہتا ہوں۔ میں ان آنکھوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتا چاہتا ہوں۔ خاک میں ملا دیتا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے لوگ جھلس رہے ہیں، جل رہے ہیں، مر رہے ہیں۔“

گاؤں والے جاگیردار کی باتیں سن کر اور اس کے بیٹے کی ہمت دیکھ کر خوش خوشی واپس چلے گئے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی جاگیردار کے بیٹے ہاشم نے اپنا پاؤں گھوڑے پر رکھا اور گھوڑا دوڑا دیا، جلد ہی وہ اس گاؤں تک جا پہنچا جہاں مجسمے کی وجہ سے لوگ خوفزدہ تھے۔ نمبردار کے گھر ہاشم مہمان ٹھہرا اور اپنے یہاں آنے کا مدعا بیان کیا تو نمبردار نے اسے واپس جانے کا مشورہ دیا کہ

”اس مجسمے کی آنکھوں کا جو شخص بھی سامنا کرتا ہے، پکھلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم کی کھال زمین پر گرنے لگتی ہے۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتا ہے۔ تم خوبصورت ہو، جوان ہو۔ کیوں اپنی جان گنوانا چاہتے ہو؟ کیوں اپنے جسم کی کھال اتروانا چاہتے ہو؟ کیوں خود کو موت کے منہ میں دھکیلنا چاہتے ہو؟ واپس لوٹ جاؤ۔“

نمبردار کی اس بات پر ہاشم بولا۔

”انگل میں شروع سے خطروں سے کھینچا آتا ہوں۔ شیروں کے شکار کھیلے ہیں۔ تاریک راتیں جنگلوں، ویرانوں میں گزاری ہیں اور یہ کارنامہ میرے سامنے معمولی بات ہے۔ چند لمحوں کا کھیل ہے۔ ادھر قبرستان گیا اور ادھر اس کی دونوں آنکھیں نکال کر لے آیا۔ یہ کون

تب لوگوں کو کچھ سکون ملا اور جاگیردار نے دو آدمیوں کے ساتھ اسے قبرستان بھیج دیا تاکہ وہ خود ان آنکھوں کو آگ لگا سکے۔ جادوگر رات کے اندھیرے میں قبرستان جا پہنچا۔ راستہ بھر میں وہ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

”کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ سبھی کو آگ لگا دوں گا۔ سبھی کو جلا کر بھسم کر دوں گا۔ سبھی کو دھواں میں اڑا دوں گا۔“

یہ الفاظ کہتے کہتے قبرستان سے کچھ دور جا کر اس کے قدم رک گئے۔ جسم خوف اور ڈر سے کانپنے لگا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ساتھ جانے والے ساتھی خوف اور ڈر سے چیختے ہوئے واپس بھاگنے لگے لیکن جادوگر ایک مجسمے کی مانند سامنے کا منظر دیکھنے کے بعد کانپ رہا تھا۔ جسم سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اٹلے قدم واپس بھاگ جائے لیکن قدم اس قدر بھاری ہو گئے۔ ایسے جیسے زمین میں دھنس گئے ہوں۔

☆.....☆.....☆

ٹھنڈا ہو گیا۔ لوگوں کی نظروں کے سامنے ہی اس کے بازو، اس کا پیٹ، کمر اور چہرہ پگھلا تھا۔ لوگ تڑپ کر رہ گئے تھے۔ عورتیں چیخ و پکار کرنے لگیں۔ جاگیردار صاحب اپنے بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر پا رہے تھے۔ اس کے باقی کے تینوں بیٹے، دو بیٹیاں اور گھر کی مالکہ ڈھانچے کے ارد گرد کھڑی چیخ و پکار کر رہی تھیں۔ گاؤں والوں کے چہرے افسردہ تھے، خوفزدہ تھے۔ یہ کسی عام انسان کی موت نہ تھی بلکہ گاؤں کے جاگیردار کے جوان بیٹے کی موت تھی۔ چار پائی پر پڑا ہوا ڈھانچہ کسی عام آدمی کا نہ تھا بلکہ یہ ڈھانچہ اس انسان کا تھا جو گاؤں کی گلیوں سے گزر جاتا تو لوگوں کی زبانیں گنگ ہو جاتی تھیں۔ جوان لڑکیاں خوف سے کمروں میں چھپ جاتی تھیں۔

جب زندہ تھا تو ایک بھیا نک روپ تھا اور جب مرا تو اس سے بھی بھیا نک روپ اختیار کر گیا۔ گاؤں والوں کے یہ آنسو صرف دکھاوے کے تھے۔ دل سے خوش تھے کیونکہ گاؤں والوں کی عزتوں کے وہ رکھوالے نہ تھے۔ زاہد کی بہنوں نے بھی اسی وجہ سے گلے میں پھندے لے لئے تھے۔ موت کو گلے سے لگا لیا تھا۔

شام کو ہاشم کے مردہ ڈھانچے کو قبرستان جا کر دفن کر دیا گیا اور قبرستان میں ہی جاگیردار نے اعلان کر دیا۔

”مجھے اس مجسمے کی دونوں آنکھیں چاہئیں۔ جس نے میرے بیٹے کو قبرستان تک پہنچایا ہے، وہ آنکھیں چاہئیں۔ میں جلا دینا چاہتا ہوں ان آنکھوں کو۔“

ایک بزرگ بولا۔ ”سرکار یہ کام گاؤں والوں کے بس کا نہیں۔“

ہر زبان پر یہی شور ہے کہ ”اسے جادو کے زور سے باندھا گیا ہے اور کوئی جادوگر ہی اس کی دونوں آنکھیں نکال سکتا ہے۔“

جاگیردار نے جادوگر کو گاؤں لانے کا کہا، لہذا جاگیردار کے چند وفادار صبح سویرے ہی شہر چلے گئے اور شام ہونے سے قبل ایک جادوگر کو ساتھ لئے آ گئے۔

تمام کہانی اسے سنا دی گئی تو وہ بولا۔

”یہ میرے بائیں ہاتھ کا کمال ہے۔ مجسمہ کی آنکھیں اپنی نہیں ہیں، اس کے وجود میں کالی دیوی کھسی ہوئی ہے۔ یہ آنکھیں اسی کی ہیں جو انسانوں کو نگل لیتی ہے۔“

یہ بات سن کر گاؤں والے مزید خوفزدہ ہو گئے لیکن جب اس نے کہا کہ

”صبح دونوں آنکھیں آپ کو مل جائیں گی۔“

سے کوئی بھی انہیں آتا دکھائی نہ دیا۔ دل میں خیال سراہار نے لگا کہ کہیں جادوگر بھی مجھے کی چمکتی آنکھوں کا نشانہ تو نہیں بن گیا۔ کیا وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہڈیوں کی شکل تو اختیار نہیں کر گیا؟ لہذا اس کی تلاش میں قبرستان میں چلے گئے۔ مجھے کی چمکتی آنکھوں سے بچتے ہوئے قبرستان میں اس کا ڈھانچہ تلاش کرتے رہے۔ ایک جھاڑی میں انہیں اس کی لاش مل گئی۔ پورے جسم پر زہریلے داغ دکھائی دیئے۔ منہ سے جھاگ بہہ کر میت کو بد صورت بنا چکی تھی۔ اسے گاؤں لے جانا مناسب نہ سمجھا اور یہاں قبرستان میں ہی اسے غسل دے کر دفن کیا۔ جاگیردار یہ بات جان چکا تھا کہ وہ مجسمہ کس کا ہے؟ اسے بتا دیا گیا تھا کہ جس لڑکے کی بہنوں کے ساتھ انہوں نے زیادتی کی تھی، جنہوں نے ان کے بیٹوں کے ہاتھوں اپنی عزتیں بچاتے ہوئے خودکشی کی، جان دے ڈالی تھی، جس لڑکے کو گاؤں کی گلیوں میں ٹانگوں پر رے باندھ کر کھینچا گیا تھا۔ یہ اسی لڑکے کا مجسمہ ہے جسے گاؤں والے یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ مر گیا ہے لیکن وہ مرنا نہ تھا۔ نجائے یہاں گاؤں میں کیسے آیا؟ اس قبرستان میں کیسے لٹھا؟ اور کیا کیا عمل کرتا رہا کہ ایک انسان سے مجسمہ بن گیا اور اسے ڈر اور خوف تھا کہ وہ اپنی بہنوں کی موت کا بدلہ ضرور لے گا۔ ان کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا بدلہ ضرور لے گا۔ جس طرح اس کی بہنیں مری ہیں وہ بھی انہیں اسی طرح جلا ڈالے گا۔ جب بھی جاگیردار کو اس مجسمے کے انتقام کا خیال آتا تو کانپ اٹھتا اور چیخا کہ مجھے اس کی دونوں آنکھیں چاہئیں۔ میں ان چمکتی آنکھوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جلا دینا چاہتا ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دینا چاہتا ہوں لیکن اس کی آنکھیں نکالنا معمولی بات نہ تھی جو بھی اس کے سامنے ہوتا تھا اس کی آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے جل مرتا تھا، پگھل جاتا تھا اور جاگیردار کو صرف یہی خدشہ تھا کہ کہیں وہ مجسمہ حرکت میں نہ آ جائے۔ کہیں وہ واپس دوبارہ گاؤں میں نہ آ جائے۔ اسی لئے کبھی کسی اور کبھی کسی سے اس مجسمے کی آنکھوں کا مطالبہ کرتا تھا۔

گاؤں والے جاگیردار کی اندرونی کیفیت سے بے خبر تھے۔ وہ صرف یہ سمجھتے تھے کہ وہ یہ سب گاؤں والوں کی خاطر کر رہا ہے تاکہ گاؤں والے اس سے محفوظ رہیں۔

جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر اس کا پگھلا جسم دیکھ کر اسے اپنے خاندان کی موت یقینی دکھائی دے رہی تھی۔ ہر وقت ہر لمحہ اسے یہ ہی خدشہ تھا کہ کہیں مجسمہ اس کے قریب نہ آ جائے۔ جس گاؤں میں اس کا مجسمہ ہے اسی گاؤں میں زاہد کی ماں اور بہنوں نے رہائش رکھ لی تھی لیکن نہر دار کے ظالم بیٹوں کے ہاتھوں بچ نہ سکیں۔ دوسری بہنوں کی طرح انہوں نے بھی جان دے

جادوگر لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کھڑا سامنے کے منظر سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس کی طاقت اس قدر زیادہ نہ تھی کہ وہ مجسمے کا سامنا کر سکے۔ اندھیری رات میں تنہائی میں اسے قبرستان میں ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑی بلا مجسمے کے ارد گرد گھوم رہی ہو۔ تمام قبرستان دہشت زدہ بنا ہوا تھا اور مجسمے کی آنکھوں سے نکلنے والی چمک اس منظر کو مزید خوفناک بنا رہی تھی۔ پہلے تو اس نے واپس بھاگ جانا چاہا، لیکن دوسری طرف جاگیردار کے کہے ہوئے فقرے اس کے کانوں میں گونجنے لگے کہ اگر تم مجسمے کی چمکتی آنکھیں گاؤں تک نہ لا سکتے تو تجھے زندہ قبر میں پھینک دیں گے۔ آگے بھی موت، پیچھے بھی موت۔ گو کہ جادوگر کھلاڑی تھا آسبی تو توں پر قبضہ جمانا جانتا تھا لیکن اس قدر بھیاں تک سات سروں والی بلا اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی جو مجسمے کے ارد گرد ایسے گھوم رہی تھی جیسے اس کی حفاظت کر رہی ہو۔

جادوگر ایک جگہ جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا اور اپنا منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ ایک چیخ جادوگر کے منہ سے بلند ہوئی اور ساتھ ہی اس نے ایک بہت بڑے سیاہ ناگ کو قریب سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ یہ چیخ سیاہ ناگ کے ڈسنے سے پیدا ہوئی تھی۔ لمحوں میں ہی جادوگر دُج شدہ مرغ کی طرح پھڑکنے لگا۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگی اور جھاڑیوں میں ہی تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ گاؤں کے کنارے کھڑے جاگیردار کے دونوں ملازم اور چند مرد قبرستان کا تمام منظر دیکھ رہے تھے۔ مجسمے کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں کو دیکھ رہے تھے۔ گونجنے والی چیخوں کو سن رہے تھے لیکن ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ قبرستان کے قریب جا سکیں۔ جادوگر کا پتہ معلوم کر سکیں کہ اس نے مجسمے کی آنکھیں نکال کر کامیابی حاصل کی ہے کہ نہیں۔ صرف وہیں کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔

رات اسی طرح گزر گئی صبح دونوں جادوگر کا انتظار کرنے لگے لیکن قبرستان کی جانب

ایک علم والے نے یہ بات سننے کے بعد ہر بات کا اندازہ لگا لیا اور اس کے عمل کے بارے میں آگاہ کر دیا کہ اس کے پاس شیطانی علم تھا اور یقیناً وہ قبروں کے مردے بھی اکھیڑتا ہوگا کیونکہ چوہوں، بلیوں کے کئے سر یہی بات ظاہر کرتے ہیں۔

یہ بات لوگوں کیلئے عام نہ تھی بلکہ ایک چونکا دینے والی بات تھی۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار ایسی بات سنی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس گھناؤنے منتر کے بارے میں سنا تھا اور سائیں بابا کا خیال دلوں میں گھوما کہ جس دن یہ پاگل انسان بت بنا تھا اس دن سائیں بابا بھی غائب تھا۔ کیا یہ سب کھیل بابا سائیں تو نہیں کرواتا رہا؟ کیا اس پاگل سے وہ اپنا مقصد پورا کرواتا رہا ہے؟ لیکن اب ان باتوں کا فائدہ نہیں تھا۔ اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا لیکن ایک بات دل میں کھٹکتی رہی کہ وہ پاگل انسان انسان سے مجسمہ کیسے بنا؟ کیا کسی جناتی مخلوق نے اسے جکڑا ہے؟ کیا کسی غیبی مخلوق نے اس کے جسم کو بے حرکت و بے جان کیا ہے؟ ایک چلتے پھرتے انسان کو ساکت، بے حرکت کرنے والا کون ہے؟ لیکن یہ بات بھی آئی گئی ہوگی۔ مجسمہ کو دفن کرنے کے بعد گاؤں والے اور آس پاس کے قریبی گاؤں والے مطمئن ہو گئے۔ زندگی معمول کے مطابق گزرنے لگی۔ چروں پر پہلے جیسی مسکراہٹ اور رونق لوٹ آئی۔ دلوں سے خوف ختم ہو گیا لیکن اس کے باوجود بھی لوگ ٹیلے کے قریب جاتے تو مجسمے کے چہرے کی طرف نہ جاتے۔

چہرے کے سامنے کھڑے ہونے سے گھبراتے کہ کہیں آنکھوں کی چمک مٹی کو چیرتی ہوئی ان کے جسموں کو پکھلا نہ دے اور وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح پگھل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ نہ بن جائیں۔

تقریباً ایک ماہ گزرا ہوگا کہ اس ٹیلے پر کسی خستہ حال انسان نے جس نے صرف جسم پر خالی لنگوٹی پہن رکھی تھی آ کر ڈیرہ جمایا جو کبھی قہقہے لگاتا، کبھی ناچتا، کبھی کچھ کرتا۔ ٹیلے پر لگا ہوا خیمہ دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں رہا سہا خوف بھی ختم ہو گیا کوئی اسے ملگ کہتا، کوئی بابا، کوئی کچھ کہتا۔ ایک دن کسی نے بابا کو اس ٹیلے کی حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ یہ ٹیلا قدرتی نہیں ہے اسے بنایا گیا ہے۔ اس کے نیچے ایک مجسمہ دفن ہے۔ زندہ سلامت مجسمہ اور یہ اس شخص کا مجسمہ ہے جسے گاؤں کی گھلیوں میں، کھیتوں میں، ویرانوں میں، قبرستانوں میں دیکھا جاتا رہا ہے۔ اسے جب بھی دیکھتے بلیاں اور چوہے پکڑتا رہتا۔ آنکھوں میں عجیب چمک ہوتی جیسے آنکھیں نہ ہوں انکارے ہوں اور جسم ایسے ہوتا ہے جیسے رات بھر اپنے جسم پر خون ملتا رہا ہو۔ اس انسان

دی تھی، موت کو گلے لگا لیا تھا۔ ماں ان کے دکھ میں جان دے بیٹھی تھی اور زاہد کو کیا علم تھا کہ اس کی بہنیں بھی یہاں کہیں ہیں اور ادھر ہی وہ بھی ختم ہو گئی ہیں۔

گاؤں والوں کو اس بات کی خبر بھی نہ ہوئی تھی کہ دونوں لڑکیاں کیوں پھندا لے مری ہیں؟ ان کی ماں کس غم، دکھ، صدمے کو گلے سے لگا کر چل بسی ہے؟ زاہد کون ہے؟ اس کا پلان کیا ہے؟ کسی کو علم نہ تھا۔

جاگیردار نے اپنے بیٹے کو بھی اس لئے بھیجا تھا کہ شاید وہ کامیاب ہو جائے۔ ایک تو اس کے دل کا خوف ختم ہو جائے اور دوسرا گاؤں والوں کے سامنے وقار بن سکے لیکن اس کی موت دیکھ کر تڑپ گیا اور اب جادوگر کی خدمات حاصل کیں۔ اس کے ذریعے مجسمے کی آنکھیں نکالنے کو کہا اور بیش بہا انعامات سے نوازنے کو کہا تھا لیکن جادوگر بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ یہ خبر جاگیردار کے سیدی دل پر لگی۔ وہ کانپ کر رہ گیا۔ ادھر گاؤں والوں نے نمبردار کے ڈیرے پر ایک مشورہ کیا کہ مجسمے کو مٹی ڈال کر کھڑے کھڑے دفن دیا جائے تاکہ لوگ اس کی پچھلی آنکھوں کا نشانہ نہ بن سکیں۔ جلنے، پکھلنے اور ہڈیاں بننے سے محفوظ رہیں۔ یہ ایسا مشورہ تھا کہ جو ہر کسی کو پسند آیا اور ہر کسی نے اس کام میں حصہ لیا۔ اس کی آنکھوں سے بچتے ہوئے اس پر مٹی ڈالنے رہے۔ اسے دفن کرتے رہے۔ پورا دن انہوں نے اس کام میں صرف کر دیا اور اسے دفن کر دیا۔ یہ مجسمہ ایک ٹیلا بن گیا۔ مجسمہ کی جگہ کو لوگوں نے خوفناک ٹیلا کہنا شروع کر دیا۔ اس مجسمے کی یہ کہانی ہر کسی کو یاد تھی اور ان کے ایسا کرنے سے گاؤں کے لوگ مرنے سے، جلنے سے، پکھلنے سے محفوظ رہے۔ اب ہر کوئی وہاں آنے جانے لگا لیکن ہر رات انہیں وہاں ٹیلے پر ایک حسین صورت دکھائی دیتی جو کبھی ٹیلے پر چکر لگاتی اور کبھی قبرستان میں گھس جاتی اور وہیں غائب ہو جاتی۔ کبھی ٹیلے کے قریب سے گھنگھروں کی آوازیں سنائی دیتیں۔

ہر کسی کو معلوم تھا کہ ٹیلے پر گھومنے والی صورت انسانی نہیں ہے بلکہ جناتی مخلوق ہے اور وہ ایسا کیوں کرتی ہے یہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ جلد ہی لوگوں کو اس بات کا بھی علم ہو گیا کہ چوہوں اور بلیوں کے کئے ہوئے سرکھیتوں میں، ویرانوں میں پڑے دکھائی دیتے۔ یہ وہ بلیاں تھیں جنہیں وہ پاگل اور دیوانہ انسان دن بھر پکڑ پکڑ کر باندھتا رہتا تھا۔ بلیوں کے کئے سر دیکھ کر لوگوں کی تمام تر توجہ اس طرف چلی گئی کہ ایسا کیوں ہے؟ وہ پاگل انہیں ذبح کیوں کرتا تھا۔ ان کے سر جسموں سے علیحدہ کیوں کرتا تھا؟ یہ بات گاؤں کے علاوہ دوسرے گاؤں میں بھی پھیلتی گئی۔

باہر نکالو۔“

یہ الفاظ سنتے ہی تمام لوگ کانپ کر رہ گئے اور بولے۔ ”یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ آپ اپنا علم اپنے پاس رکھیں جب سے اس پر مٹی ڈالی ہے گاؤں میں سکون ہے۔ ہمارے لیے یہ اب اندھا ہو گیا ہے۔ مر گیا ہے۔ اس کی آنکھوں کی چمک ختم ہو گئی ہے۔ اگر دوبارہ ایسی بات کی تو قبرستان سے اٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔“

بابا لوگوں کی باتیں سن کر ڈر گیا۔ اسے اپنے مقصد میں ناکامی دکھائی دینے لگی۔ ادھر لوگوں کو بھی ملنگ بابا کھلنے لگا۔ انہوں نے اسے فوری طور پر ڈیرہ اٹھا لینے کو کہا۔ لہذا دوسرے دن جب لوگ قبرستان کے قریب سے گزرے تو ملنگ بابا کا ڈیرہ غائب پایا۔ شاید وہ لوگوں کی دھمکیوں میں آچکا تھا اس لیے بھاگ نکلا لوگوں نے سوچا لیکن ملنگ بابا نے بھی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ جب تک یہ مجسمہ حاصل نہیں کر لیتا سکون سے نہیں بیٹھے گا۔ لہذا وہ چلتا ہوا اپنے گرو کے پاس جا پہنچا اور مجسمہ کا ذکر چھیڑ کر تمام روداد سنا ڈالی تو گرو نے کہا اسے ایک ایسے انسان نے جکڑا ہوا ہے جس کی تمام جنات پر حکمرانی تھی اور قبروں کے مردے سے بھی کام لے سکتا تھا۔ تم اس جیسا عمل کرو تو تم اس مجسمے پر فتح حاصل کر سکتے ہو۔ تم کسی طرح مجسمے کو زندہ کر دے مٹی کو ہٹاؤ اور چالیس دن تک بلیوں اور چوہوں کا خون اس کے جسم پر پھینکو پھر وہ تمہارے قبضہ میں آ جائے گا۔ اکتالیس ویں یعنی آخری روز ایک نیا مردہ اس کے سامنے رکھ دینا وہ تمہارا غلام ہو جائے گا۔ یہ کام مشکل نہ تھا لیکن اصل مسئلہ مجسمہ پر سے مٹی کو ہٹانا تھا اور اس کے بعد یہ عمل کرنا تھا۔

گرو بابا نے اسے سمجھایا اگر وہ جادو کے سحر میں جکڑا نہ جاتا تو بہت بڑی قوت بن سکتا تھا۔ اگر تم یہ عمل کرو گے تو اس کی تمام تر قوت تیرے قبضہ میں آ جائے گی۔ تم نے ہر روز پانچ بلیاں اور پانچ چوہے لے کر ان کے خون سے اسے نہلانا ہے۔ اپنا ورد پڑھنا ہے اور مجسمے پر پھونکنیں مارتا ہے۔ تب تم اپنا مقصد پا لو گے پھر بہت بڑا کارنامہ ہو گا۔ اگر ناکام ہو گئے تو تمہاری تمام طاقتیں اس مجسمے میں چلی جائیں گی۔

ادھر گاؤں میں ملنگ بابا کے متعلق لوگ عجیب عجیب باتیں کر رہے تھے۔ نمبردار کہہ رہے تھے۔

”اتنی مشکل سے گاؤں والوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر مجسمہ کو دفن کیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اسے دوبارہ زندہ کر دے مٹی ہٹاؤ میں نے منتر پڑھنا ہے اس کی چمکتی آنکھوں کی مینائی ختم

کو نجانے کس نے ساکت کر دیا؟ کس نے انسان سے مجسمہ بنا دیا اور اب تک اس کی آنکھوں کی چمک سے کئی افراد جل چکے ہیں، پگھل چکے ہیں، صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔

بابا لوگوں کی زبانی یہ کہانی سن کر قہقہے لگانے لگا جیسے اسے خوفزدہ کیا جا رہا ہو۔ ٹیلا چھوڑنے کا کہا جانے لگا ہو۔ لیکن وہ بولا میں یہاں ہی رہوں گا۔ مجھے کسی چیز سے خوف نہیں آتا۔ زندگی بھر ویرانوں میں گھومتا رہا ہوں کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن اصل حقیقت کچھ اور تھی۔ یہ بابا بھی شیطانی علم کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور گاؤں والوں کی باتیں پھیلنے پھیلنے اس بابا کے کان تک بھی جا پہنچی تھیں اور وہ یہ مجسمہ ہر صورت میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے ہزاروں بھیاں کم قیمت کے کام لے سکتا ہے۔ چلتے چلتے اور تلاش کرتے کرتے کھوج لگاتے لگاتے یہاں تک پہنچا تھا لیکن یہاں مجسمہ کو غائب پا کر پریشان ہو چکا تھا لیکن جب گاؤں والوں نے یہ بتایا کہ جہاں وہ بیٹھا ہے ڈیرہ بجائے ہوئے ہے یہاں نیچے مجسمہ موجود ہے تو اس کی زبان سے قہقہے بلند ہونے لگے۔ اسے اپنی کامیابی یقینی نظر آنے لگی۔ لوگ اس کی دلیری پر خوش ہو رہے تھے۔ ان کے دلوں میں تھوڑا بہت جو خوف تھا وہ بھی ملنگ بابا کے آنے سے ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ لوگ پہلے کی طرح قبرستان میں آنے جانے لگے لیکن راتوں کو یہاں کا رخ نہ کرتے اور رات کو بابا اپنے منتر پڑھتا رہتا۔ اس مجسمے پر کیے گئے جادو کو ختم کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن اسے مسلسل ناکامی ہو رہی تھی جس وجہ سے وہ سخت پریشان تھا۔

ایک دن اس نے لوگوں سے پوچھا کہ اسے جکڑا کس نے تھا تو ایک نئی کہانی اس کے سامنے آ گئی کہ یہ شخص سارا دن بلیاں چوہے اکٹھے کرتا رہا تھا۔ ان کی گردنیں کاٹ دیا کرتا تھا اور سنا ہے کہ یہ قبریں بھی کھودا کرتا تھا۔ یہاں ایک بزرگ ہوا کرتے تھے اس کے پاس رہا کرتا تھا۔

ملنگ بابا نے بزرگ کا پوچھا تو گاؤں والوں نے بتایا کہ جس دن یہ انسان سے مجسمہ بنا وہ بزرگ غائب ہیں۔ نجانے کہاں چلا گیا ہے؟ لگتا ہے یہاں قبرستان میں بہت بڑی بڑی بلائیں رہتی ہیں جو بابا کو ختم کر گئی ہیں اور اسے ساکت کر گئی ہیں۔

ملنگ بابا نے ہر بات کی چھان بین کر کے کہا۔ ”ٹھیک ہے اب اس مجسمہ سے کسی کو کوئی ڈر خطرہ نہیں ہے۔ پہلے پہل تو میں بھی خوفزدہ ہو گیا تھا لیکن اب جان گیا ہوں کہ یہ مجسمہ کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے پاس ایک منتر ہے میں وہ شروع کرتا ہوں اور اس کی چمکتی آنکھوں کی مینائی ختم کرتا ہوں۔ اس کی آنکھوں کی چمک کو ختم کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو اس مجسمے کو مٹی سے

رہتی اور پھر جھاڑیوں میں جا کر غائب ہو جاتی۔

ایک ہفتہ ایسا ہی ہوا مجسمہ پہلے کی طرح ظاہر ہو گیا۔ لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں بند ہونے لگیں۔ اپنے اپنے پھلتے جسم دکھائی دینے لگے۔ اب تو لاش کے علاوہ گاؤں کے ارد گرد بلیوں اور چوہوں کے کٹے سر بھی دکھائی دینے لگے۔ گاؤں والوں کے چہروں سے رونق بالکل جاتی رہی۔ ہر وقت اڑے اڑے رنگ کے ساتھ ایک دوسرے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے۔ سبھی کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

ہر ایک کے دل میں یہ خیال پرورش پا رہا تھا کہ کسی وقت بھی وہ موت کی وادیوں میں جا سکتا ہے۔ پہلے والی کیفیت چہروں سے جھلکنے لگی۔ گاؤں کے علاوہ دوسرے گاؤں والے بھی اپنے راستے بدلنے لگے۔ اس بھیا نک قبرستان کے قریب سے کسی میں ہمت نہ ہوتی کہ وہ گزرتا۔ دفن شدہ مجسمہ پھر پہلے کی طرح ظاہر ہو چکا تھا۔ ہر رات لاش قبرستان میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی۔ مجسمے پر کوئی چیز چھینکتی اور اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور رات گئے تک یہ منظر دیکھنے کو ملتا اور پھر لاش چلتے چلتے انہی جھاڑیوں میں جا کر غائب ہو جاتی۔ ادھر مجسمے کی چمکتی آنکھوں سے نکلنے والے شعلے قبرستان میں بلند ہونے لگے۔ ہر رات بھیا نک مناظر دیکھائی دیتے۔ ہر رات قبرستان میں کفن پوش لاش چلتی دکھائی دیتی۔ ہر روز گاؤں کے آس پاس چوہوں اور بلیوں کے کٹے سر بکھرے نظر آتے۔ ہر روز مجسمے اور کفن پوش لاش کا آمنا سامنا ہوتا۔ گاؤں کے لوگ رات کے پچھلے پہر مکانوں کی چھتوں پر بیٹھ کر قبرستان کا منظر دیکھتے رہتے۔

تقریباً ایک ماہ گزر گیا یہ خوفناک اور بھیا نک منظر جاری رہا۔ گاؤں والوں کے سانس حلق میں اٹکے رہتے۔ عورتیں بچوں کو گاؤں سے باہر تک نہ جانے دیتیں۔ ان کے چہروں پر بھی خوف تھا۔ ان کی رنگت بھی پہلی زرد پڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی پریشان حال تھیں کہ نجانے ابھی کیا ہو جائے گا۔

گاؤں والے نمبردار کے ڈیرے پر جمع ہو جاتے اور رات کو دیکھنے والے مناظر سے آگاہ کرتے اور نمبردار جو کہ خود بھی قبرستان میں چلتی پھرتی لاش کو دیکھ چکا تھا۔ دفن شدہ مجسمے کو دوبارہ ظاہری حالت میں دیکھ چکا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح وہ خود بھی بے بس تھا۔ نہ تو وہ مجسمے کی چمکتی آنکھوں کا مقابلہ کر سکتا تھا اور نہ ہی چلتی پھرتی لاش کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس بات کا کوئی حل بھی سمجھ میں نہ آ رہا تھا لیکن ایک بات تھی کہ کوئی بھی آسبہ قوت گاؤں کی طرف نہ آتی

کرتی ہے۔ یہ کرنا ہے وہ کرنا ہے نجانے کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں بس رہے ہیں۔ آئندہ کسی ملک باپے کو گاؤں میں یا گاؤں کے ارد گرد نہ پھٹکنے دیتا۔“

قبرستان میں ہر رات چڑیل گھومتی دکھائی دیتی، کبھی ٹیلے پر جا کر بیٹھ جاتی، کبھی قبرستان میں گھومتی رہتی لیکن گاؤں والوں کو کچھ نہ کہتی۔ نہ تو گاؤں والوں کو ڈراتی اور نہ ہی کسی کا خون کرتی۔ بس مستی کے عالم میں ٹیلے کے ارد گرد گھومتی رہتی جیسے مجسمے کی حفاظت کر رہی ہو۔

ایک دن اچانک گاؤں کا ایک آدمی رات کو سویا تو صبح زندہ نہ اٹھ سکا۔ اس کی موت پر کھرا مچ گیا۔ لوگ اس کے جسم کو بخور دیکھتے کہ کہیں کسی چڑیل، جن بھوت نے تو اسے ہمیشہ کی نیند نہیں سلا دیا ہے۔ لوگ پریشان اور خوفزدہ تھے لیکن مرنے والے کے جسم پر کوئی ایسا نشان نہ تھا کہ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ وہ مرا نہیں رات کو سوتے میں اسے مارا گیا ہے۔ پورا دن گزر گیا رات کو ٹیلے والے قبرستان میں جا کر دفن کر دیا گیا۔ اب چونکہ مسم کچھ بدل چکا تھا۔ سردی کی جگہ گرمیوں نے لے لی تھی۔ رات کے پہلے پہر گرمی ہوا کرتی تھی جبکہ رات کے دوسرے حصہ میں سردی۔

گاؤں کے کچھ لوگ گاؤں کے قریب کھلے میدان میں بیٹھے مرنے والے سے متعلق باتیں کرنے میں مصروف تھے کہ کسی آدمی کی نظر قبرستان پر جا پڑی جس نے چاند کی روشنی میں قبرستان کا منظر دیکھتے ہی خوفزدہ ہو کر کہا۔ ”وہ دیکھو قبرستان میں۔“

اس کی بات پر جب لوگوں نے قبرستان کی طرف دیکھا تو انہیں قبرستان میں کفن میں لپی ہوئی ایک لاش چلتی پھرتی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی سبھی کے رنگ پیلے پڑ گئے۔ وہ سمجھ بیٹھے کہ جس آدمی کو وہ دفن کر کے آئے ہیں وہ قبرستان میں گھوم رہا ہے۔ یہ منظر بھی گاؤں والوں کیلئے انوکھا اور پہلا تھا۔ چلتی پھرتی لاش کو انہوں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ ادھر کفن پوش لاش چلتے چلتے ٹیلے پر چڑھ گئی اور وہاں سے مٹی ادھر ادھر پھینکتی شروع کر دی۔ یہ منظر دیکھتے ہی وہ مرد گھروں کو بھاگ نکلے۔

ایک مرتبہ پھر گلوں والوں کے چہرے خوفزدہ ہونے لگے۔ انہیں اپنی موتیں دوبارہ سروں پر سوار دکھائی دینے لگیں۔ ہر رات ایسا ہوتا کفن پوش لاش ٹیلے پر چڑھ جاتی اور مٹی ادھر ادھر بکھیرنے لگتی۔ لوگ ہر روز صبح دیکھتے تو ٹیلے سے مٹی ادھر ادھر بکھری ہوتی۔ کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ وہ قبرستان میں جا کر دوبارہ مٹی ڈالتا اور وہ کفن پوش لاش ہر رات مٹی ادھر ادھر بکھرتی

تھی۔

وہاں جائے۔ پہلے صرف مجھے کا خوف تھا لیکن جب سے انہیں چلتی پھرتی لاش دکھائی دے رہی تھی تب سے تو انہوں نے بالکل وہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔

رات آدھی گزر گئی تو لوگوں کو وہی کفن پوش لاش جھاڑیوں سے نکل کر قبرستان میں چلتی پھرتی دکھائی دی۔ پہلے تو مجھے کے سامنے گئی۔ اس پر کچھ پھینکا اور پھر اس نے اپنا رخ گاؤں کی جانب کر لیا۔ یہ منظر دیکھ کر چھتوں پر بیٹھے لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ لاش نے گاؤں کا رخ کر لیا ہے اور کسی انسان کو دبوچنا چاہتی ہے لیکن وہ چلتے چلتے دوسرے قبرستان میں جا پہنچی۔ یہ قبرستان بھی گاؤں والوں کو دکھائی دیتا تھا۔ یہ دوسرے گاؤں کا قبرستان تھا جو دونوں گاؤں کے درمیان تھا۔ اس قبرستان میں جا کر لاش نے گھومنا شروع کر دیا اور چلتے چلتے اس قبر پر جا کر رک گئی جہاں لوگوں نے شام سے قبل خوف اور دہشت سے مر جانے والے آدمی کو دفنایا تھا۔ اس قبر کے قریب بیٹھے ہی کفن پوش نے قبر کی مٹی ادھر ادھر بکھیرنی شروع کر دی۔

یہ منظر دیکھ کر لوگوں کے دلوں کی حرکت بند ہونے لگی۔ وہ جان چکے تھے کہ جس آدمی کو وہ قبر سے نکال رہا ہے یہ بھی چلنا شروع کر دے گا اور یہ بھی لوگوں میں دہشت پھیلا دے گا۔ نظروں کے سامنے یہ تمام منظر دیکھنے کے باوجود بھی لوگ بے بس اور سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ ادھر کفن پوش نے قبر کھود کر اندر سے لاش نکالی اور اپنے کندھوں پر رکھ کر قبرستان سے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ شاید دوسرے گاؤں والے بھی یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان سے رہا نہ گیا اور ایک شور کی پکار کے ساتھ جھرمٹ میں اس چلتی ہوئی لاش کی جانب بھاگنے لگے۔ کفن پوش نے اپنے پیچھے آتے لوگوں کو دیکھا تو لاش کو پھینک کر بھاگنا شروع کر دیا لیکن لوگوں نے بھی اس وقت تک سانس نہ لیا جب تک اس چلتی پھرتی لاش کو قابو میں نہ لے لیا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اس گاؤں والے لوگ بھی چھتوں سے نیچے اتر آئے اور وہاں جمع ہونے لگے اور یہ دیکھ کر سبھی کی آنکھیں انکارے اگلنے لگیں کہ جس کفن پوش کو وہ آج تک لاش سمجھتے رہے تھے وہ لاش نہ تھی، مردہ نہ تھا بلکہ وہی بابا تھا جسے انہوں نے ٹیلے سے بھاگایا تھا۔ جس نے کہا تھا کہ میں مجھے پرستار پڑھنا چاہتا ہوں۔

لوگوں کی یہ حالت تھی کہ جو کچھ بھی ان کے ہاتھ میں آ رہا تھا اس سے ہی اسے پیٹ رہے تھے، لبوہان کر رہے تھے۔ ہر طرف بابا کی خبر پھیل گئی۔ لوگوں نے اسے رسیوں سے باندھ دیا اور قبر سے نکالے گئے مردے کو دوبارہ دفن کیا گیا۔ اس کے بعد بابا کو پکڑ کر گاؤں لے

دن گزرتے رہے۔ اندھیرے اجالوں میں اور اجالے تاریکیوں میں بدلتے رہے۔ ایک روز گاؤں والوں نے مشورہ کیا کہ کسی علم والے کو بلانا چاہئے۔ قبرستان کا ایک جائزہ ضرور لینا چاہئے۔ جن جھاڑیوں میں جا کر لاش غائب ہو جاتی ہے اس جگہ پر پڑھائی کروانی چاہئے تاکہ لاش کا ہر روز ظاہر ہونا ختم ہو جائے۔ یہ بات سوچ کر انہوں نے طے کیا کہ صبح شہر سے کسی کو بلائیں گے۔ لہذا صبح سویرے ہی ایک آدمی شہر چلا گیا۔ رات ہونے تک وہ شخص واپس نہ آیا تو گاؤں والے پریشان ہو گئے اور چھتوں پر جا کر اس کا راستہ دیکھنے لگے۔ حسب عادت سب سے پہلے ان کی نظر قبرستان کی جانب ہی پڑتی جہاں مجھے کو کھڑا پاتے۔

اس کی آنکھوں سے چمکنے والی روشنی کو دیکھتے آدھی رات گزر گئی تو جھاڑیوں سے پھر کفن میں لپٹی ہوئی لاش ظاہر ہوئی۔ چلتے چلتے اس نے پورے قبرستان کا چکر لگایا اور پھر مجھے کے قریب جا کر کوئی چیز اس پر پھینکی اور سامنے کھڑی ہو گئی۔ رات گئے تک مجھے اور لاش ایک دوسرے کے سامنے رہے۔ ابھی اندھیرا باقی تھا کہ گاؤں کا وہی آدمی واپس گاؤں کی طرف پیدل آتا دکھائی دیا تو لاش بجلی کی طرح تیزی سے اس کی طرف بھاگنے لگی۔ لاش کو اپنی طرف بڑھتے دیکھتے ہی آدمی نے سر پیٹ بھاگنا شروع کر دیا۔ لاش کے قابو نہ آیا۔ لاش واپس قبرستان آ کر انہیں جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ لوگ چھتوں پر بیٹھے یہ منظر دیکھ کر کانپ گئے اور چھتوں سے نیچے اتر کر اس آدمی کی طرف بھاگے۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ خوف سے چہرے کی رنگت بدلی ہوئی تھی۔ جانوروں کی طرح ہو تک رہا تھا۔ لاش کی دہشت اور خوف اس کے سر پر اس قدر سوار تھی کہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہی اس کی سانسیں رک گئیں اور ان کے ہاتھوں میں ہی اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

گاؤں میں ایک کہرام مچ گیا۔ چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ اس کی مدت کا سبب تو ہر کوئی جان چکا تھا کہ وہ کیونکر مرا ہے۔ اگر دل کا مضبوط ہوتا تو شاید نہ مرنے۔ چلتی پھرتی لاش کا اثر اس قدر اس نے لیا کہ جان گنوا بیٹھا۔

پورا دن گاؤں میں کہرام برپا رہا۔ شام سے پہلے ہی اسے دفن کر دیا گیا اور یہ طے ہو گیا کہ کل صبح سویرے ہی پھر شہر سے کسی عامل کو گاؤں ضرور لایا جائے تاکہ گاؤں آسپی سابیوں سے پاک ہو سکے۔ لوگ ڈر اور خوف سے اپنی جانیں نہ گنوائیں۔ اس آدمی کو گاؤں کے دوسرے قبرستان میں دفن کیا گیا کیونکہ مجھے والے قبرستان میں کسی کی ہمت نہ ہو رہی تھی کہ

مردائے جائیں تاکہ اسے اس کے کیے کی سزا مل جائے۔ یہ رائے سب ہی کو پسند آئی۔ اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ سبھی اس شیطان نما انسان کو پتھر ماریں۔ لہذا ایسا ہی ہوا۔ ہر کوئی اسے ایشیں پتھر مارنے لگا۔ ہر کوئی اپنے خوف کا بدلہ لینے لگا اور بابا خون میں بھیگی زبان سے صرف ایک ہی لفظ کہہ رہا تھا میری موت تم سب کی موت ہو گی۔ مجسمہ کی آنکھوں کی چمک دوگنا تیز ہو جائے گی۔ میرا سارا جادو اس میں چلا جائے گا لیکن لوگ اسے جھوٹ سمجھتے رہے اور پتھر مارتے رہے۔ وہ خون میں لت پت درخت کے ساتھ بندھا ترپتا رہا اور تڑپتے تڑپتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ اسے اس کے کیے کی سزا مل گئی۔

اس کے مرتے ہی قبرستان بھیانک آوازیں سے گونج اٹھا۔ ابھی صبح نہ ہوئی تھی اندھیرا باقی تھا کہ انہیں ہر طرف سے بھیانک چہرے دکھائی دینے لگے۔ یہ دیکھتے ہی سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے۔ ان کو ملنگ بابا کی تمام باتیں یاد آنے لگیں کہ اس کی موت سبھی انسانوں کی موت ہو گی۔ اب ہر کوئی پچھتا رہا تھا ہر کوئی اپنے آپ کو موت کے شکنجے میں پھنسا سمجھ رہا تھا۔

صبح ہو گئی تو لوگ ڈرے ڈرے گھروں سے باہر نکلے۔ اسی درخت کے پاس آئے تو وہاں بابا کی لاش کی بجائے ہڈیوں کے ڈھانچے کو کھڑے پایا جس کے جسم کی تمام کھال پھل کر زمین پر جچی پڑی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر وہ سبھی خوف سے کانپنے لگے۔ جب ان کی نظر قبرستان کی جانب اٹھی تو وہاں سے مجسمہ غائب تھا۔ اسے زمین نکل گئی تھی یا آسمان یا پھر چڑیلیں اٹھا کر لے گئیں تھیں۔ گاؤں والوں کے خوف میں اضافہ ہوتا گیا اور ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے کہ ہمیں بابا کی بات مان لینی چاہئے تھی۔ اسے ایک رات کی زندگی دے دینی چاہئے تھی لیکن اب کیا فائدہ تھا۔ انہوں نے اس ڈھانچے کو چار پائی پر لٹایا اور عزت کے طور پر کفن پہنایا تاکہ اسے دفنا سکیں لیکن کفن پہنائے ابھی چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ اس کے جسم کے گرد لپٹا کفن جلنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔

کفن کا جلنا معمولی واقعہ نہ تھا۔ عبرت ناک اور چونکا دینے والا تھا اور ایسا ہو جانا عذاب الہی تھا جو دنیا والوں کو دکھا دیا گیا تھا کہ شیطانوں کو اپنا پیشوا سمجھنے والوں کیلئے آخرت میں عبرت ناک سزا ہے۔ جلتا کفن دیکھ کر لوگ کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔ توبہ توبہ کرنے لگے۔ پورے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی۔

دوسرے گاؤں والے بھی یہ خبر سن کر گروپ درگروپ بھاگے آئے اور باتیں کرنے

آئے۔ ہر کوئی چھترول کر رہا تھا۔

نمبردار کے ڈیرے پر ایک بھوم تھا۔ نمبردار کی آنکھیں آگ اگل رہی تھیں۔ بابا نمبردار کے قدموں میں گرامنت و ساجت کرنے لگا کہ مجھے چھوڑ دو صرف آج کی رات مجھے اپنا عمل پورا کرنے دیں اگر آپ لوگوں نے مجھے میرا عمل پورا نہ ہونے دیا تو میری 40 دن کی تمام محنت رائیگاں جائے گی۔ اس مجسمے کی طاقت دوگنا ہو جائے گی۔ میری طاقتیں بھی اس میں شامل ہو جائیں گی۔ وہ دور سے ہی تم لوگوں کو جلا ڈالے گا۔ صرف آج کی رات میں وعدہ کرتا ہوں کہ صبح سویرے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھ سے میری طاقتیں نہ چھینو ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ چڑیلوں کے ہاتھوں بوٹی بوٹی ہو جاؤں گا۔ جنات مجھے نوح ڈالیں گے۔ صرف آج کی رات ہے میں مجسمے پر قابو پا سکتا ہوں۔ اس کی آنکھوں کی بینائی ختم کر سکتا ہوں۔ مجھے میرے عمل سے نہ روکو۔

وہ سچ کہتا تھا یا جھوٹ لوگوں کو اس سے کوئی غرض نہ تھی وہ تو صرف اتنا جانتے تھے کہ اس نے کفن اوڑھ کر گاؤں والوں کو خوفزدہ کیا ہے۔ اس کی وجہ سے گاؤں کا آدمی خوف سے مرا اور پھر سب سے بڑھ کر اس لاش کی بے حرمتی کرنا چاہ رہا تھا جسے انہوں نے دفن کیا تھا۔ وہ کیسے معاف کر سکتے تھے لیکن بابا بار بار کہہ رہا تھا کہ میری موت تم سب کی موت ہو گی اور میرا آج کی رات زندہ رہنا تم سب کیلئے ہمیشہ کی زندگی ہو گی۔ اس مجسمہ کی تمام بینائی میں کھینچ لوں گا۔ ہر چیز میرے قبضہ میں ہو گی۔ یہی عمل ہے جو ہر چیز کو میرا غلام بنا سکتا ہے۔ اس کی باتوں پر لوگ طیش میں آ رہے تھے اور نمبردار نے گاؤں والوں سے مشورہ کیا کہ اس سے کیسا سلوک کیا جائے۔ آج کی رات چھوڑ دیا جائے یا۔

لیکن ہر کسی کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ ہم ایک لمحہ بھی اس کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ بابا نے چوہوں اور بلیوں کے کئے سروں کا بھی اعتراف کر لیا کہ ان کا خون مجسمہ پر اٹھتا رہا ہے۔ اپنے علم کو کامیاب بنانے کیلئے ایسا کرتا رہا ہے۔ تب نمبردار کے حکم سے پہلے بابے کو بندھی رسیوں سے گھسیٹنا شروع کر دیا۔ گاؤں کی گلیوں میں گھسیٹتے رہے اور شور مچاتے رہے کہ یہ شخص ہے جسے ہم چلتی پھرتی لاش سمجھتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے ایک موت ہوئی تھی۔ اس نے اس کی قبر اکھیر کر اس کی لاش کو بھی باہر نکالا تھا۔

کوئی کہہ رہا تھا کہ اسے زندہ ہی جلا دیا جائے کوئی کہہ رہا تھا کہ اسے زندہ زمین میں دبا دیا جائے اور کوئی کہہ رہا تھا کہ اسے درخت کے ساتھ باندھ کر چھوٹے بڑوں سے پتھر

اپنے خاندان کو مارا ہے۔“ جاگیردار کی بدلی کیفیت دیکھ کر اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے نمبردار نے کہا۔
”جاگیردار کھل کر بات کرو کیا پہیلیاں بچھوار ہے ہو۔“

تب جاگیردار بولا۔ ”شاید تم جانتے نہیں تمہارے بیٹوں نے گاؤں سے باہر اپنے ڈیرے پر ایک عورت اور دو لڑکیوں کو پناہ دی تھی اور ان سے زیادتی کی کوشش کی تھی پھر انہیں جان سے مار دیا تھا اور انواہ پھیلا دی تھی کہ وہ پھندا لے کر مر گئی ہیں۔“

اتنی بات سنی تھی کہ نمبردار نے جاگیردار کو اشارے سے خاموش رہنے کو کہا اور اپنے ارد گرد کھڑے ملازموں کو باہر بھیج دیا۔ تب کہا۔ ”جاگیردار جو ان خون ہے اور ایسا ہوتا رہتا ہے۔ ایسی باتوں کو سروں پر سوار نہیں کیا جاتا۔ جانتا ہوں کہ میرے بیٹوں کے ہاتھوں وہ مری ہیں اور ان کے صدمے میں ماں بھی ان کی مرگئی تھی لیکن تم کیوں پریشان ہو۔ اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟“

”نمبردار‘ نمبردار یہی تو ایک کہانی ہے یہ جو پکھلتے لوگوں کو دیکھ رہے ہوں ناں‘ جلتے دیکھ رہے ہوں ناں اسی کہانی کا ایک حصہ ہے۔“

یہ لفظ سنتے ہی نمبردار چونک گیا اور گھبراتے ہوئے بولا۔ ”کیا مطلب ہے؟“
تب جاگیردار نے کہا۔ ”وہ دونوں لڑکیاں اور اس کی ماں ہمارے گاؤں سے بھاگ کر آئی تھی۔ اس کی تین جوان بیٹیوں نے ہمارے گاؤں میں پھندے لے کر جان دے دی تھی۔“

”تم بھی۔“ نمبردار نے ہر بات سمجھتے ہوئے کہا۔

”ہاں میرے بیٹے بھی۔“ اور اس مجسمے کو جانتے ہوئے ان بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے نجانبے کم بخت کیسے زندہ بچ گیا۔ حالانکہ ٹانگوں سے باندھ کر پورے گاؤں کی گلیوں میں اسے کھنچوایا تھا لیکن بچ نکلا لیکن یہاں تک کیسے آ گیا؟ اور مجسمہ کیسے بن گیا؟ اس کی آنکھوں میں چمک کیسے آ گئی؟ یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔

فکر کی بات یہ ہے کہ یہ مجسمہ اپنی بہنوں کی اموات کا ضرور انتقام لے گا۔ تم سے بھی اور ہم سے بھی۔

جاگیردار کی باتیں سن کر نمبردار جو پرسکون تھا یکدم کانپ اٹھا۔ اس کی رگوں میں چلنے والا خون ایک لمحہ کو رک گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ خود کو زمین میں دھنستے ہوئے محسوس کیا۔ اکھڑے اکھڑے لفظوں کے ساتھ بولا۔ ”جاگیردار اب کیا کریں‘ کچھ حل

لگے کہ گھناؤنے اور بھیاں تک کام کرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ کفن جل گیا۔ ڈھانچہ برہنہ ہو گیا تو مشورہ سے دوبارہ کفن پہنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ کفن کا چمٹنا تھا کہ کفن دوبارہ جل اٹھا۔ کفن کے ساتھ ساتھ ڈھانچہ بھی سیاہ ہونے لگا۔ ہر کوئی حیران و پریشان تھا۔ ایک دفعہ پھر مشورہ ہوا کہ تیسری بار بھی دیکھ لیتے ہیں۔ شاید اب کی بار کفن نہ جلے لیکن تیسری بار کفن پہناتے ہی ویسا ہی ہوا۔ کفن جلتے جلتے ڈھانچے کو جلانے لگا۔

عذاب الہی دیکھ کر لوگوں نے ڈھانچہ کو اٹھایا اور جا کر ایک گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی۔ اب سرشام ہی لوگوں کو اپنے ارد گرد ڈھانچہ چلتا پھرتا دکھائی دیتا لیکن یہ ان کا وہم تھا۔ اصل خوف تو اس مجسمے کا تھا جو غائب ہو گیا تھا جس کے بارے میں بابا نے بتایا کہ میری تمام تر طاقت اس مجسمے میں چلی جائے گی۔ وہ حرکت کرنے لگے گا۔ انسانوں کو جلا ڈالے گا اور شاید مجسمے نے ملنگ کو بھی جلا ڈالا تھا۔ تبھی تو دوسرے آدمیوں کی طرح اس کے جسم کی کھال بھی زمین پر جمی پڑی تھی۔

دو دن گزر گئے لیکن مجسمہ دکھائی نہ دیا اور نہ ہی گاؤں میں کوئی خونی واقعہ رونما ہوا تھا۔ ادھر جاگیردار صاحب چند ملازموں کی حفاظت میں نمبردار کے پاس آ گئے کیونکہ یہ خبر اسے مل چکی تھی کہ مجسمہ غائب ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے دوست نمبردار سے تمام معلومات حاصل کیں۔ ملنگ بابا کی تمام کہانی نمبردار نے اسے سنا ڈالی کہ ہم نے ملنگ کو مار کر بڑی غلطی کی ہے اگر اسے ایک رات کیلئے چھوڑ دیتے اور وہ لاش مجسمے کے سامنے رکھ کر اپنا منتر پڑھ کر اپنی طاقت بڑھا لیتا اور مجسمے کی دونوں آنکھیں نکال لیتا۔ ان کی چمک کو ختم کر دیتا تو شاید گاؤں میں سکون ہو جاتا۔

جاگیردار چلایا۔ ”نمبردار گاؤں والوں کو چھوڑ دو وہ مرتے ہیں تو مرنے دو جلتے ہیں تو جلتے دو مجسمے کی آنکھوں کی چمک سے ان کے جسموں کی کھال پکھلتی ہے تو پکھلتے دو تم اپنی فکر کرو میری فکر کرو۔ جو کہانی میرے اندر تڑپ رہی ہے، چل رہی ہے وہی کہانی تمہاری ہے۔ جتنا خوفزدہ مجسمہ سے میں ہوں اگر تمہیں علم ہو جائے تو تم بھی تڑپ کر رہ جاؤ۔“

نمبردار جاگیردار کی باتیں سن کر چونک پڑا اور بولا۔ ”میں سمجھا نہیں جاگیردار تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

جاگیردار چلایا۔ ”کفن پوش کو تم لاش لے جانے دیتے اسے اپنا عمل پورا کرنے دیتے تم نے اس ملنگ کو نہیں مارا مجھے مارا ہے میرے خاندان کو مارا ہے اپنے آپ کو مارا ہے

نے یہ بات ظاہر کر دی تھی کہ اب کسی کی بھی زندگی محفوظ نہیں ہے۔ وہ بے چارے اور جب چاہے جلا کر ہڈیاں بنا دے گا۔

لوگوں کے لیوں کی مسکراہٹیں ختم ہو گئیں۔ اداسیاں افسردگیاں نمایاں نظر آنے لگیں۔ موت سروں پر سوار دکھائی دینے لگی۔ جاگیردار واپس بھاگنے کے پروگرام بنانے لگا تو نمبردار نے اسے روک لیا کہ آدمی شہر گئے ہوئے ہیں شام تک رکوتا کہ اس مجھے کا حل سامنے آ سکے۔ جاگیردار کو مجبوراً رکنا پڑا۔ شام ہونے تک شہر گئے ہوئے ملازم ایک خستہ حال بوڑھے کو کندھوں پر اٹھائے گاؤں آگئے اور دونوں بڑوں کے سامنے رکھ دیا۔ جاگیردار اس سے قبل کچھ بولتا کہ نمبردار بولا۔

”سنا ہے تمہارے پاس بہت علم ہے بڑی بڑی بلائیں تمہارے قبضہ میں ہیں بہت طاقتیں ہیں جو چاہو کر سکتے ہو۔“

”ہاں ٹھیک سنا ہے تم نے۔“

جب انہوں نے مجسمہ کے متعلق کہا تو بابے کی آنکھیں انگارے اگلنے لگیں۔ اس کے مرید کے ساتھ برتا گیا گاؤں والوں کا سلوک نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ تب وہ بولا۔

”میں مجھے پر قابو تو پاسکتا ہوں لیکن کبھی قابو نہ پاؤں گا۔“

بابے کی زبان سے انکار کا لفظ سن کر جاگیردار گرجا۔ ”کیوں قابو نہیں پاؤ گے؟“

”یہاں میرا چیلہ آیا تھا وہ مجسمہ کی آنکھوں کی چمک اپنی آنکھوں میں جذب کرنا چاہتا تھا لیکن تم لوگوں نے اس کے ساتھ درندوں والا سلوک کیا ہے۔ اسے گلیوں میں سے باندھ کر کھینچا ہے۔ درخت کے ساتھ باندھ کر جان سے مار ڈالا ہے۔ اگر تم ایک رات اسے دے دیتے تو شاید تم اس مجسمہ سے ہمیشہ کیلئے چھٹکارا پالیتے۔ میں اب کچھ نہیں کروں گا۔“

نمبردار اور جاگیردار کو اپنی جانوں کی فکر تھی لیکن نمبردار اپنا وقار بلند کرتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو بابا سائیں یہ جو گاؤں والے ہیں ناں سب ہمارے اپنے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ ان میں کسی ایک کی بھی مجسمے کے ہاتھوں موت ہو۔ ہم کسی کو بھی جلتے پکھلتے نہیں دیکھ سکتے۔“

گاؤں والے جاگیردار کی زبان سے اپنی حفاظت کی باتیں سن کر جاگیردار اور نمبردار کی تعریفیں کرنے لگے کہ انہیں گاؤں والوں کی کتنی فکر ہے لیکن سائیں بابا کسی بھی صورت ماننے کو تیار نہ ہوا۔

دکھائی نہیں دے رہا۔ تم نے تو میرے جسم کو جلا دیا۔ ایسے لگتا ہے کہ مجسمے کے ہاتھوں پکھلنے والا سب سے پہلا انسان میں ہی ہوں گا۔ میری ہڈیوں کو ہی لوگ قبر میں دبائیں گے۔ یار میں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے زندہ رہنا ہے۔ ابھی میں نے دیکھا ہی کیا ہے۔ بلاؤ کسی عامل کو جو اس مجسمے کو جکڑ کر جلا سکے۔“

ہاں یاد آیا۔ ملنگ بابا نے اپنے گرد کا نام لیا تھا کہ اس نے مجھے چوہوں اور بلیوں کا خون مجسمے پر اٹھیلنے کو کہا تھا۔ اس نے ہی مجھے آخری رات لاش مجسمے کے سامنے رکھنے کو کہا تھا۔ گرد کا لفظ زبان پر آتے ہی دونوں کی آنکھیں چمک پڑیں اور فوری طور پر نمبردار نے اپنے ملازم کو پکارا اور کہا کہ فلاں شہر کے فلاں کو نے میں ایک شخص لنگوٹی پہنے بال بکھیرے جن بھوت بنا ہوا نظر آئے گا اسے اٹھا لاؤ۔ میں رات ہونے سے پہلے ہی اس مجسمے کو ختم ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتنی باتیں کہنے کے بعد دونوں دوست گاؤں سے باہر نکل آئے اور ملازم پیچھے پیچھے۔

جس طرف دونوں جاتے گردیں جھک جاتیں۔ چلتے لوگ رک جاتے باتیں کرتے شخص خاموش ہو جاتے۔ یہ دونوں دور قبرستان کی جانب نکل آئے۔ ابھی قبرستان سے کچھ ہی دور تھے کہ انہیں قبرستان کی زمین پھٹتی محسوس ہوئی۔ یہ منظر دیکھتے ہی دونوں پاگلوں کی طرح واپس گاؤں بھاگے۔ ادھر غائب شدہ مجسمہ زمین پھاڑتے ہوئے دوبارہ نمودار ہو چکا تھا۔ سبھی نے دیکھا کہ مجسمہ حرکت نہیں کر سکتا تھا اسی طرح اس کے ہاتھ میں چھری تھی وہی انداز تھا اسی طرح جسم پر چوہوں بلیوں کا بدبودار خون تھا وہی چہرہ تھا۔ مجسمے کے دوبارہ ظاہر ہوتے ہی ہر طرف انفراتفری پھیل گئی۔ جادو کا اثر ویسے کا ویسے موجود تھا۔ سحر ٹوٹا نہ تھا۔ نجانے کتنے عرصہ کیلئے اسے جکڑا گیا تھا؟ کتنے عرصہ کیلئے وہ ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتا تھا؟ کب تک آنکھوں کی چمک سے گاؤں والوں کو جلا سکتا تھا؟ یہ کسی کو علم نہ تھا۔ گاؤں پہنچ کر جاگیردار نے دل میں سکھ کا سانس لیا کہ اچھا ہوا کہ یہ ساکت کا ساکت رہا۔ یہاں تک ہی محدود ہے ورنہ اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ اس کے گاؤں تک نہ پہنچ جائے۔

ادھر نمبردار کہہ رہا تھا جاگیردار اس کو ختم کرنے کا حل سوچو۔ دیکھ نہیں رہے ہو اس کی آنکھوں کی چمک کس قدر مزید بڑھ گئی ہے۔ ہر طرف آگ پھیلتی دکھائی دے رہی ہے۔ ابھی یہ لفظ اس کی زبان پر تھے کہ جس درخت کے نیچے وہ کھڑے تھے وہ درخت جلنے لگا۔ یکدم قریب سے بھڑکتی آگ کو دیکھ کر دونوں بڑوں کو حفاظت میں لینے والا مجمع اپنی جانیں بچاتے ہوئے دونوں کو تنہا چھوڑ کر بھاگ نکلا اور یہ دونوں بھی کمزور انسانوں کی طرح بھاگنے لگے۔ شاید مجسمے

جاتا رہا اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر منتر پڑھا جاتا رہا۔ بیس دن گزر گئے بابا سائیں کے آنے سے گاؤں میں کسی قسم کا قتل وغیرہ نہ ہوا۔ جاگیردار ہر روز نمبردار کے پاس آ جاتا اور رات کو واپس چلا جاتا۔ مجھے کی آنکھوں کی چمک مانند پڑنے لگی۔ دن گزرتے رہے۔ سائیں بابا منتر پڑھتا رہا۔ مجسمہ صرف ایک مجسمہ رہ گیا۔ آنکھیں ایسی ہو گئی جیسے ان میں حرکت ہی نہ رہی ہو۔ نمبردار جاگیردار اور دوسرے گاؤں والے ایک ماہ کے بعد قبرستان جانے لگے اور جاگیردار غصہ سے ساکت مجھے پر کبھی اینٹیں مارتا، کبھی پتھر اپنے دل کا غبار نکالتا رہتا۔ بابا سائیں کی عزت اس طرح سے ہو رہی تھی جیسے یہ مہمان خاص ہو۔

ایک ماہ کے بعد لوگوں نے بابا سائیں کے منتر کا اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ طاقت والا ہے۔ اس نے وہ کارنامہ سرانجام دے دیا تھا جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ قبرستان میں نہ تو خوف رہا تھا اور نہ ہی دہشت۔ جنات، چڑیلیں سائیں بابے کے آنے سے ایسے غائب ہو گئے تھے جیسے بہت بڑی طاقت قبرستان میں گھس آئی ہو۔ آج اکتالیسواں دن تھا۔ عمل کرنے کی آخری رات۔ مجھے کی زندگی کی آخری رات۔ لوگوں کی پریشانی کی آخری رات۔

صبح سویرے ہی جاگیردار ملازموں کے ساتھ تھے تحائف، پھولوں کے ہار لے کر آ گیا۔ گاؤں والے بابا سائیں کو کندھے پر اٹھائے جشن منا رہے تھے۔ اتنے میں انہیں ایک خوشی کی خبر اور مل گئی کہ ساتھ والے گاؤں میں ایک بزرگ مر گیا ہے۔ یہ پہلا دن تھا کہ گاؤں والوں نے کسی کے مرنے پر کلکھلا کر قہقہے لگائے، جشن منائے۔ پورا دن جشن مناتے گزر گیا۔ ملازموں نے ڈیرے پر ہی دس کتوں اور دس بلیوں کو ہلاک کیا۔ ان کے جسم کا تمام خون نچوڑ کر مخصوص برتن میں جمع کیا اور عصر کے وقت ہی ایک میلے کی صورت میں قبرستان چلے گئے۔ دوسرے گاؤں والوں کو نمبردار کا پیغام بھیج دیا گیا کہ مرنے والے کو دفن نہ کیا جائے۔ اس کی لاش یہاں ڈیرے پر لائی جائے تاکہ بزرگ کی لاش سامنے رکھ کر اپنا عمل مکمل کر سکیں۔

ایسا ہی ہوا۔ نمبردار کا حکم تھا نا چاہتے ہوئے بھی ان کا حکم ماننا پڑا۔ دونوں بڑوں نے پہلے تو جا کر مجھے کے سر پر پتھر اور جوتے مارے اور پھر گاؤں والوں سے کہا کہ اسے جوتے مارو پتھر مارو کیونکہ صبح تک یہ جل کر راکھ ہو جائے گا۔ سبھی نے ایسا ہی کیا۔

نمبردار اور جاگیردار کے بیٹوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنا نفل طیش دکھایا۔ کوئی کہتا کہ میں اس کا گلا دبا دیتا ہوں، کوئی کہتا کہ میں اس کی ٹانگیں کاٹ دیتا ہوں اور کوئی کچھ۔ ادھر مجھے کی بیٹائی اس قدر ماند پڑ چکی تھی کہ ایک عام انسان کی طرح دیکھ سکتا تھا۔

تب نمبردار نے اسے دھکی دی۔ ”اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہیں بھی اس ملک کی طرح گلیوں میں گھسیٹا جائے گا۔ تمہیں بھی درخت کے ساتھ باندھ کر پتھروں سے مارا جائے گا۔“

”مجھے تو کوئی پرواہ نہیں ہے۔“ سائیں بابا گر جا۔ ”تم جو جی چاہے کر لو لیکن میں یہ کام نہیں کروں گا۔ مجسمہ پر گرفت حاصل نہیں کروں گا۔“

جب کسی طرح بابا ان کی باتوں اور دھمکیوں میں نہ آیا تو سبھی لوگ پریشان ہو گئے کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ یہ بابا ہی اس مجسمے کے سر کو توڑ سکتا ہے اور جب بھی اس کا سر ٹوٹے گا کلبازیوں کے وار کر کے اس کو ہمیشہ کیلئے قید بنا دیں گے۔ ہڈیوں کو آگ لگا دیں گے اور اس مجسمے کی موت پر جشن منائیں گے۔

تب نمبردار گاؤں والوں سے بولا تم سب کی زندگیوں کا مسئلہ ہے اس بزرگ صاحب کے پاؤں پکڑ لو۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگو۔ اس کی خوب عزت افزائی کرو جو کہتا ہے وہ کرو۔

وہاں کھڑے تمام لوگ بابے کے سامنے ہاتھ باندھے پاؤں گر پڑے۔ نجانے اسے کیسے ان لوگوں پر ترس آ گیا تب وہ بولا۔ ”صرف اکتالیس دن چاہئیں مجھے اور اکتالیس دیں دن مجھے ایک مردہ لاش چاہئے۔“

”ہاں ہاں لاش مل جائے گی۔“ تمام گاؤں والے ایک ساتھ بولے۔

تب سائیں بابا بولا۔ ”مجھے ہر روز دس کتوں اور دس بلیوں کا خون چاہئے۔“

”مل جائے گا۔“ گاؤں والے ایک ساتھ بولے۔

میں ایسا منتر پڑھنا چاہتا ہوں، ایسا عمل کرنا چاہتا ہوں کہ اکتالیس دن اس مجسمے کو سب اپنی آنکھوں کے سامنے آگ میں ترپتے دیکھو گے۔“

ملنگ بابا جو کام چوری چھپے کیا کرتا تھا وہی کام بلکہ اس سے بدتر کام گاؤں والے مل کر کرنے لگے۔ رات ہوئی تو ایک بڑے سے برتن میں دس کتوں بلیوں کا خون جمع کر کے بابا سائیں کے سامنے رکھ دیا گیا اور وہ اسے اٹھائے مجھے سے ڈرے بغیر منتر پڑھتے ہوئے قبرستان کی جانب بڑھنے لگا اور جاتے ہی تمام خون سر سے پاؤں تک اس مجسمے پر پھینک دیا پھر خود اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑے ہو کر منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ رات بھر قبرستان میں رہا صبح واپس گاؤں آ گیا۔ اب ہر روز ایسا ہی ہوتا رہا۔ کتے بلیاں قتل ہوتے رہے۔ خون سے مجسمے کو نہلایا

باہر کھلے میدان میں درخت کے نیچے سائیں بابا کی لاش پڑی دیکھ کر تڑپ کر رہ گئے۔ لاش کا گاؤں آنا لوگوں کو خوفزدہ کر گیا۔ جو بھی لاش دیکھتا دل پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا۔ لاش کے منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ پورا جسم نیلا ہو چکا تھا۔ ایسے جیسے کوئی زہریلی چیز اس نے نگل لی ہو۔ اگر مجسمہ کی وجہ سے مرنا تو یقیناً اس کے جسم کی تمام کھال پانی کی طرح بہہ چکی ہوتی لیکن یہ کام مجسمہ کا نہ تھا کسی زہریلی چیز کے کاٹنے سے مرا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر لوگ خوفزدہ ہو رہے تھے۔ انہیں اپنی موت بھی دکھائی دے رہی تھی۔

اسے غسل دے کر کفن پہنا دیا گیا لیکن ملنگ بابا کی طرح اس کے گرد بھی لپٹا کفن آگ میں بھڑک اٹھا، جلنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر لوگ اور زیادہ خوفزدہ ہو گئے۔ دوسرا کفن پہنایا گیا۔ وہ بھی جل گیا۔ تیسرا پہنایا گیا جب وہ بھی جل گیا تو ملنگ بابا کی طرح دلوں میں خوف لئے اس کی لاش اٹھائے دوسرے قبرستان میں چلے گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مجسمے والے قبرستان میں جانوں کو خطرہ ہے۔ یہاں کم از کم سکون سے اسے زمین میں تو دبائیں گے۔

نمبردار بھی بابا سائیں کی میت کے ساتھ قبرستان میں گیا۔ اس بابا کی وجہ سے گاؤں کا مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ اگر سیاہ ناگ اسے کاٹ نہ کھاتا۔ قبر میں اتارتے اتارتے ان کی نظر قبرستان کے ایک کونے میں اس مجسمے پر پڑی جو ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی شور برپا ہو گیا۔ لوگ قبروں پر گرتے پڑتے بھاگنے لگے لیکن نمبردار مجسمہ کی چمکتی آنکھوں کا شکار ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنے ہوش کھو بیٹھا اور مدہوشی کے عالم میں آنکھیں پھاڑے مجسمے کی طرف بڑھنے لگا۔ بڑھتے بڑھتے بالکل اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مجسمہ غائب ہو گیا لیکن نمبردار اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ نہ بولتا نہ چیختا اور نہ ہی تڑپتا تھا۔ لوگ حیران و پریشان تھے کہ نمبردار کیوں کھڑا ہے؟ کیوں واپس نہیں آ رہا ہے۔ سب اس کے ارد گرد جمع ہونے لگے لیکن ہاتھ لگانے سے ڈرتے تھے۔ ادھر نمبردار کا جسم پکھلتے ہوئے زمین پر گرنے لگا۔ ہڈیاں ایک ایک کر کے نمایاں نظر آنے لگیں۔ دونوں ٹانگیں پکھل کر ایسے ہو گئیں جیسے ان پر کھال تھی ہی نہیں۔ باقی کا جسم بھی پکھلتے پکھلتے زمین دوز ہو رہا تھا۔ جب بالکل ڈھانچہ بن گیا تو دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ لوگوں کے جھوم میں ہی اس نے اپنی جان دے دی۔ ایک کہرام برپا ہو گیا۔ اسے اس کے کئے کی سزا مل گئی۔ نمبردار کی موت کی خبر گاؤں کے علاوہ آس پاس کے گاؤں میں بھی پہنچ گئی۔

بابا سائیں نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ اس کی آنکھوں کو ہاتھ نہ لگایا جائے ورنہ میرا تمام عمل ضائع ہو جائے گا۔ اگر بابا سائیں ایسا نہ کہتا تو ہو سکتا تھا کہ جاگیردار اور نمبردار کے بھرے بیٹے مجسمے کی آنکھوں کا قیہ بنا ڈالتے۔ شام ہوئی تو بابا سائیں نے سبھی کو واپس لوٹ جانے کو کہا۔ سبھی لوگ خوشیاں مناتے مسکراہٹیں بکھیرتے واپس چلے آئے۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ دوسرے گاؤں والے مرنے والے کی لاش لے آئے۔ اندھیرا پھیل گیا۔ لاش مجسمے کے سامنے پڑی تھی اور بابا سائیں مجسمے کو کتوں بلیوں کے خون سے نہلانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ اس چیخ کے ساتھ ہی بابا سائیں تڑپنے لگا۔ بابا سائیں کو بھی اسی سیاہ ناگ نے کاٹ لیا تھا جس نے پہلے جادوگر کو کاٹا تھا۔ ابھی منہ سے جھاگ شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک فقرہ بابا سائیں کے منہ سے نکلا جو اس نے مجسمہ کو کہا جا بیٹا میں اپنا سارا علم اور سارا عمل تجھے دیتا ہوں اتنا کہنے کی دیر تھی کہ مجسمہ کی مرجھائی آنکھوں میں پھر سے چمک پیدا ہو گئی۔ ماند شدہ آنکھیں ایسے چمکنے لگی کہ جیسے ان کی تاب نہ لاتے ہوئے گاؤں کے گاؤں جل جائیں گے۔

بابا سائیں زمین پر پڑا تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے مرتے ہی قبرستان بھیاںک چیخوں سے گونجنے لگا۔ جنات اور چڑیلیں مجسمے کے ارد گرد گھومنے لگیں۔ گاؤں میں خوشیاں منانے والے لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ ان کے چہروں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹیں مایوسیوں میں بدل گئیں۔ چہروں کی رنگت پھر سے اڑ گئی۔

بابا سائیں کی چیخ نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر کر رکھ دیا تھا۔ ایک چیخ سے ہی وہ سمجھ گئے تھے کہ سائیں بابا مجسمے کے ہاتھوں مر گیا۔ جاگیردار اپنے بیٹوں اور ملازموں کے ساتھ واپس گاؤں کی طرف گھوڑوں پر سوار ہو کر بھاگ نکلے۔ نمبردار دروازے بند کر کے خوفزدہ منہ لیے درود یوار کو دیکھنے لگا۔ ہر کسی کو سروں پر موت سوار ہوتی دکھائی دی۔ کوئی کہاں تھا کسی کو خبر نہ تھی۔ ادھر مجسمہ حرکت میں آ گیا۔ تمام تر نبی طاقتیں اس کے جسم میں شامل ہو چکی تھیں۔

آنکھوں کی چمک اس قدر بڑھ چکی تھی کہ جسے بھی گھور کر دیکھتا وہ سیدھا قبر میں چلا جاتا۔ قبرستان کا بھیاںک منظر دیکھ کر چھتوں پر بیٹھے لیٹے لوگ خوفزدہ ہو کر کانپ رہے تھے قیامت سروں پر سوار تھی۔ پورا گاؤں جانتا تھا کہ ان سب نے مجسمے کے سر پر جو تے مارے ہیں پتھر مارے ہیں اور وہ ان سے اس حرکت کا ضرور انتقام لے گا، ضرور انہیں موت کی نیند سلا دے گا۔ مجسمہ ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ صبح ہو گئی لوگ ڈرتے ہوئے گھروں سے باہر نکلے۔

باپ کو دفن کر کے آئے ہیں۔ کہتے ہیں ناں کہ رسی جل گئی لیکن بل نہ گئے یہی بات ان سب کی تھی۔ موت کو سروں پر پا کر بھی موت کو لکار رہے تھے۔ باپ کی موت سے عبرت پکڑنے کے بجائے کہہ رہے تھے کہ لوگوں کو تنگ کرنا ہمارے مشغلے ہیں۔

رات باتوں میں ہی گزر گئی۔ صبح ہوئی تو نمبردار کے جسم کی تمام ہڈیاں ان کے ڈیرے پر بکھری تھیں جنہیں دیکھ کر سبھی چیخ پڑے۔ کس نے قبر کھودی ہے ہمارے باپ کی کس نے بے حرمتی کی ہے ان کے ڈھانچے کی؟ کس نے نکالی ہیں ان کے جسم کی ہڈیاں؟ وہ چیخ رہے تھے لیکن تمام لوگ خوفزدہ تھے۔ وہ جان گئے تھے کہ مجھے نے جس طرح اس کی لاش کو جلایا تھا، پگھلایا تھا اسی طرح نمبردار کی ہڈیاں بھی قبر سے نکال لایا ہے۔

جاگیردار ہڈیاں دیکھ کر کانپ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑکتے ہوئے جسم سے باہر آنے کو چل رہا تھا۔ زبان سے بولا نہ جا رہا تھا۔ بیٹوں نے ہڈیاں اٹھائیں اور قبرستان کی جانب چل پڑے لیکن نمبردار کی قبر کے قریب کھڑی حسینہ کو دیکھ کر چونک گئے۔ اب یہ بات سمجھنے میں مشکل پیش نہ آئی کہ یہ تمام اسی نے ہی کیا ہے۔ جوان لڑکوں کے اترے ہوئے چہرے اڑے ہوئے رنگ دیکھ کر جاگیردار بولا۔

”ہو گئی نا تم لوگوں کے مضبوط جسموں سے قوت ختم۔ دیکھ لیا ہے ناں سامنے موت کو کیوں رک گئے ہیں تمہارے قدم آگے بڑھو۔“

”نہیں چچا نہیں تم غلط سمجھے ہو ہمیں اس سے ڈر خوف نہیں آرہا ہے صرف دیکھ رہے ہیں کہ اس میں اتنی ہمت کیسے آ گئی کہ ہمارے باپ کی قبر کھود ڈالی ہے۔ حسینہ کھڑی کھڑی غائب ہو گئی۔“

باتوں باتوں میں ان لوگوں میں ایک بزرگ آدمی بولا۔ ”صاحب جی مجسمہ طاقت سے زیر نہیں ہو سکتا علم سے زیر ہو سکتا ہے۔ دیکھا نہیں ہے سائیں بابا کے عمل نے اس کے آنکھوں کی بینائی ختم کر ڈالی تھی۔ اگر کوئی اور علم والا مل جائے تو آپ اس مجسمے کی ہڈیاں بھی توڑ سکتے ہیں اور چہرہ بھی چولہے میں جلا سکتے ہیں۔“

یہ سن کر سب چونک گئے۔ بزرگ نے یہ بات سو فیصد سچ کہی تھی۔ واقعی ایسا ہی ہو سکتا تھا ورنہ ایک ایک کر کے پورے گاؤں کے لوگ جل سکتے تھے، پگھل سکتے تھے۔ لہذا ہڈیوں کو دوبارہ قبر میں رکھنے کے بعد جاگیردار نے اعلان کر دیا کہ جو کوئی بھی مجسمے کو ختم کرے گا آدھے گاؤں کا اسے مالک بنا دیا جائے گا۔ یہ ایک ایسا لالچ تھا کہ ہر کسی کے قدم حرکت میں

جاگیردار اپنے دوست نمبردار کی مجسمے کے ہاتھوں موت کا سن کر لرز کر رہ گیا۔ یہ نمبردار کی موت نہ تھی اس کی اپنی موت تھی۔ اسے بھی محسوس ہونے لگا کہ جیسے موت نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہو۔ بمشکل نمبردار کے گاؤں گیا۔ اس کی حفاظت کیلئے چاروں طرف آدمی تھے کہ مجسمے کی آنکھوں کا نشانہ نہ بن سکے۔ وہاں نمبردار کی ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا دیکھ کر تڑپ کر رہ گیا۔ بالآخر شام تک اسے بھی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

جاگیردار نے نمبردار کے لڑکوں کو سمجھایا کہ یہ سب کچھ تم لوگوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اگر تم اس مجسمے کی بہنوں کو قتل نہ کرتے تو شاید تمہارا باپ آج اتری کھال کے ساتھ دفن نہ ہوتا۔

نمبردار کے چاروں جوان لڑکے جن کا مشغلہ ہی یہی تھا لڑکیوں کو تنگ کرنا اپنی من مانی کرنا، مارنا پیٹنا۔ بولے ہمارا ابا ڈرپوک تھا، اسی لئے تو مارا گیا۔ مجسمہ ہمیں کیوں نہیں مارتا ہماری کھالیں کیوں نہیں پگھلاتا۔ ہمارے جسموں کی ہڈیوں کا ڈھانچہ کیوں نہیں بناتا اور چاچا جاگیردار تم بھی ڈرپوک ہو موت سے خوفزدہ ہو۔ تمہاری آنکھیں تمہاری بگڑی شکل بتاتی ہے کہ تم بھی موت سے گھبرا رہے ہو۔ مرنے سے ڈرتے ہو۔ خود کو بچانے کیلئے چھپتے پھرتے ہو۔ موت کا سامنا نہیں کر سکتے ہو۔ یہ بات جاگیردار کے بیٹوں نے بھی سن رہے تھے جنہوں نے نمبردار کے بیٹوں کی حمایت کی تھی۔

ایک بیٹا بولا۔ ”دوست تم ٹھیک کہتے ہو کہ یہ ہمارا باپ ہے لیکن صرف نام کا جاگیرداری والا۔ اس میں کمال نہیں ہے اگر زندہ ہے تو صرف ملازموں کی وجہ سے کہ وہ اسے بچالیں گے۔“

یہ ایسی باتیں تھیں جنہوں نے جاگیردار کے دل کو چھلنی چھلنی کر دیا۔ واقعی اس کے اندر مضبوط دل نہ تھا ورنہ عام لوگوں کی طرح خوفزدہ ہو کر ڈرتا نہ پھرتا۔ قییموں کی طرح سہا سہا نہ رہتا۔ تب جاگیردار چلایا۔

”تم جوان ہو، تمہارے اندر گرم خون جوش مارتا پھر رہا ہے لیکن یہ بات دل میں بٹھا لو کہ مجسمے کے سامنے تم سب چوہے ہو گیدڑ ہو۔ وہ تم سب کو ایک ایک کر کے جلا کر رکھ دے گا۔ تمہارے اندر کا گرم خون ٹھنڈا کر دے گا۔ تم جن جسموں کو مضبوط کہتے ہو ناں وہ انہیں پگھلا کر رکھ دے گا۔ تمہاری مضبوط ہڈیوں کو چورا چورا کر دے گا۔“

جاگیردار کی بہکی بہکی باتیں سن کر سبھی ہنس پڑے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اپنے

سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔ رات بھر لوگ خوفزدہ اور ڈرے ڈرے ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مصروف رہے۔ لوگوں کی آوازیں جیسے دب گئی تھیں جیسے ان کے جسموں سے رو جس کھینچ لی گئی تھیں۔ ہر کوئی مردہ حالت میں گھومتا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے کا نام سنتے ہی جسموں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ سبھی لوگ اس مجھے کی لپیٹ میں تھے۔ سبھی لوگوں کو اپنے کارناموں کا علم تھا۔ صبح ہو گئی، رونا دھونا جاری تھا۔ پورا دن گزر گیا اور شام سے قبل ہی جاگیردار کو بھی قبرستان لے جا کر دفن کر دیا گیا۔ جاگیردار کی موت اور دیوار کے ٹوٹنے کا لوگوں نے بہت گہرا اثر لیا کیونکہ ان کا دروازوں کو کنڈیاں لگانا سب فضول تھا۔ کسی وقت کسی لمحے میں وہ مجسمہ جہاں دل چاہتا نمودار ہو سکتا تھا۔ جسے چاہتا اپنا شکار بنا سکتا تھا۔

دوسرے ہی دن آدھے سے زیادہ گاؤں خالی ہو گیا۔ لوگ اپنی جانیں بچانے کی غرض سے بیوی بچوں کو ساتھ لیے دور دراز علاقوں میں جانے لگے۔ لیکن جاگیردار اور نمبردار کے بیٹے اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔ ان کی دوستیاں قائم رہیں بلکہ دوستیاں رشتہ داری میں بدل گئیں۔ جاگیردار کے بیٹوں نے اپنی دونوں بہنیں اپنے کنوارے دوستوں سے بیاہ دیں اور ان کی دونوں بہنوں کو بیاہ کر اپنے گھر لے آئے۔ ادھر مجسمہ کبھی قبرستان میں دکھائی دیتا، کبھی ویرانوں میں، کبھی گاؤں کے ارد گرد۔

جاگیردار کے بیٹوں نے اپنے باپ کی موت کا گہرا اثر لیا۔ ان کے چہرے غصہ سے لال پیلے ہو رہے تھے۔ مجسمے کو ختم کرنے کے مختلف پلان بناتے رہے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ان کے دلوں میں بھی ایک خوف بیٹھ گیا تھا۔ حویلی کی ٹوٹی دیوار سے اندازہ کر لیا تھا کہ کسی کی بھی زندگی محفوظ نہیں ہے۔ ایک رات ڈیرے پر بیٹھے مجسمے سے متعلق باتیں کرنے کے بعد جب حویلی واپس آئے تو بڑے بھائی نے جونہی اپنے کمرے کا رخ کیا تو سامنے کھڑی اپنی بیوی کے جسم کو پگھلتا دیکھ کر چیخ مار کر نیچے زمین پر گر پڑا۔ اب جو بھی اس کمرے میں کھڑی جوان لڑکی کو دیکھتا تو تڑپ جاتا۔

حویلی والوں نے اس کمرے کو بند کر دیا کہ کوئی غیر مردان کی عزت کے اترتے ہوئے ماس کو پگھلتے ہوئے جسم کو نہ دیکھ سکے۔

اندروہ پگھل رہی تھی باہر رونا دھونا تھا۔ جلد ہی نمبردار کے گاؤں یہ خبر پہنچ گئی کہ ان کی بہن مجسمے کی آنکھوں کا نشانہ بن گئی ہے۔ وہ اپنی گاڑی پر سوار ہو کر حویلی پہنچے تو سامنے چارپائی پر پڑا ہوا بہن کا ڈھانچہ دیکھ کر تڑپ گئے۔ سخت پتھر آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

آنے لگے۔ ہر کوئی تصورات میں خود کو آدھے گاؤں کا مالک تصور کرنے لگا تھا۔ رات ہونے سے قبل ہی آدھے سے زیادہ گاؤں مردوں سے خالی ہو گیا۔ ہر کوئی جادوگر کی تلاش میں شہروں میں بھٹکنے لگا۔ اب ہر روز یہاں بابے آتے، ملگ آتے، کالے علم والے آتے لیکن تمام کہانی سن کر اور ایک نظر مجسمے کو دیکھ کر بھاگ جاتے کہ یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ لوگ خوفزدہ تو تھے لیکن دلوں میں لالچ تھا۔ موت کو قریب پا کر بھی گاؤں کے ٹھیکیدار بننا چاہتے تھے۔ دن گزرتے رہے۔

ایک رات جاگیردار اپنی حویلی کے بڑے کمرے میں لیٹا ہوا مجسمے کے خاتمے سے متعلق ہی سوچ رہا تھا کہ یکدم اس کے کمرے کی دیوار پھٹی اور مجسمہ اس کے سامنے نمودار ہو گیا۔ یکدم مجسمے کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر جاگیردار کانپ کر رہ گیا لیکن نہ تو اس سے چپا گیا اور نہ ہی بولا گیا۔ زبان کو دہشت سے ہی قفل لگ گیا۔ مجسمے کی آنکھوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسے مدہوش کر دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے بستر سے اٹھا اور مجسمے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ دوسری طرف دیوار کے گرنے کی آواز سنتے ہی ملازم جاگیردار کے کمرے کی طرف بھاگے تو مجسمہ غائب ہو گیا لیکن جاگیردار نمبردار کی طرح اس حالت میں کھڑا تھا جیسے اس کے آنکھوں کے سامنے بہت بڑی بلا کھڑی ہو۔ نہ آنکھ جھپکتا، نہ سر ہلاتا، نہ جسم کو حرکت دیتا۔ صرف مجسمے کی مانند کھڑا تھا۔ شاید مجسمے کی دہشت نے ہی اس کی جان کھینچ لی تھی۔

ملازم اور بیٹے باپ کو ایسی حالت میں دیکھ کر تڑپ کر رہ گئے۔ جاگیردار ساکت ساکت کھڑا رہا اور سبھی اسے آوازیں دے رہے تھے۔ پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے؟ کیوں خوفزدہ ہو؟ لیکن جاگیردار کسی کی بات کا جواب دیے بغیر کھڑے کا کھڑا رہا۔ جب بیٹوں، ملازموں، بیوی اور دونوں جوان بیٹیوں نے باپ کے جسم کی کھال زمین پر گر گئی دیکھی تو چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ رونا دھونا شروع ہو گیا۔ کھرام مچ گیا۔ کسی میں ہمت نہ ہو پا رہی تھی کہ وہ جاگیردار کے جسم کو چھوتا۔ جسم کی کھال پگھل پگھل کر مسلسل زمین پر گر رہی تھی۔ ٹانگیں ہڈیاں بن گئیں بازو ہڈیاں بن گئے اور جب جسم اور چہرہ سے ماس اترا تو ایک بھیانک صورت سامنے آ گئی۔

ڈھانچہ بننے ہی جاگیردار دھڑم سے زمین پر گرا۔ نہ چیخ بلند ہوئی نہ تڑپ پیدا ہوئی۔ نہ کوئی گونج اٹھی۔ مجسمے کے آنکھوں کی کشش اس قدر دہشت ناک تھی کہ سامنا کرتے ہی جان حلق تک آ گئی تھی۔

تیز گاڑی بھگاتا ہوا گاؤں تک آیا اور حویلی کے ایک طرف گاڑی کھڑی کر دی۔ بیگم کی وہی آنکھیں تھیں، وہی ڈری ڈری صورت تھی، اترا ہوا چہرہ تھا۔ جب اسے غور سے دیکھا تو ایک چیخ حلق سے پار ہو گئی کیونکہ وہ صرف ڈری ڈری نہ تھی بلکہ اس کی دونوں ٹانگیں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھیں۔ جسم کی کھال پگھل پگھل کر گاڑی میں جم رہی تھی۔ شاید جہاں گاڑی پکچر ہوئی تھی وہیں مجسمہ نمودار ہوا تھا اور مراد کی بیوی کو اپنی آنکھوں کا نشانہ بنا گیا تھا۔

حالانکہ گھر سے تو وہ ہنسی خوشی نکلی تھی۔ سبھی حویلی والے اسے پکارنے لگے، آوازیں دینے لگے لیکن وہ جہاں تھی، جیسے تھی آنکھیں کھولے بیٹھی رہی۔ جب آگ کی تپش حلق تک آئی تو اس کے منہ سے لمبے لمبے سانس نکلے اور ساتھ ہی وہ گاڑی سے نیچے زمین پر گر پڑی۔ ایک کہرام تھا جو حویلی میں برپا تھا۔ ایک قیامت تھی جو یہاں بیت چکی تھی۔ ہر طرف رونا دھونا اور چیخ و پکار تھی۔ پوری رات ایسے ہی گزر گئی۔ دوسرے دن اسے بھی قبرستان میں اتار دیا گیا۔ ہر کسی کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ صرف ملنگ بابا کو مارنے کی اتنی بھیاں کم سرائی تھی۔ اگر اسے ایک رات کی زندگی دے دیتے تو شاید گاؤں والے مجسمے کے ہاتھوں نہ پکھلتے، نہ ڈھانچے بنتے۔ ابھی لوگ وہیں قبرستان میں کھڑے تھے اور دن بھی ڈوب رہا تھا ایک بزرگ نے قبرستان میں آ کر ڈیرہ لگا لیا۔

بزرگ کو قبرستان میں داخل ہوتے ہی تمام گاؤں والوں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ان کے خوف زدہ، مرجھائے ہوئے چہروں پر کچھ کچھ رونق آ گئی۔ سبھی بزرگ کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ایک اجنبی بزرگ کے ہاتھوں کو چومنے لگے۔ قدموں کو پکڑنے لگے۔ چند دن گزر گئے۔ لوگ ان کے ہاتھ پاؤں دباتے رہے اور بزرگ کو گاؤں میں مجسمے سے متعلق آگاہ کر دیا۔ لوگوں کے چلتے جسموں کے متعلق آگاہ کر دیا اور رو کر فریاد کی کہ ان کے متعلق کچھ سوچیں ورنہ گاؤں خالی ہو جائیں گے۔ عورتیں اکیلی رہ جائیں گی۔ عورتیں بیوہ ہو جائیں گی، بچے یتیم ہو جائیں گے۔

بزرگ نے لوگوں کی کہانی سن کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا میں تمام کہانی جانتا ہوں۔ گاؤں میں ہر روز قتل ہونے کے متعلق جانتا ہوں، پگھلے چلتے لوگوں کی کہانی مجھے تک پہنچ چکی ہے۔ تبھی تو یہاں چلا آیا ہوں۔ اب مجسمے کی طرف سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں ابھی اسے باندھ دیتا ہوں۔ اتنا کہہ کر بزرگ نے ایک نظر آسمان کی طرف اٹھائی اور پھر آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگے تو اسی قبرستان میں اسے ایک جگہ زمین پھٹی دکھائی دینے لگی۔ پھٹتی ہوئی

اپنے گھر لگی آگ کی تپش محسوس کرنے لگے۔ رونے دھونے میں وقت گزر گیا۔ رات کو اسے قبرستان میں جا کر دفن کر دیا گیا۔

یہ پہلی موت تھی جو کسی عورت کی ہوئی تھی ورنہ اس سے قبل کوئی عورت مجسمے کی آنکھوں کا نشانہ نہ بنی تھی۔ بھائیوں کی غیرت جاگ اٹھی۔ جاگیرداروں کی غیرت جوش میں آ گئی اور قبرستان میں چیخ چیخ کر کہنے لگے۔ آج کے بعد گاؤں کی ہر لڑکی کو بہن اور ہر عورت کو ماں کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ سب کی عزتیں ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ زاہد کی بہنوں سے کیا گیا سلوک واپس نہیں آ سکتا تھا۔ ابھی بھائی بہن کو دفن کرنے کے بعد واپس گاؤں جانے ہی والے تھے کہ دوسری بہن ہاتھ باندھے کھڑی ہو گئی کہ مجھے یہاں سے لے چلو۔ میری بہن مر گئی ہے اب میری باری ہے۔ اب مجسمہ مجھے اپنا شکار بنائے گا لیکن بھائی اسے تسلیاں دینے لگے کہ صبر کرو اس مجسمے کے خاتمہ کے بارے میں سوچ و بچار کر رہے ہیں۔ اس کی چمکتی آنکھوں کو کمزور کرنے کے پلان بنا رہے ہیں۔ بہت جلد کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن بہن کو کب سکون چین ملتا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی بہن کے پکھلتے جسم کو دیکھ لیا تھا۔ اپنے گھر میں ہی موت کو دیکھ لیا تھا۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ وہ اتنی جلد ان سب سے دور ہو جائے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پگھل مرے گی۔

روز روز کے گھٹاؤنے واقعات سے گاؤں والے اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ انہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے گاؤں چھوڑنے کا اعلان کر دیا اور جاگیردار کے بیٹوں کو اپنے جانے سے متعلق آگاہ کیا تو رات کو تمام گاؤں والوں کو جمع کیا گیا کہ اس مسئلے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ نمبردار کے بیٹے کو پیغام بھیج دیا گیا کہ وہ بھی یہاں آ جائے تاکہ مجسمہ کے متعلق کچھ فور کیا جاسکے۔ رات ہوتے ہی نمبردار کا بیٹا مراد بھی اپنی بیگم کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ کر جاگوار کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔

اچانک راستے میں دھماکہ ہوا، گاڑی کا ناز پھٹ گیا۔ ایسے لگا جیسے بہت بڑا دھماکہ ہوا۔ نمبردار مراد گاڑی سے نیچے اترا۔ ناز چمک گیا اور اکیلے ہی گاڑی کا ناز تبدیل کرنے لگا۔ جب ناز تبدیل کر کے دوبارہ گاڑی پر بیٹھا تو بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ ایسے خوفزدہ نظروں سے باہر کے مناظر کو دیکھ رہی تھی جیسے ڈر گئی ہو۔ مراد نے بھی اسے بلانا گوارا نہ کیا اور گاڑی چلا دی تاکہ جلد سے جلد گاؤں پہنچ جائے۔ وہ اپنی بیگم کی یہ ڈری ڈری صورت نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ تیز

بزرگ کی آمد کا نتیجہ تھا کہ گاؤں والے محفوظ رہے تھے ورنہ آئے دن مجسمہ کی آتش نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے گاؤں والوں کے جسم کھلتے رہتے تھے، سلگتے رہے تھے، لوگ انسانی ڈھانچوں کو قبروں میں اتارتے رہتے تھے۔ گاؤں والوں کے موت کے ڈر سے اور مجسمے کے خوف سے رنگ پیلے رہتے تھے، چہرے مرجھائے رہتے تھے، لبوں سے مسکراہٹ چھن گئی تھی۔ روزانہ کی موت سے آنکھوں میں آنسو تیرتے رہتے تھے اور کسی کو بھی اپنی زندگی پر بھروسہ نہ تھا۔ قدم قدم پر مجسمے کے ظاہر ہونے کا خوف اپنی موت سے قبل انہیں قبر میں اتار رہا تھا لیکن جب بابا درویش یہاں آباد ہوئے تھے گاؤں میں خوش حالی آ گئی تھی، مرجھائے چہرے دوبارہ کھل اٹھے تھے۔ ان پر دوبارہ رونق آ گئی تھی، لبوں پر اداسی نہ رہی تھی بلکہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔ گاؤں والے ہر روز صبح شام قبرستان چلے جاتے۔ بابا درویش کے قدم دباتے ان کے اس احسان کا شکریہ ادا کرتے۔ تب ایک دن نواب صاحب اور جاگیردار مراد بابا درویش کے خستہ حال خیمے میں گئے اور اپنی اکڑی گردن جھکاتے ہوئے کہا۔

”باباجی ہم آپ کے ممنون و مشکور ہیں کہ آپ نے گاؤں والوں کو اس مجسمے سے نجات دلوائی لیکن مجھے خدشہ ہے کہ کہیں مجسمہ دریا سے باہر نہ آ جائے اور گاؤں والوں کیلئے ایک مرتبہ پھر انتقام نہ بن جائے۔ ایک مرتبہ پھر لوگ مجسمے کی آتش نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے ترپے لگیں، کھلنے لگیں۔“

ابھی اتنی بات ہی اس کی زبان پر تھی کہ بابا درویش جلال میں آ گئے۔ میں جس گاؤں یا قبرستان میں موجود ہوں خدا تعالیٰ کے فضل سے اس کی رحمت سے کوئی چڑیل، جن، بھوت وغیرہ قدم نہیں رکھ سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس لڑکے کو شیطانی علم کی بدولت جکڑا گیا ہے اور اسے جکڑنے والا اس دنیا میں نہیں ہے، چل بسا ہے۔

باباجی کی زبان سے یہ الفاظ سن کر گاؤں والے اور چھوٹے جاگیردار تجسس میں پڑھ گئے اور بولے۔ ”باباجی آپ درست فرماتے ہیں کہ یہ لڑکا واقعی پہلے ہماری طرح چلا پھرا کرتا تھا۔“

”ہاں..... ہاں..... ہاں سبھی کچھ جانتا ہوں۔ میں نے اس کے ساکت جسم سے ہر بات پڑھ لی ہے۔ اس بچے کے خاندان پر بہت ظلم ڈھایا گیا ہے۔ اس کے گھر والوں کا خون بہایا گیا ہے۔ سب جانتا ہوں کس نے ان کا خون کیا؟ یہ بھی جانتا ہوں وہ کیوں کر اس نوبت تک پہنچا ہے؟

جگہ سے مجسمہ نمودار ہوا اور بابا درویش کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ درویش بابا مسلسل پڑھائی میں مصروف رہے۔ جب اپنا ورد ختم کر لیا تو مجسمے پر پھونک مادی اور لوگوں سے کہا کہ میں نے اس مجسمے کو دوبارہ باندھ دیا ہے۔ اب یہ آپ کو کبھی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ کہہ کر درویش بابا خاموش ہو گئے۔ مجسمے کو اپنی نظروں کے سامنے ساکت، بے حرکت کھڑے دیکھ کر گاؤں والوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے لیکن جب گاؤں والوں کی اموات اور ان کے کھلتے جسم سامنے آئے تو ان کے چہرے غصہ سے لال پیلے ہونے لگے۔ خاص کر جاگیردار کی بیٹی، جاگیردار، نمبردار اور بہو وغیرہ کے کھلتے جسم آنکھوں کے سامنے گھومے تو ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

طیش میں آ کر گاؤں والے اس کھڑے مجسمے پر پتھروں کی بارش کرنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں پتھر مارتے رہے کہ یہ آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ضائع ہو جائیں۔ جاگیردار کے بیٹے نے غصہ سے کہا کہ جا کر چاقو لاؤ میں اس ذلیل کی دونوں آنکھیں نکال دیتا چاہتا ہوں۔ حکم کی فوری تعمیل ہوئی اور چاقو آ گیا۔ جاگیردار کے بیٹے نواب نے اس کی آنکھیں ضائع کرنے کی بہت کوشش کی لیکن نجانے مجسمہ کی آنکھیں پتھر بن گئی تھیں کہ چاقو اس کی آنکھوں کو خراش تک نہ پہنچا سکا۔ غصہ سے ہر کوئی مجسمہ کو کوس رہا تھا۔ تب نواب صاحب نے درویش بابا سے پوچھا کہ باباجی اگر اجازت دیں تو اس ذلیل کو اٹھا کر دور پھینک آئیں۔

باباجی نے آنکھیں بند کیے ہی ہاں میں سر ہلا دیا جیسے کہہ رہے ہوں کہ یہ تمہارا مجرم ہے جو دل میں آئے کرو۔ تب جوان لڑکوں نے اس مجسمے کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ تب گاڑی کا انتظام ہوا۔ گلے میں رسہ ڈالا گیا۔ اس کا ایک سرا گاڑی سے باندھا گیا تو دوسرے سرے کو مجسمے کی گردن میں ڈال کر باندھ دیا گیا اور زور سے کھینچنے کے بعد مجسمہ نیچے زمین پر گرا اور پھر گاڑی اسے گھینٹتے ہوئے دریا کی طرف بڑھنے لگی۔ یہ دریا چھ سات گاؤں گزرنے کے بعد آتا تھا۔ گاؤں والے ایک جلوس کی شکل میں گاڑی کے ساتھ چل رہے تھے۔ سبھی کے چہروں پر رونق تھی، لبوں پر مسکراہٹ تھی، آنکھوں میں خوشی کی لہر تھی۔ دریا کنارے پہنچنے کے بعد اس کے گلے سے رسہ اتارا اور سبھی نے مل کر زور لگانے کے بعد اسے دریا کے پانی کی نذر کر دیا۔ پانی میں گرتے ہی مجسمہ نیچے تہہ میں بیٹھ گیا۔ گاؤں والوں کے منہ سے ایک نعرہ بلند ہوا اور واپس گاؤں کی طرف چل پڑے۔

ایک ماہ گزر گیا گاؤں میں کوئی نہ مرا، نہ ہی مجسمہ دوبارہ دکھائی دیا۔ یہ سب ان

اس کا چلنا پھرنا قبرستان میں ڈیرہ جمانا اچھا نہیں ہے۔
ہاں ٹھیک کہتے ہو جو تم کہہ رہے ہو یہی باتیں میرے دماغ میں گردش کر رہی ہیں۔
چودھری مراد نے کہا۔ آج کی رات بابا درویش کی آخری رات ہوگی۔ آپ تو میری عادت سے واقف ہیں کہ میں اپنے خلاف بولنے والی زبان کو کاٹ ڈالتا ہوں اور پھر یہ بابا تو مکمل طور پر ہمیں قاتل ظاہر کرنے پر تیار ہوا ہے۔ کل کا سورج کسی طرح بابا درویش نہ دیکھ سکے گا۔ ویسے بابا سے کہہ دینا چاہیے کہ وہ اس قبرستان میں اپنی قبر خود کھودنا شروع کر دے۔ بہت عزت پالی ہے اس نے گاؤں والوں کی نظروں میں۔ دن رات میرے حکم پر اس کے ہاتھ پاؤں دباتے رہے ہیں گاؤں والے اور یہ.....

باتیں کرتے کرتے دونوں بڑی حویلی تک آ گئے اور اپنے خاص ملازم کو بلا کر کہہ دیا کہ صبح کا سورج صبح کا اجالا صبح کی روشنی بابا درویش دوبارہ نہ دیکھے۔ اگر وہ صبح کی روشنی دیکھے گا تو پھر رات کی تاریکی تم نہ دیکھ سکو گے۔ جانتے ہوناں میرے کتے شیروں سے زیادہ پھرتیلے اور طاقت والے ہیں۔ سمجھتے ہوناں میری بات۔

”سرکار آپ جو چاہتے ہیں ویسے ہی ہوگا۔“

یہ کہہ کر ملازم کمرے سے باہر نکل آیا اور جونہی سورج نے اپنی گردن زمین میں دبائی روشنی اندھیرے میں بدلی چمکتا دن تاریک رات کی سیاہی میں بدلاتا تب ملازم خاص چپکے سے قبرستان چلا گیا لیکن بزرگ کے آس پاس بیٹھے گاؤں والوں کو دیکھ کر ناکام واپس لوٹنے لگا تو اسے اپنی موت یاد آ گئی۔ شیروں جیسے پھرتیلے اور تیز کتے نظروں کے سامنے گھومنے لگے کہ اگر میں نے بابا درویش کو قتل نہ کیا تو کتے میرے جسم کی بوٹی بوٹی گاؤں میں بکھیر دیں گے۔ میرے جسم کے خون سے اپنے دانتوں کو رنگ لیں گے۔ یہ خیال آتے ہی سیدھا بابا درویش کے خیمہ کے کچھ دور جا کر ایک جگہ چھپ کر گاؤں والوں اور بابا درویش کی باتیں سننے لگا۔ گاؤں والوں نے مجھے کا قصہ چھیڑا ہوا تھا کہ آپ اس مجھے سے متعلق ہر بات جانتے ہیں کہ وہ ایک انسان سے مجھے کیسے بنا۔ تب بزرگ نے بتایا کہ دنیا میں بہت گھناؤنے کام بھی ہوتے ہیں۔ لوگ عمل شروع کر دیتے ہیں اور جب عمل پورا نہیں ہوتا تو جنات کے قبضہ میں خود بھی آ جاتے ہیں اور پھر جنات جو چاہتے ہیں اس سے کرواتے ہیں جیسے یہ انسان سے مجھے بنا ہے۔ یہ بھی جنات کے قبضے میں ہے۔

ادھر چودھری مراد کے وفادار کو بابا کے ختم کرنے کا خیال آیا تو وہ آگے بڑھا اور

بابا جی کی اس بات پر چودھری مراد اور چودھری نواب دونوں کے رنگ اڑ گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس لڑکے کے خاندان کے وہی قاتل ہیں۔ ان کی وجہ سے اس کی پانچویں بہنیں قبروں میں اتریں تھیں۔ آس پاس کھڑے گاؤں والوں کی نظروں میں وہ گرنا نہیں چاہتے تھے۔ چودھری مراد بولا۔

”بابا جی مان گیا ہوں آپ کو۔ آپ بہت بڑے اللہ والے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو ہر خبر سے آگاہ کر رکھا ہے لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ اس کا خاندان کیا ہے؟ کون ہے؟ کہاں رہتا تھا؟ کس نے ظلم ڈھائے ہیں؟ کیوں ڈھائے ہیں اور یہ ایک انسان سے مجھے کیوں بنا؟ مرنے والا اسے جکڑنے کے بعد کیوں چل بسا وہ زندہ کیوں نہ رہا اور اس کی آنکھوں میں اتنی تپش کیسے آگئی؟ اتنی چمک کیسے آگئی کہ جسے چاہا پگھلا ڈالا۔“

”جانتے ہو تم لوگ ہر بات جانتے ہو..... لیکن ظاہر نہیں کرنا چاہتے.....“ درویش بابا کے یہ الفاظ ایسے تھے جس سے گاؤں والے چونک کر رہ گئے۔ اس سے قبل کہ وہ مزید سوال کرتے چودھری نواب بولا۔

”بابا جی آپ تھک چکے ہیں آرام کریں اور ساتھ ہی گاؤں والوں کو ڈانٹا کہ آپ نے کیا بابا جی کے ارد گرد ڈیرہ بجا رکھا ہے دفع ہو جاؤ اپنا کام کرو۔ انہیں آرام کرنے دو کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بابا جی اس وقت مکمل طور پر جلال میں ہیں۔ ہر بات سچ سچ ان کے منہ پر نہ مار دیں اور کہیں جلال میں یہ بات بھی نہ بتا دیں کہ یہ لڑکا تم دونوں کی وجہ سے مجھے بنا ہے۔ تم نے اس کا خاندان قبروں میں پہنچا دیا ہے اور تم سے انتقام لینے کی غرض سے یہ شیطانی عمل کرتا رہا ہے تاکہ تم سب سے بدلہ لے سکے۔ خونی انتقام لے سکے۔ لیکن شاید اس کے جکڑے جانے سے ان کی جان بخشی ہو گئی تھی ورنہ اب تک وہ ان کو جلا کر اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر سکتا تھا۔“

چودھری نواب اور چودھری مراد کے ڈانٹنے سے لوگ ادھر ادھر بکھر گئے۔ تب یہ دونوں بھی دلوں میں ایک طوفان لئے خیمہ سے باہر نکلے اور چلتے ہوئے راستے میں بابا درویش کی باتوں کو دہرانے لگے کہ یہ بابا ہمارے لیے خطرہ ہے۔ اس کی وجہ سے ہم لوگ گاؤں والوں کے سامنے شرمندہ ہونے والے تھے۔ وہ ہمارے خاندان کے تمام راز ظاہر کر دینا چاہتا ہے۔ اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے خطرہ ہے۔ اس کی زندگی کا خاتمہ ضروری ہو گیا ہے۔ مجھے اب دوبارہ تو یہاں نہیں آ سکتا ہے کیونکہ کافی دور دریا میں پھینک آئے ہیں۔ بزرگ نظروں میں کھٹکنے لگا ہے

انہیں بے حرکت لیٹے ہوئے دیکھ کر گاؤں والے مرے ہوئے وفادار کو بھول گئے۔ بزرگ کی موت پر آپس میں مار مار کر روئے۔ ایسے روئے کہ آنسو تھکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ مراد اور نواب ایک تو بزرگ کی موت سے خوش تھے لیکن دوسری طرف غمگین اور پریشان بھی کہ ان کی موت کے ساتھ ہی ان کے وفادار کا تحفظ ختم کیا۔ گاؤں والوں کی تمام تر توجہ بزرگ کی موت پر تھی۔ کوئی بھی جاگیردار کے وفادار کی جانب توجہ نہ دے رہا تھا۔ مراد اور نواب اس بات کو سمجھ رہے تھے کہ گاؤں والوں کی تمام تر ہمدردیاں بزرگ کے ساتھ ہیں۔ اگر ان لمحات میں وہ اپنا رعب جمائیں گے تو گاؤں والے پھر جائیں گے لہذا گاؤں والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کی غرض سے ایک تقریر وہاں جھاڑ دی۔

”گاؤں والو اس گھٹے ہوئے جلے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچہ بنے انسان کو دیکھ رہے ہو۔ یہ ابھی چند گھنٹے پہلے زندہ سلامت تھا اور جانتے ہو کہ اس کا یہ حال کس نے کیا ہے۔ اسی مجھے نے، اسی مجھے نے اسے نوچا ہے۔ اسی مجھے نے اس کی جان کچھنی ہے۔ اس کی موت جلا ہوا پگھلا ہوا جسم یہ بات ظاہر کر رہا ہے کہ مجسمہ دوبارہ رونما ہو گیا ہے اور سب سے بڑھ کر اس مجسمے نے بزرگ پر بھی ترس نہیں کیا۔ انہیں بھی ختم کر ڈالا۔ اگر ان بزرگوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت نہ ہوتی تو ہو سکتا تھا کہ یہ مجسمہ انہیں بھی جلا دیتا، انہیں بھی پگھلا دیتا لیکن یہ خدا کی شان ہے کہ ان کے جسم کو خراش تک نہیں آئی صرف روح قبض ہوئی ہے۔“

چودھری مراد کی باتیں گاؤں والوں کے دل پر جا لگیں۔ ان کے دلوں میں بات بیٹھ گئی کہ بزرگ کی جان بھی اس مجسمے نے لی ہے۔ لہذا گاؤں والے پوری رات چارپائی کے ارد گرد بیٹھے رہے۔ کتنا سکون تھا انہیں بزرگ کے قبرستان میں ڈیرہ لگانے پر۔ ایسے لگتا تھا جیسے گاؤں کے ارد گرد ایک انجانی سی معطر کرنے والی دماغوں کو تسکین پہنچانے والی میٹھی میٹھی سریلی سریلی خوشبوئیں بکھر گئی ہوں۔ نہ دن کی روشنی میں کہیں سے خوف آتا تھا۔ اب ایسے لگتا تھا جیسے ابھی ان کی گردنیں بھی دیوچ لی جائیں گی۔ ان کے جسموں کو لٹکا دیا جائے گا۔ نہ وہ بکھرتی مہکتی خوشبو رہی تھی اور نہ روشنی۔ رات گزر گئی صبح کا اجالا پھوٹ پڑا۔ تاریکی کی کمرٹھیں ہی سحری کی کرن نے کر دٹی لی اور آہستہ آہستہ ہر چیز کو روشن کر ڈالا۔ جہاں بزرگ نے خیمہ لگایا تھا اس جگہ کو ان کی آخری منزل تصور کیا گیا اور اپنے ہاتھوں سے ہی درویش بابا کو ان کے آخری مقام میں اتار دیا گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے۔ ایک بزرگ کے دل و دماغ میں ایک سوال کھٹکنے لگا کہ رات کو جب تمام گاؤں والے ان کے ارد گرد بیٹھے ان کی باتیں

گاؤں والوں سے مخاطب ہو کر گرجا تم لوگوں نے یہاں ڈیرہ جمارکھا ہے چودھری صاحب تم لوگوں کو بلا رہے ہیں۔ یہ حکم سننے ہی ڈرپوک اور سہمے ہوئے لوگ گاؤں کی طرف بھاگنے لگے۔ تب بابا نے اس وفادار کو آخری لفظ بولا۔ ”تم تو ایسے یہاں آتے ہو جیسے موت کا فرشتہ بغیر بتائے آ جاتا ہے۔“

”ہاں بابا ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ آج اور ابھی تم بھی مجھے ایک انسان نہیں موت کا فرشتہ سمجھ لو۔“ یہ کہتے ہی اس نے اپنے ہاتھ بابا درویش کی گردن پر رکھ دیئے۔ چند لمحوں میں بابا جی کی اکھڑی سانسوں میں کلمہ شہادت کی آوازیں تاریک ویرانے میں گونجنے لگیں۔ اس ظالم نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ کیوں کر رہا ہے؟ ایک دنیا دار کے حکم پر ایک مقدس ہستی کو دنیا سے مٹا رہا ہے۔ لمحوں میں ہی بزرگ صاحب کی ہلتی زبان بند ہو گئی۔

ہر طرف سناٹا اور خوف پھیل گیا۔ بابا جی کو ختم کرنے کے بعد ابھی وہ خیمے سے باہر نکلا ہی تھا کہ اپنے سامنے مجسمے کو کھڑا دیکھ کر کانپ کر رہ گیا۔ بھاگنا چاہتا تھا لیکن بھاگ نہ سکا۔ چیخا چاہتا تھا لیکن زبان سے آواز بلند نہ ہو سکی۔ بزرگ صاحب کی موت کے ساتھ مجسمے کی آنکھوں میں روشنی آ گئی تھی اور یہاں کیسے پہنچا تھا یہ ملازم کو خبر تک نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو مجسمے کی آتش اور تیزابی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ جلتی آنکھوں کا شکار ہو چکا تھا، جسم پکھلنے لگا تھا۔ ٹانگوں سے چیز اترتا جا رہا تھا۔ ہڈیاں صاف نظر آ گئیں تھیں۔ لمحوں میں ہی بزرگ صاحب کی لاش کے ساتھ ملازم کی لاش پڑی تھی۔ ادھر چودھری نواب اور چودھری مراد اپنے ملازم کی خبر سننے کیلئے بے چین تھے۔ آنکھوں میں کھٹکنے والے بزرگ کی موت کی خبر سننے کو بے قرار تھے لیکن رات ڈھلتی جا رہی تھی وفادار واپس نہ آیا تو دونوں کو فکر لاحق ہوئی کہ کہیں درویش بابا نے اسے اپنے علم کی بدولت مجسمے کی طرح جکڑ تو نہیں دیا۔

یہ خیال ذہن میں ابھرتے ہی انہوں نے اپنے دوسرے ملازموں کو بلایا اور قبرستان کی طرف بھیجا۔ وہ سب اکٹھے قبرستان پہنچے تو وہاں مرے ہوئے وفادار کو دیکھ کر جہاں کھڑے تھے وہیں ان کے قدم زمین بوس ہونے لگے۔ جسم لڑکھڑانے لگے۔ ایک مرتبہ انہیں اپنے سروں پر ناجتنی ہوئی موت دکھائی دی۔ ایک مرتبہ پھر خود کو موت کے پنجوں میں پایا لیکن یہ کسی کو خبر نہ ہوئی کیونکہ وہاں مجسمے کا نام و نشان تک نہ تھا پھر بزرگ کی طرف دھیان کیا کہ کہیں بزرگ نے تو اسے ایسی حالت تک نہیں پہنچا دیا۔ ہمت کر کے خیمہ کے اندر گئے تو سامنے بزرگ کو مستی کے عالم میں لیٹے ہوئے پایا۔ ان کا چہرہ چمک رہا تھا اور وہ ایسے لیٹے تھے جیسے سوئے ہوئے ہیں۔

سن رہے تھے تو نہ تو ان کو کوئی بخار تھا، نہ طبیعت میں ناسازی دکھائی دی تھی۔ جب نمبردار کا وفادار آیا اور سبھی لوگوں کو نمبردار کا حکم سنایا کہ وہ انہیں بلا رہے ہیں ان کے اچانک بعد ہی بزرگ صاحب کی موت ہو گئی۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے اس بزرگ کے دل و دماغ کو مختلف سوچوں اور الجھنوں میں ڈال دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ابھی سے وہ اس بات کا اظہار گاؤں والوں کے سامنے کر دیں۔ وہ یہ بات بھول گئے تھے کہ وہ بابا جی کیلئے مغفرت کی دعائیں کر رہے ہیں بلکہ اس لمحے تو اس کا دماغ ان کی موت کی طرف جکڑا ہوا تھا۔ سوچوں کا تمام محور بزرگ صاحب کی موت تھا۔ ایک ہنستا مسکراتا چہرہ لحوں میں کیسے قبر میں اتر گیا۔ یہ مجسمہ کے ہاتھوں نہیں مارے گئے کیونکہ مجسمہ تو صرف جلاتا تھا، جسموں کو پگھلاتا تھا اور درویش بابا نہ تو جلے نہ پگھلے اور اگر مجسمے کے ہاتھوں ان کی موت ہوتی تو کم از کم پہلے ان کا خیمہ جلتا پھر وہ مجسمے کی آنکھوں کے سامنے جلتے لیکن ایسا نہ ہوا تھا۔ یہ قدرتی موت نہ تھی ایک قتل تھا۔ میں آج ہی گاؤں والوں کے سامنے اپنے دل کی عکاسی کروں گا اور بتاؤں گا کہ بابا درویش مرے نہیں مارے گئے ہیں۔ بزرگ نے اٹھے ہوئے دعا کیلئے ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

گاؤں والے بزرگ صاحب کی میت اور جلے ہوئے، پگھلے ہوئے نمبردار کے وفادار کے ڈھانچوں کو قبروں میں اتار کر جو نبی گھروں کو پہنچے تو بابا امام دین نے چند ساتھی دوستوں کو ساتھ ملایا اور ایک کونے میں جا کر وہ بات کہہ دی جس نے اس کے دل و دماغ میں انتشار برپا کر رکھا تھا۔ جس نے یہ بات دل میں بٹھا دی کہ چھوٹے نمبردار قاتل ہیں بزرگ کے قاتل۔

”خیر دین بزرگ کی موت جانتے ہو کیسے ہوئی؟“ کھڑے دوست چونک گئے۔

یہ بزرگ مجسمے کے ہاتھوں نہیں مرے۔ اگر مجسمے کی آنکھوں کا شکار ہوتے تو خیمے کے اندر موجود نہ ہوتے، خیمہ سے باہر ہوتے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جلے ہوتے، جسم جلا ہوتا، ہڈیاں نظر آرہی ہوتیں لیکن یہ تو خیمہ کے اندر لیٹے تھے۔ دیکھا نہیں ان کی گردن پر سیاہ نشان تھے جیسے کسی نے ان کا گلا دبا یا ہو جان بوجھ کر مارا ہو اور یہ کام نمبردار مراد اور جاگیردار نواب نے کروایا ہے۔ مرحوم بزرگ ان کے راز عیاں کرنے والے تھے، ان کے کالے دھندوں کو نکال کرنے والے تھے اور یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے خاندان پر یا ان کی ذات پر حرف آئے۔ انہوں نے ہی بابا جی کو قتل کروایا ہے، مروایا ہے، دنیا سے ہستی سے اٹھایا ہے۔

بابا امام دین کی بات سنتے ہی ان سب کو بھی یوں محسوس ہوا جیسے امام دین جو کہہ رہا ہے ایسا ہی ہوا ہے۔ وہ واقعی مجسمہ کے ہاتھوں نہیں کسی انسان کے ہاتھوں گردن دبانے سے مرے تھے لیکن نمبرداروں اور جاگیرداروں کو جانتے تھے۔ تب خیر دین بولا۔

”امام دین تم نے یہ بات ہمیں بتا دی ہے اچھا کیا ہے لیکن اب اس بات کو زبان سے اگلنے کی کوشش نہ کرنا۔ اپنے دل میں گڑھا کھود کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دفن کر دو یہی بہتر ہے۔ یہاں سچی بات کی سزا بہت بھیانک ملتی ہے۔“ نور دین کا واقعہ یاد ہے ناں نمبردار نے اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا تھا۔ آگ لگوا دی تھی اس کے مکان کو، جلا کر راکھ بنا دیا تھا اس کی چار دیواری کو، جانتے ہو ناں اس کے دو ہی بچے تھے، ایک بیٹی ایک بیٹا۔ زندہ مگر مگرے مگرے

جاگسا کہاں غائب ہو گیا۔ یہ منظر دیکھتے ہی سبھی کے چہروں پر خوف کے سائے منڈلانے لگے۔ یہ ایک نئی آفت تھی جو ان پر ظاہر ہوئی تھی۔

تب نمبردار مراد گرجا۔ ”تم دریا کنارے کیا لینے گئے تھے؟“

گر جدار آواز سن کر خستہ حال انسان کہم گیا۔ ”وہ جی مجسمہ۔“

مجسمہ کا نام سنتے ہی سبھی ایک مرتبہ بھر چوٹے۔ چہروں کی رنگت بدلی پڑ گئی۔
”ہاں ہاں بولو۔“

”میں اسے قابو کرنے کی خاطر منتر پڑھ رہا تھا، ورد کر رہا تھا چالیس دن گزر گئے کچھ نہ ہوا۔ رات کو دریا کے بہتے پانی سے بلبلے اٹھنے لگے تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں کامیاب ہو گیا ہوں کیونکہ یہ مجسمہ دریا کے پانی پر ظاہر ہوا اور تیرنے لگا پھر یکدم غائب ہو گیا۔ صرف آج کی رات ہے میں اسے قابو کر لوں گا اپنی گرفت میں لے لوں گا۔ وہ مکمل طور پر میرے قبضہ میں ہے لیکن صرف آج کی رات باقی ہے۔“

مجسمے کا لفظ سنتے ہی نمبردار کو اپنے باپ، اپنی بیوی اور جاگیردار کے جلتے جسم، پکھلتے جسم دکھائی دیے۔ ان کی قبریں نظروں کے سامنے گھومیں جو صرف مجسمے کے ہاتھوں قبروں میں اترے تھے۔ اس کے دل میں آگ بھڑک اٹھی، آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔

”بابا جی مجھے وہ مجسمہ چاہیے ہر حال میں، ہر صورت میں مجسمہ چاہیے۔ میں اس کی آنکھیں نکال دینا چاہتا ہوں۔ اس کے جسم کی تکہ بوٹی بنا دینا چاہتا ہوں۔“

”مل جائے گا، مل جائے گا مجسمہ آپ کو۔“ بابا خوشی سے چپکا۔ صرف آج کی رات ہے وہ کمزور حالت میں اصل صورت میں آجائے گا۔ اس کا سحر ٹوٹ جائے گا، جادو ختم ہو جائے گا۔ اس کا علم میں حاصل کر لوں گا، اس کی طاقت میں خود حاصل کر لوں گا۔ چھوٹے موٹے جنات میرے غلام ہیں لیکن جب اس مجسمے کو قابو کر لوں گا تو راجہ بن جاؤں گا۔ اب تک بے شمار جنات کو جلا چکا ہوں۔ وہاں دریا کنارے ایک خوبصورت دوشیزہ دکھائی دیا کرتی تھی۔ جو شاید مجسمے کی حفاظت کے لیے وہاں گھوما کرتی تھی۔

دوشیزہ کا نام سن کر لوگوں کو وہ راتیں یاد آ گئیں جب مجسمے کے ارد گرد ایک دوشیزہ گھوما کرتی تھی۔ اس کے بالوں میں کنگھی کیا کرتی تھی۔ اس کی حفاظت کیا کرتی تھی۔

”ہاں ہاں ایک دوشیزہ کو ہم نے بھی دیکھا تھا۔“

”میں نے اسے بھی جکڑ لیا ہے۔“ بابا فخر سے بولا۔ ”ادہ اسے کیوں جکڑا ہے میں تو

کردیے تھے نمبردار کے درندوں نے۔ ان کے نور دین کے بیٹے کے پاؤں سے لے کر کانوں تک چھریوں سے جسم کی بوٹیاں کی تھیں۔ وہ تڑپتا رہا تھا، چیختا چلاتا رہا تھا، مدد کو پکارتا رہا تھا۔ کون گیا تھا امام دین اس کی مدد کرنے کو۔ اس کے تڑپنے کا درد کسی نے محسوس کی تھی۔ کسی نے نہیں اور بیٹی کے ساتھ کیا کیا راتوں رات غائب کر دیا گئے کی فصل سے لاش ملی کیسا نوچا تھا درندوں نے اسے۔ امام دین سوچو دماغ پر زور دو تیرا دوست نور دین پاگل ہو گیا۔ کنویں میں جاگرا تھا۔ چار دن بعد لاش ملی تھی اس کی۔ صرف نور دین نے نمبردار کو اتنا ہی کہا تھا ناں کہ مجھے آپ کا فیصلہ منظور نہیں اور تم امام دین تم انہیں قاتل کہنا چاہتے ہو۔ تمہارے بھی بچے ہیں تمہارے جسم پر بھی ماس ہے کیوں جلانا چاہتے ہو اپنے گھر کو کیوں بوٹیاں کروانا چاہتے ہو اپنے بچوں کی۔

خیر دین کی باتیں صحیح نشانے پر لگی تھیں امام دین پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ دماغ چکرا رہا تھا۔

تب بولا۔ ”خیر دین کسی سے ذکر نہ کرنا میں نے اس بات کو بزرگ کے قتل کو اپنے دل میں دفن کر دیا ہے۔ سوچ لیا ہے کہ بزرگ بھی مجسمہ کے ہاتھوں مرا ہے لیکن مجسمہ اسے جلانہ سکا پکھلانہ سکا۔“

ابھی اتنی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک خستہ حال آدمی ہانپتا کانپتا گاؤں آ پہنچا۔ آتے ہی گاؤں کی گلیوں میں شور مچانے لگا۔ ”وہ مجھے مار دے گا، میری جان لے لے گا، مجھے بچا لو۔“ چھوٹے نمبردار نے گلیوں میں برپا شور سنا تو اس شخص کو ڈیرے پر بلایا اور کہا۔ ”کون ہو تم اور کون تجھے مار دے گا؟ کس کے ڈر سے جان چھپائے بھاگ رہے ہو؟“

”وہ ناگ سیاہ ناگ۔“ خستہ حال آدمی کی بات سن کر سبھی لوگ ہنس پڑے۔ نمبردار بولا۔ ”سانپ کیڑے ویرانوں میں اجازوں میں ہوتے ہیں یہاں گاؤں میں کس سے خطرہ ہے؟“

”نہیں صاحب جی وہ ناگ دریا کنارے سے میرے پیچھے بھاگتے ہوئے یہاں تک آیا ہے۔“

دریا کنارے کا نام سنتے ہی سبھی چوٹے۔

”صاحب جی وہ دیکھو باہر آپ کے دروازے کے ساتھ وہ ناگ کھڑا ہے۔“
یہ سنتے ہی سب نے گیٹ کی طرف دیکھا تو سیاہ ناگ بھاگتے ہوئے نجانے کہاں

اور شروع ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد اسے پہلے کی طرح بہتے پانی سے کوئی چیز نکلتی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی بابا کی آنکھیں خوشی سے روشن ہو گئیں کیونکہ مجسمہ پانی سے نکل کر پانی کے قریب باہر کھڑا ہو گیا تھا۔ بابا نے اسے دیکھا تو خوشی سے اٹھا، قریب پڑے ہوئے دو تین برتن اٹھائے جن میں بنجانے کن کنوں بلیوں کا خون جمع کیا تھا۔ کتے تھے، بلیاں تھیں یا چوہے تھے وہ برتن اٹھائے مجسمے کے قریب نیچے اترا اس پر تمام خون انڈیلا اور مجسمے کی مائش کرنے لگا۔ تمام خون اس کے جسم میں پھیلانے لگا۔ شاید آخری روز کے درد کے لیے مجسمے پر خون کی مائش کرنا ضروری تھا۔ زبان سے درد جاری تھا۔ اس کا ایسا کرنا تھا کہ مجسمے کا بند حلق کھل گیا، منہ سے نکلنے والی سانسیں دریا کنارے گونجنے لگیں۔ بابا دوبارہ اپنی جگہ دریا کنارے پر آ بیٹھا۔ پہلے کی طرح درد زبان پر جاری تھا۔ کامیابی سر پر تھی کیونکہ سانسوں کے ساتھ ساتھ مجسمے کے ہاتھ پاؤں آہستہ آہستہ حرکت میں آنے لگے تھے۔ مجسمے کی آنکھوں کی قوت تو پہلے ہی ختم کر دی گئی تھی اب باقی کی طاقتیں بھی حاصل کرنے کیلئے بلند آواز میں درد کر رہا تھا۔ منتر پڑھتا جا رہا تھا، خوشی سے پھولنے لگا۔ سارے ہاتھ خود کو روبرو تصور کر رہا تھا۔ مجسمے کا سحر ٹوٹ چکا تھا جادو ختم ہو گیا۔ ایک عام لڑکا نظر آنے لگا۔ ابھی اس نے منتر ختم کر کے مجسمے پر پھونک ہی ماری تھی کہ قریب بیٹھے سیاہ ناگ کو دیکھ کر چیخا۔

رات کی سیاہ تاریکی میں خوفناک سناٹے میں اس کے منہ سے نکلنے والی بھیانک چیخ کے ساتھ ہی گولیاں چلتی شروع ہو گئیں۔ نشانے پر کون تھا کسی کو خبر نہیں ان کی بندوق کی گولیوں سے کون لہولہان ہو رہا تھا ان کو خبر نہیں۔ گولیوں کی برسات میں سیاہ ناگ ریٹکتا ہوا ان کے قریب گیا اور ایک آدمی کو ڈس لیا۔ بزرگ کی طرح اس آدمی کے منہ سے بھی بھیانک چیخ بلند ہوئی وہ لڑکھڑانے لگا تو باقی کے تمام ساتھی ڈر اور خوف سے واپس گاڑی کی طرف بھاگنے لگے۔ ایک قریب کھڑے شخص نے لڑکھڑانے اور چیخنے والے ساتھی کو بھی کاندھے پر اٹھالیا اور بھاگ کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی ایسے بھگا دی جیسے ان کے پیچھے بہت بڑی بلا لگی ہو، جنات چڑیلیں ان کے پیچھے ہوں۔

ادھر گولیوں سے بابا لہولہان تڑپ رہا تھا۔ آخری سانسیں لے رہا تھا سیاہ ناگ دوبارہ واپس آ کر اس کے پاؤں کا انگوٹھا اپنے زہریلے دانتوں میں لیے مسلسل خون چوسے جا رہا تھا۔

ادھر مجسمے کے بالکل اصل حالت میں آنے کے بعد زاہد کے دل میں اپنے آخری

اس کے حسن پر مرنا تھا۔ اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔“

”یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ وہ ہر روز میرے ورد میں خلل ڈالتی تھی، بھیا تک شکلیں بدل کر ڈرایا کرتی تھی، رکاوٹیں ڈالتی تھی مجھے خوفزدہ کرنا چاہتی تھی، میں نے جگر کر گہری کھائی میں پھینک دیا ہے۔ لیکن یہ سیاہ ناگ اس پر میرا جادو نہیں چل سکتا ہے، اس پر قابو نہیں پاسکتا ہوں۔ اس سے خوفزدہ ہوں اگر آج کی رات۔“

تم ضرور مکمل کرو گے اپنا درد ضرور حاصل کر لو گے اپنی طاقتیں ہمیں کمزور حالت میں وہ مجسمہ چاہیے گن گن کر بدلے لینے ہیں اس سے۔ جتنی لاشیں پگھلائی ہیں، جتنی قبریں بنی ہیں اتنی گولیاں اس کے جسم کے پار کرنی ہیں۔ جسم کے اتنے ٹکڑے کرنے ہیں۔ تمہیں آج کی رات کوئی تنگ نہیں کرے گا۔ نہ سیاہ ناگ نہ کوئی اور تم اپنا درد پورا کرو گے اور مجسمہ ہمارے حوالے کر دے گا۔ جتنی نفری چاہیے مل جائے گی، جتنے لوگ چاہیں حفاظت کے لیے مل جائیں گے۔ ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ تم نے دریا کنارے یہ ورد کیوں کیا؟ کیونکہ تمہاری وجہ سے وہ مجسمہ پانی سے باہر آیا ہے اور باہر آتے ہی ہمارے وفادار کو نگل گیا ہے۔ آج ہی اس کا ڈھانچہ دفن کر آئے ہیں لیکن اب ہمیں زندہ سلامت مجسمہ چاہیے۔

ایک گاڑی تیار کر لی گئی جس میں نمبردار کے وفادار گھس کر بیٹھ گئے تمام بندوقیں لوڈ کر لیں تب نمبردار نے اپنے خاص ملازم سے کہا کہ ”جب مجھے کا سحر ٹوٹ جائے گا وہ کمزور حالت میں انسانی روپ میں سامنے آ جائے گا تو اس بوڑھے کے جسم کو پھینک کر دینا، زندہ نہ بچے لیکن پہلے اسے اپنا درد مکمل کر لینے دینا۔“ ہر بات سمجھانے کے بعد سب کو گاڑی پر بٹھا دیا۔

☆.....☆.....☆

رات کی تاریکی ہر سو پھیل گئی اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا تو گاڑی دریا کنارے پہنچنے کی غرض سے چل پڑی۔ جب دریا کے قریب پہنچے تو بزرگ نے ایک جگہ گاڑی روکنے کو کہا اور بولے جہاں میں ورد کرنا چاہتا ہوں، وہاں سے 100 گز دور آپ لوگ کھڑے رہیں اور دور کھڑے ہی میرے ہر قول و فعل پر نظر رکھیں۔ کوئی بھی چیز نظر آئے گولی چلا دینا۔ قریب اس لیے کھڑے نہیں ہو سکتے کیونکہ ایسے میرا درد مکمل نہ ہوگا کیونکہ ورد کے لیے تنہا ضروری ہے، اکیلا ہونا ضروری ہے۔

لہذا ایسا ہی ہوا۔ 100 گز دور سبھی تین اطراف میں پھیل گئے کیونکہ ایک طرف دریا تھا۔ وہ سبھی بزرگ کی پوری حفاظت کرنے لگے۔ جب ورد کا وقت ہوا تو بابا اپنی جگہ بیٹھ گیا

نے میت کو قابو میں رکھا شیطانی ورد زبان پر جاری رکھا۔ اسے تین کفن پوش انسان ہاتھوں میں چمکتی کلباڑیاں پکڑے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیئے تو اس نے خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ موت کو اپنے سر پر سوار محسوس کیا کیونکہ اس حکم کی تعمیل ہونے والی تھی جس کی اس نے آوازیں اپنے کانوں سے سن لی تھیں۔ آنکھیں بند کیے اپنا ورد اپنا منتر پڑھتا رہا، آنکھیں اس وقت کھولیں جب ورد مکمل ہو گیا اور نیچے پڑی ہوئی میت نے حرکت کی۔ سرخ آنکھوں والی میت کو دیکھ کر پہلے تو خوفزدہ ہوا، ڈرا کانپا لیکن ساتھ ہی ایک زندہ باد کا نعرہ اس کے منہ سے نکلا کیونکہ حرکت کرتے مردے کو دیکھ کر وہ جان گیا تھا کہ وہ اپنے ورد میں کامیاب ہو گیا۔ مردہ اس کے قبضہ میں آ گیا ہے۔ جنات چڑھیں اس کے قبضہ میں آ چکی تھیں۔ جب اس نے گھور کر ایک بزرگ کی طرف دیکھا تو وہ بزرگ جلنے لگا، پکھلنے لگا۔ اپنی آنکھوں میں گرد بابا کی آنکھوں سے زیادہ کشش زیادہ طاقت دیکھ کر وہ دریا کنارے ناچنے لگا، جھومتے ہوئے تہقہ لگانے لگا۔ ”میں راجہ بن گیا میں راجہ بن گیا۔“ اتنی خوشی شاید اس نے اس سے قبل کبھی دیکھی نہ تھی۔

صبح کا اجالا پھوٹنے والا تھا۔ اندھیرا آہستہ آہستہ آخری سانس لے رہا تھا اور صبح کی روشنی پرورش پا رہی تھی۔ تب اسی دریا کنارے بیٹھ کر زاہد جی بھر کر نہایا۔ اپنے آپ پر صدیوں سے جما ہوا بدوار خون صاف کیا۔ جسم کو چمکایا۔ اپنے کپڑے دھوئے۔ پاک صاف ہوا تو ہینکے کپڑوں کے ساتھ ہی دریا کنارے گھومنے لگا۔ دن نکل آیا، سورج چمکنے لگا، ہینکے کپڑے خشک ہونے لگے تو اس نے ورد پڑھ کر جن کو حاضر کیا اور کھانے پینے کا سامان لانے کو کہا۔ جن غائب ہوا اور چند لمحوں میں ہی اس کے سامنے رنگ رنگ کے کھانے موجود تھے۔ پورا دن اس نے تنہائی میں سوچتے ہوئے گزارا۔ ایک دم اس کے خیال میں اس کی سوچوں میں وہ سیاہ ناگ آ گیا جس نے اس کی نظروں کے سامنے ہی تڑپتے انسان کا خون چوسا تھا اور گولیاں برسانے والوں کو خوفزدہ کر کے واپس بھیجا تھا اور اسے کچھ کہے بغیر اپنے بل میں جا گھسا تھا۔ اس کی سوچوں میں وہ ناگ ایک فرشتہ تھا جس نے اس کا ساتھ دیا۔ وہ بیٹھا ناگ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے سامنے کچھ دور جھاڑیوں میں چلتی ہوئی ایک حسین و جمیل شہزادی دکھائی دی۔ جس کا چمکتا ہوا چہرہ اسے اپنا دیوانہ بنا گیا۔ وہ اس کی حسین و دلکش نیلی آنکھوں پر مرمرٹا دیوانوں کی طرح اس کے قریب ہونے کیلئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، لیکن وہ چلتے چلتے تنکھی نظروں سے زاہد کو دیکھتے ہوئے دریا کی طرف بڑھتی گئی۔ زاہد بھی اسے دیکھنے کے لیے مدہوش ہوئے مستی کے عالم میں کھوئے ہوئے دنیا جہاں کو بھولے ہوئے اس کے

روز کے ورد کا خیال آیا اسے ایسے ہی محسوس ہوا جیسے اس کے سامنے گرد بابا آخری سانس لے رہا ہو۔ جسے اس نے اپنے ہاتھوں چھریوں کے وار کر کے لہو لہان کیا تھا۔ اپنے آخری روز کا ورد اس کی میت کے کان میں کرنا چاہتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ بابا کے مرنے کا انتظار کرنے لگا۔ دوسرا ایک بہت بڑے سیاہ ناگ سے بھی خوفزدہ تھا کہ کہیں بزرگ کی طرح وہ ناگ اس کے جسم کا بھی تمام خون نہ چوس لے۔ بابا آخری سانس لینے کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔ آنکھیں کھلی کھلی رہ گئیں ہاتھ پاؤں جسم بے حرکت ہو گیا۔ خون نچڑ جانے سے جسم پیلا زرد ہو گیا تو سیاہ ناگ اس شخص کا خون چوسنے کے بعد ریگستا ہوا اپنے بل میں جا گھسا۔ زاہد نے سکون کا سانس لیا اور میت کے قریب ہو گیا۔ وہ اپنے منتر کو اپنے ورد کو آج مکمل کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ بہنوں کی تڑپتی لاشیں گلے میں پھندے اور قبرستان میں بنی قبریں دکھائی دینے لگی تھیں۔ تب وہ مرے ہوئے بابا پر جھپٹا اس کی میت کو قابو میں لیکر اپنا آخری روز کا ورد شروع کر دیا۔ ابھی ورد شروع ہی کیا تھا کہ ارد گرد سے بھیانک آوازیں گونجنے لگیں۔ سیاہ تاریکی کو مزید بھیانک اور خوفناک بنانے لگیں۔ سیاہ صورتیں جلے مردے اس کے ارد گرد ریگستے لگے۔ دریا کے بیچ جزیرے میں بگڑتی شکلوں والی آگ بھڑکاتی ہوئی اڑاڑ کر اس کنارے آنے لگیں تھیں۔ لیکن وہ مسلسل اپنے ورد کو مکمل کرنے میں لگا رہا۔ اگر ان بھیانک صورتوں سے ڈر جاتا، خوفناک اور گردار آوازوں کو سن کر ڈر جاتا تو وہ جانتا تھا کہ اس کے جسم کی ایک ہڈی بھی سلامت نہیں بچے گی۔ جب جنات اور چڑھیوں کے ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کے باوجود بھی زاہد اپنے ورد میں مگن رہا تو ایک بھاری بھر آواز ابھری آگ لگا دواڑ لڑکے کے جسم کو جلا کر راکھ بنا ڈالو اسے۔ اس کا سر جسم سے کاٹ کر بہتے دریا میں پھینک دو جس طرح اس بزرگ آدمی کی جان کھینچی ہے اسی طرح اس لڑکے کی جان بھی کھینچ لو۔ اس نے ہماری مخلوق میں انتشار پیدا کیا ہے، ہم پر قبضہ جمانا چاہتا ہے، ہمیں قابو کرنا چاہتا ہے، ہمیں جکڑنا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ ہمیں جکڑے ختم کر ڈالو اسے۔ اچھا سردار ایسا ہی کرتے ہیں ابھی اسے ختم کرتے ہیں۔ زاہد میت پر لیٹے لیٹے جنات کے یہ الفاظ سن رہا تھا ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ خوف و ڈر سے جسم پسینہ میں بیگا ہوا تھا۔ ایک دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی جان بچانے کی خاطر بابے کی میت کو چھوڑ کر دریا میں چھلانگ لگا دے لیکن دوسرے لمحے جب اسے اپنی بہنوں کے گلے میں پھندے دکھائی دیئے تو انتقام کی آگ دل میں بھڑک اٹھی۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ تب اس نے سوچا جان جاتی ہے تو جائے لیکن آج کی رات کو ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ لہذا اس

ہو گیا تھا کہ کہیں زاہد اسے گولیوں سے چھلنی نہ کر دے۔ انسانوں کا کیا بھروسہ تھا۔

ناگ کے بل میں گھستے ہی زاہد دوبارہ ظالم دریا کی موجوں میں اپنی شہزادی کو تلاش کرنے لگا۔ کبھی ادھر اور کبھی ادھر اسے تلاش کر رہا تھا لیکن مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ اس دوشیزہ کو پہلی نظر میں دیکھتے ہی زاہد کے دل سے جو آوازیں اٹھیں وہ اسے تڑپانے لگیں، بے چین و بے قرار کرنے لگیں کہ زاہد یہ شہزادی ہی تیری زندگی ہے، تیرے دل کی مالک ہے، تیرے دماغ کی سوچوں کا محور ہے۔ یہ تمہارے لیے بنی ہے اور تم اس کے لیے لیکن وہ اپنے دل کو کیا جواب دیتا، اسے کیسے سمجھاتا کہ تو غلط کہتا تھا تو غلط سوچتا تھا۔ وہ تو صرف دل کو تڑپانے آئی تھی، روح کو جلانے آئی تھی، آنکھوں کو رلانے آئی تھی۔ نجانے اس حسینہ کو اس شہزادی کو اس پری کو کیا پریشانی تھی؟ کیا دکھ تھا؟ کیا رنج تھا؟ کہ لحوں میں ہی اس حسین جوانی کو اپنے حسین مکھڑے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دریا کی لہروں کے سپرد کر دیا۔ کیوں اس نے ایسا کیا؟ کیوں خود کو لہروں کے حوالے کیا؟ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ اور کیوں دریا میں ڈوب مری تھی؟ زاہد آنکھوں میں آنسو لیے دریا کنارے بیٹھا لہروں میں اسے تلاش کرتے ہوئے سوچتا رہا۔ وہ جلتی دھوپ میں بیٹھا تھا یا پیڑ کے سائے تلے اسے تو یہ خبر بھی نہ تھی۔ وہ تو یہ بھی نہ جانتا تھا کہ وہ اتنا لمبا سفر اس کے پیچھے چلتے چلتے کیوں آیا ہے۔

یکدم اس کے دماغ نے پلٹا کھایا۔ حسین سوچوں کو خونی خیالوں میں بدلا تو اپنی بہنوں کے تڑپتے جسم اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے، گلوں میں بندھے سرخ دوپٹے لہراتے دکھائی دیئے، قبرستان میں سے دو قبریں ابھرتیں دکھائی دیں تو اس کی آنکھیں انگارے بن گئیں۔ انتقام کی آگ نے اس کے جسم کو بھڑکا کر رکھ دیا۔ تب اس نے متر پڑھا جن سامنے تیز بہتے پانی پر بیٹھا دکھائی دیا تو زاہد گرجا۔ ”مجھے نمبردار چاہیے فلاں گاؤں کا مالک ہے۔ خود کو راجہ سمجھتا ہے، داتا سمجھتا ہے۔ اسے میرے پاس لاؤ مجھے اس سے انتقام لینا ہے، خونی انتقام ایسا انتقام کہ اس کی آنے والی نسلیں یاد کریں گی۔“

اتنا سنتے ہی جن ایک مرتبہ پھر غائب ہو گیا۔ جب رات ہوئی تو جن کفن پہنے ایک کمرے میں ظاہر ہوا اور ایک چار پائی پر جا کر لیٹ گیا۔

رات کے کسی وقت وہاں لیٹی مالکین نے کروٹ بدلی تو اسے ایسے لگا جیسے اس کے کمرے میں کوئی ہے۔ جب آنکھ کھلی تو ایک چیخ اس کے منہ سے ابھری۔ اس ابھرنے والی چیخ نے حویلی کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا۔ بڑے بھائی، نوکر چا کر اس کے کمرے کی طرف بھاگے

حسن میں کھوئے ہوئے دل میں ہزاروں ارمان لیے، محبتیں لیے، پیار لیے اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔ دوشیزہ تو جیسے اسے پہلی ہی نظر میں گھائل کر گئی تھی۔ اس کی سوچیں، اس کے ارادے، اس کے درد و منتز سب کچھ بھلا گئی تھی۔ وہ مورنی جیسی چال چلتے ہوئے آگے بڑھتی رہی اور یہ اس کے پیچھے چلتے چلتے اس کے قریب سے قریب تر ہوئے جا رہا تھا۔

دریا کنارے پہنچ کر اس شہزادی نے، اس پری نے اس دوشیزہ نے مڑ کر پیچھے آتے ہوئے زاہد کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ شاید وہ یہ بات سمجھ گئی تھی کہ اس نے پہلی ہی نظر میں اسے گھائل کر لیا ہے، اپنا دیوانہ بنالیا ہے، اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔

زاہد کے حسین چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے دوشیزہ لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے ہوئی۔ پیار کا اظہار مسکراہٹ کے انداز میں کرتے ہوئے ہاتھ سے بائے بائے کرتے ہوئے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

دریا میں چھلانگ لگاتے دیکھتے ہی زاہد کا دل کانپ اٹھا۔ اس کا دھیان بار بار تیز چلتے ہوئے دریا کی لہروں کی طرف تھا کہ وہ ایک مرتبہ اوپر پانی میں آتی ہے تو وہ بھی اس کو بچانے کی خاطر اسے پکڑنے کے لیے دریا میں کود پڑتا ہے لیکن وہ دریا کے پانی سے اوپر نہ آئی۔ ہزاروں وسوسے، ہزاروں اندیشے، ہزاروں خیالات نے زاہد کے دماغ کو جکڑ لیا، سوچوں میں غرق کر دیا۔ دل ڈوب ڈوب جا رہا تھا کہ کہیں دریا کی ظالم لہروں نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تو اپنی گرفت میں نہیں لے لیا۔ کیا اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تو نہیں نگل لیا۔ زاہد کا تمام تر خیال، تمام تر توجہ دریا کے تیز بہتے ہوئے پانی، اچھلتی ہوئی لہروں کی طرف تھا، جس میں وہ اپنی شہزادی کو اپنے دل کی رانی کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ تو دوبارہ پانی سے اوپر نہ آئی، البتہ وہی سیاہ ناگ دریا کے پانی سے نکل کر ریگستا ہوا اپنے بل کی طرف بڑھنے لگا۔ اب یہ ناگ کو دیکھتے ہی زاہد چند لحوں کو اپنی دوشیزہ شہزادی کو بھول گیا۔ اس کی اب تمام تر توجہ اسی سیاہ ناگ کی جانب تھی، جو اس کے لیے فرشتہ بنا تھا، جو اس کا منن تھا، جس کی وجہ سے اس نے اپنے درد کو پایہ تکمیل تک پہنچایا تھا۔

وہ بھاگتا ہوا سیاہ ناگ کی جانب بھاگنے لگا اور سیاہ ناگ نے ایک مرتبہ تو پورے کا پورا کھڑے ہو کر زاہد کی طرف دیکھا پھر بھاگتا ہوا اپنی بل میں جا گھسا۔ شاید اس ناگ کو خطرہ

سامنے کا منظر دیکھ کر اسے آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا کہ ایسے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی نظروں کے سامنے وہی دوشیزہ، وہی شہزادی، وہی حسن کی دیوی جھیکے کپڑوں کے ساتھ بیہوش لیٹی تھی۔ اسے بے ہوش اور بھیگا ہوا دیکھ کر اس کا دھیان یکدم اس جن کی طرف گیا جو اس کی گرفت میں تھا، جو اس کا غلام تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے بہتے دریا سے چلتی موجوں سے اس شہزادی کو نکال کر یہاں لٹا دیا ہو کہ میں اسے زندہ سلامت دیکھ سکوں اور خوشی سے پاگل ہو جاؤں۔ واقعی ایسا ہی تھا۔ زاہد خوشی سے پاگل ہوئے جا رہا تھا، خوشی و مسرت سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ بار بار حسینہ کے دلفریب چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ایک دل چاہا کہ اسے اٹھا کر دنیا سے بہت دور لے جائے، اس کا حسن، اس کا حسین چہرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی نظروں میں سجائے۔ ایک آئینہ کی مانند ہر روز ہر وقت ہر لمحہ اسے دیکھا کرے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھایا کرے۔ اتنے میں اس دوشیزہ نے اس حسن پری نے اپنی خوبصورت اور موٹی موٹی نیلی آنکھیں کھولیں۔ سامنے کھڑے اپنے عاشق کو دیکھ کر شرمائی اور لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے اٹھ کھڑی ہو گئی اور شرم و حیا سے بھاگ نکلی۔ اب کی بار زاہد اسے کیسے چھوڑتا، کیسے اپنے سے جدا کرتا، کیسے اپنی نظروں سے اوجھل کرتا۔ وہ ہر چیز بھولے دنیا والوں کو بھولے رانجھا بنے اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ اسے پکڑنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ دوڑ میں زاہد سے تیز تھی، پھر تیلی اور چالاک تھی۔ رات بھر وہ زاہد کو تڑپاتی رہی، خوشی سے خوفناک اور اندھیری رات میں مسکراہٹیں بکھیرتی رہی۔ دونوں میں آنکھ بچوٹی ہوتی رہی۔ وہ قریب آتے آتے قابو آتے آتے پھرتی سے بھاگتی رہی اور وہ اسے پکڑتا رہا۔ بھاگتے بھاگتے وہ دریا کے کنارے جا پہنچے جہاں سے زاہد چل کر یہاں تک آیا تھا۔

دریا کنارے پہنچتے ہی اس دوشیزہ نے پیار بھری نظریں زاہد کے خوبصورت چہرے پر ڈالیں۔ ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور تیز بہتی ہوئی دریا کی موجوں میں کود پڑی اور ان موجوں نے اس دوشیزہ کو ایک مرتبہ پھر نگل لیا۔ ایک مرتبہ پھر اس کے خوبصورت بدن پر قبضہ کر لیا۔ جب زاہد کو دوبارہ دوشیزہ پانی کے اوپر آتی دکھائی نہ دی تو اس نے بھی اپنی شہزادی کی خاطر اپنی جان کی پرواہ نہ کی اور انہی بہتی اور ظالم موجوں کے بیچ چھلانگ لگا دی لیکن یہ دریا کے تیز بہتے ہوئے پانی اور ظالم موجوں کا مقابلہ نہ کر پایا، غوطے کھانے ہی لگا تھا کہ دریا کنارے پانی سے باہر نکلے ہوئے اسی سیاہ ناگ نے اسے دیکھ لیا۔ اسے ڈوبتے اور غوطے کھاتے دیکھتے ہی واپس پانی میں گھسا اور اسے اپنے موٹے اور نرم جسم پر سوار کر کے ایسے دریا کے کنارے لانے لگا جیسے

اور دروازہ بیٹنا شروع کر دیا۔ اندر سوائے چیخوں کے کچھ نہ تھا۔ جب دروازہ توڑا گیا تو مالکن کی نکلی ہوئی آنکھیں نظر آئیں، بہتا ہوا خون دکھائی دیا تو چلائے۔

”کیا ہوا تمہیں؟ کس نے نکالی ہیں تمہاری آنکھیں؟ کس نے بہایا ہے تیرا خون؟“

لیکن وہ بغیر آنکھوں چینی جاری ہی تھی۔ ”بیٹا وہ مجھے مار دے گا میرے پاس لیٹا تھا۔ سفید کفن والا وہ مجھے نوح ڈالے گا۔ مجھے بچا لو اس سے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ پاگلوں کی طرح بھاگنے لگی۔ پہلے تو دروازے کے ساتھ ٹکرائی پھر گرتے گراتے باہر نکل گئی۔ تمام ملازم اسے پکڑنے کی غرض سے پیچھے بھاگتے رہے لیکن وہ در سے چینی ہوئی، چلاتی ہوئی بھاگتی رہی۔ کچھ ہی دور گئی تھی کہ سامنے ملازموں نے یکدم ایک جگہ آگ لگتے دیکھی تو واپس بھاگے۔ مالکن بھاگتے بھاگتے کسی سے ٹکرائی اور جس سے ٹکرائی تھی وہ کوئی اور نہ تھا زاہد تھا۔ وہی زاہد جس کی بہنوں کے ساتھ ظلم ہوا تھا، زیادتی ہوئی تھی۔ ان کے ہاتھوں مری تھیں۔

زاہد چمکتی آنکھیں کھولے اسے گھورے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی تکلیف ختم ہو گئی۔ وہ مستی کے عالم میں کھڑی رہی۔ نہ ہلی، نہ قدم اٹھایا، ساکت کی ساکت رہی۔ اتنے میں گاؤں کے تمام لوگ بھاگتے بھاگتے اھر آ نکلے۔ زاہد جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ مالکن کو نظروں کے سامنے مجسمہ بنے کھڑے دیکھ کر سبھی تڑپ کر رہ گئے۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ کھٹکنے لگا تھا، ہڈیاں ظاہر ہونے لگیں، جو بھی اسے چھونے کی کوشش کرتا اپنا ہاتھ فوری واپس کھینچ لیتا۔ انہیں ایسا لگتا جیسے انہوں نے اپنا ہاتھ جلتے تندور پر رکھ دیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گردن تک ہڈیاں بن گئی۔ بدن کے کپڑے جل گئے تھے۔ جب غیبی آگ کی تپش اس کی گردن تک پہنچی تو اس کے حلق سے لمبے لمبے سانس نکلے اور ساتھ ہی وہ زمین پر گر پڑی۔

ہر طرف شور شرابا شروع ہو گیا۔ اس کے جلے جسم کو اٹھائے، ہڈیوں کے ڈھانچے کو اٹھائے لوگ واپس گاؤں کی طرف پلٹ پڑے۔ مجسمہ کے دوبارہ رومنا ہونے سے سبھی کے چہرے پیلے زرد تھے۔ آنکھوں میں خوف اور ڈر تھا۔ موت سروں پر سوار دکھائی دے رہی تھی۔ گاؤں میں رونا دھونا تھا۔ لوگ مالکن کی ہڈیوں بنی لاش دیکھ کر تڑپ رہے تھے۔ دوسری طرف زاہد یہ منظر دیکھ کر انجوائے کر رہا تھا، قہقہے لگا رہا تھا۔ ویسے ہی خوش ہو رہا تھا جس طرح اس کی بہنوں کی موت پر وہ سب قہقہے لگاتے تھے۔ اندھیرے میں کسی محفوظ جگہ میں چھپنے کیلئے پناہ لینے کیلئے تلاش میں چل پڑا۔ کافی سفر طے کرنے کے بعد ایک جگہ چوک کر رک گیا۔

زاہد کسی کشتی پر سوار ہو۔ زاہد خود حیران تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ کون ہے جو اسے اٹھائے پانی سے باہر لے کر آ رہا ہے؟ جب وہ دریا کے کنارے پہنچا تو سیاہ ناگ نے اپنے بل کھولے اور ریگلتے ہوئے اپنی اسی بل میں جا گھسا جہاں اس کا ٹھکانا تھا، جہاں وہ رہائش پذیر تھا۔

اپنے آپ کو سیاہ ناگ پر سوار ہوئے دیکھ کر زاہد کے دماغ کو ایک جھٹکا تو لگا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اپنے محسن ناگ کی تمام نیکیاں یاد آ گئیں جو اس نے زاہد پر کی تھیں۔ ایک بار سر سے لیکر پاؤں تک زہریلے ناگ کی یہ نیکی یاد کرتے ہی زاہد کی آنکھیں پھٹک پڑیں وہ اس کو پکڑنا چاہتا تھا جو اس کے قابو نہ آتی تھی اور اس چیز کی پرواہ نہ تھی جو اسے بار بار موت کے منہ سے کھینچ کر زندہ سلامت دنیا میں لے آتا تھا۔ روتی آنکھوں بہتے آنسوؤں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا وہ اسی سیاہ ناگ کے بل کے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور بھیگی آنکھوں تڑپتے ہونٹوں کے ساتھ بل کے سامنے اپنا چہرہ کرتے ہوئے پکارا۔

”اے میرے محسن! اے مجھے زندگی دینے والے، موت کے منہ سے کھینچنے والے باہر آ۔ آہ میرے محسن مجھ سے چمٹ جا تو انسانوں سے بڑھ کر ہے جان لینے کی قوت رکھتے ہوئے بھی زندگی دے رہا ہے، نیکیاں کیے جا رہا ہے۔ مجھے بے چین کیے جا رہا ہے۔ باہر آ۔ مجھ سے خوفزدہ نہ ہو، مجھ سے نہ ڈر، دیکھ میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں میں تجھ پر وار نہیں کروں گا اگر تو نے مجھے زندگی سے نوازا ہے تو میرا وعدہ رہا میں بھی قدم قدم پر تیرے ساتھ رہوں گا۔ تیری میری دوستی پکی میں تجھے چھوڑ کر ان انسانوں کے پیچھے بھاگ رہا ہوں جو میرے قابو سے باہر ہیں۔ دیکھو میری آنکھوں میں اس وقت صرف تیرے پیار کے آنسو ہیں، تیری ان نیکیوں کے آنسو ہیں جو تو نے مجھ پر کی ہیں۔ میں بہت گناہگار ہوں، بدکار ہوں، شیطانوں کی گرفت میں ہوں، تو سچا ہے باہر آ جا۔“

زاہد آنکھوں میں آنسو لیے اپنے محسن ناگ کو پکارے جا رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر سیاہ ناگ اپنے بل سے باہر آیا۔ شاید اس نے بھی یہ بات خدا پر چھوڑ دی تھی کہ مرنا ہوں تب بھی پرواہ نہیں اور زندہ رہتا ہوں تب بھی ٹھیک ہے۔

باہر نکلے ہی ایک زہریلا اور خوفناک ناگ زاہد کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

زاہد نے اپنا جسم اس کے سامنے کر دیا اور بولا۔ ”میرے محسن میں بدکار انسان ہوں، لعنتی اور گھٹیا انسان ہوں، کمزور اور بے بس تھا۔ بدلہ لینے کی طاقت نہ رکھتا تھا مجھ پر ظلم ڈھانے والے، میرے خاندان کو قبروں میں پہنچانے والے شہ زور ہیں۔ ان سے بدلہ لینے کی غرض سے

شیطانی علم اپنایا، ورنہ کون تھا جو مجھ پر ڈھائے جانے والے ظلموں کا بدلہ لیتا؟ کون تھا جو میری بہنوں کی موت کے ذمہ داروں سے بدلہ لیتا؟“

یہ سنتے ہی زاہد کے قدموں میں بیٹھا ہوا سیاہ ناگ اپنی دم کے بل کھڑا ہو گیا اور پھٹکارا ایسے جیسے زاہد پر ظلم کرنے والوں کا وہ خود بدلہ لے گا۔ اس کی مرنے والی بہنوں کے خون کا وہ خود بدلہ لے گا۔ اس کے خاندان پر ڈھائی جانے والی زیادتیوں کا وہ خود بدلہ لے گا۔ ناگ کے پھٹکارنے کا یہ مطلب سمجھتے ہی زاہد کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر پھٹک پڑیں تو اس نے بھی دم کے بل کھڑے ہوئے ناگ کو سینے سے چمٹا لیا۔ یہ ایک ایسا منظر تھا کہ اگر کوئی کمزور دل اتنے لمبے اور خوفناک سیاہ ناگ کو کھڑے دیکھ لیتا تو وہیں زمین پر گر کر دم دے بیٹھتا۔ یہ منظر خونی نہ تھا ایک پیار بھرا اور جذباتی منظر تھا۔

زاہد بلک بلک کر بچوں کی طرح رو رہا تھا اور سیاہ ناگ اس کے جسم پر بل دیے جا رہا تھا۔ اپنا سر زاہد کے سر پر رکھے شاید اسے تسلیاں دے رہا تھا، شاید ہمت بڑھا رہا تھا کہ تو اکیلا نہیں ہے۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔ جب تک رات کا اندھیرا چھایا رہا، صبح کی کرن نہ پھوٹی یہی منظر رہا اور پھر صبح ہوتے ہی سانپ نے اپنے بل کھولے نیچے زمین پر اترا تو اپنے بل میں چلا گیا۔

زاہد آنکھوں میں ایک عجیب خوشی لیے کنارے کے اوپر چڑھنے لگا لبوں پر میٹھی سی مسکراہٹ بکھیرے ان گھنے درختوں کی جانب بڑھنے لگا جو دریا کے کنارے تھے، جہاں دنیا والے کم ہی آیا کرتے تھے۔ یہ ایک ویرانہ تھا۔ انسانوں کے دلوں پر خوف اور ڈر بھرنے والی جگہ تھی۔ درختوں کے قریب ابھی اپنے مخصوص ٹھکانے پر پہنچا ہی تھا کہ اسے اسی درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے وہی شہزادی کھڑی دکھائی دی۔

اس کی آنکھوں میں ویسے ہی چھلکتا ہوا، ویسے ہی اچھلتا ہوا ابھرتا ہوا پیار تھا، لبوں پر ویسے ہی میٹھی مسکراہٹ تھی۔ اس دوشیزہ کو سامنے کھڑے پا کر پہلے تو زاہد اپنی آنکھوں کی پیاس بجھاتا رہا، اس کے خوبصورت چہرے کو اپنی آنکھوں میں اتارتا رہا، پھر یکدم اس نے اپنے چہرے پر ناراضگی والے اثرات پیدا کر لیے، روٹھ جانے والا انداز اپنایا تو اپنا رخ دوسری طرف کر لیا اور چلتے ہی لگا تھا کہ اس مہ جبین کے لبوں سے بکھرنے والے ہلکے ہلکے قہقہوں نے اس کے قدم وہیں روک دیے۔ فضا میں بکھرنے والے ان ہلکے ہلکے قہقہوں میں مٹھاس تھی، پیار تھا، چاہت تھی، محبت تھی، آرزوئیں اور امنگیں تھیں۔

زاہد کا دوست تھا وہ ان سب ناگوں کا سردار تھا۔ اس کے ایک اشارے سے ہر طرف زمین پر ریگلتے ہوئے سانپ دکھائی دے سکتے تھے۔

سیاہ ناگ نے پہلے زاہد کے پاؤں کو اپنی زبان سے چاٹا اور پھر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ زاہد گھنے درختوں میں سانپوں کا اکٹھ دیکھ کر حیران اور خوفزدہ رہ گیا۔

کسی سانپ کو اس نے درخت سے نیچے اترتے دیکھا، کسی کو بل سے باہر نکلے دیکھا، کسی کو پانی سے باہر نکلتے دیکھا اور کسی کو جھاڑیوں سے برآمد ہوتے ہوئے دیکھا۔ ایک خوشی تھی اس کے دل میں کہ اس کے ساتھی نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ تب ریگلتے سانپوں ناگوں کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھایا تو اپنے گھناؤنے کارنامے نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ قبروں سے اکھڑے ہوئے مردے یاد آتے، بے قصور بلیوں چوہوں کا قتل عام یاد آیا۔ شیطانوں کی پیروی کرنا یاد آیا، لاشوں کے گرد لپٹے مقدس کفن یاد آئے تو اس کی آنکھیں چمک پڑیں۔ اس نے خیالات میں ہی اپنے آپ کو تیز اور تپتی آگ میں جلتے دیکھا تو خدا کے حضور سجدہ میں گر پڑا اور خدا سے التجائیں کرنے لگا۔

”یا الہی میں بہت ظالم انسان ہوں۔ تیرا در چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا پیشوا بنا لیا تھا۔ تجھے بھول بیٹھا تھا۔ یا اللہ میں گمراہ ہو گیا تھا۔ یا الہی مجھے معاف کر دے۔ میری کوتاہیوں کو معاف کر دے میرے گناہوں کو معاف کر دے۔ میں سچے دل سے اپنے گناہوں کی اپنے گھناؤنے کارناموں کی معافی مانگتا ہوں اور اپنے شیطانی علم کو ختم کرتا ہوں۔ شیطانی علم سے جکڑے جنات وغیرہ کو آزاد کرتا ہوں اب مجھے شیطانوں کی مدد کی نہیں تیری مدد کی ضرورت ہے۔“

سجدے میں بننے والے آنسوؤں سے زمین بھیگ رہی تھی۔ جنات وغیرہ کی آزادی کا کہتے ہی ایک کالی آندھی جلی جوں جوں میں بڑے بڑے درختوں کو نیچے گراتے ہوئے گزر گئی۔ شاید سبھی جنات جو اس کے شیطانی علم میں جکڑے ہوئے تھے آزاد ہو گئے تھے اور بھاگ نکلے تھے۔ ایک طوفان برپا کر گئے تھے۔ سب کچھ بہا کر لے گئے تھے۔ اس نے سجدہ سے سر اٹھایا ایک مرتبہ پھر سچے دل سے کلمہ پڑھا اور اپنے آنسوؤں کو صاف کرنے لگا۔ اب اس نے شیطانی ورد کبھی بھی زبان پر نہ لانے کی قسم کھالی تھی۔ جنات آزاد ہو گئے تھے مردے آزاد ہو گئے لیکن آنکھوں کی تیش ویسے کی ویسے برقرار رہی ان میں ویسے ہی آگ تھی یا پھر شاید کچھ کم ہو گئی تھی۔

شاید اس دوشیزہ کو زاہد کے روٹھ جانے والا انداز بہت اچھا لگا تھا تبھی تو جب زاہد نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس حینہ کو اس پری کو اس مہ جبین کو بانہیں پھیلائے کھڑے پایا، اسے بانہیں پھیلائے اپنا منتظر پایا۔

یہ دیکھ کر زاہد دیوانوں کی طرح اس کی طرف بھاگا۔ ابھی قریب بھی نہ پہنچا تھا کہ وہ پہلے کی طرح شرماتی ہوئی بھاگی۔ یہ بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ وہ اسی انداز میں ہلکے ہلکے مسکراتی ہوئی فضاؤں کو معطر کرتی ہوئی اسی جگہ دریا کے کنارے آگئی اور پانی میں کود گئی۔ زاہد اپنا دل اپنی سوچیں اپنے خیالات سبھی کچھ اس کے نام کر بیٹھا تھا۔ اب کی بار پھر حسرت بھری نگاہوں سے زاہد بہتے ہوئے پانی اور اچھلتی ہوئی موجوں کو دیکھنے لگا۔ ایک خیال اس کے دل میں گونجا کہ پانی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ اس نے خود پانی میں کود کر دیکھ لیا تھا۔ اپنے جسم میں چلتی ہوئی آخری سانسوں کو دیکھ لیا تھا، غوطے کھاتے ہوئے ڈوبتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور یہ بات بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ انسانی مخلوق نہیں ہے۔ کسی اور مخلوق سے تعلق رکھتی ہے جو تیز پانی میں غائب ہو جاتی ہے اور پھر باہر آ جاتی ہے۔ دوسرا خیال یہ بھی آیا ہو سکتا ہے کہ یہ انسان ہو شاید تیرے میں مہارت رکھتی ہو گھنڈہ دو گھنڈہ پانی کی تہہ میں رہ سکتی ہو کیونکہ ایسا تو ممکن تھا۔ غیبی مخلوق ہوتی تو اس کی نظروں کے سامنے کھڑے کھڑے غائب ہو جایا کرتی بھاگتی نہ۔

زاہد نے اپنی محبت میں کسی تیسرے آدمی کو زحمت دینا گوارا نہ کیا حالانکہ وہ قبروں کے مردوں، جنات، چڑیل، کوکچ میں لاسکتا تھا لیکن یہ پیار کا کھیل تھا اور اس پیار کی آگ میں وہ اکیلا ہی جلنا چاہتا تھا۔ اس دوشیزہ کی محبت کی تیش میں خود ہی جھلسنا چاہتا تھا۔ سیاہ ناگ اس کا دوست اور یہ دوشیزہ اس کی محبت تھی اور ان دونوں کے علاوہ اسے کسی تیسرے شخص سے کوئی سروکار نہ تھا۔

جب دنیا والوں کی طرف دھیان گیا تو اس کی آنکھیں تیش میں آنے لگیں، انتقام کی آگ سے دماغ بھاری ہونے لگا۔ بہنوں کے تڑپتے لاشے نظروں کے سامنے دکھائی دینے لگے۔ ان کے گلے میں سرخ رنگ کے پھندے لہرانے لگے۔ تو ایک انتقام بن گیا اور درختوں کے سچ کھڑے کھڑے اپنے دوست ناگ کو پکارا اور سیاہ ناگ جیسے اس کی آواز کا ہی منتظر تھا اس کے پکارنے کا ہی منتظر تھا۔ ہر طرف سے شاں شاں کی آوازیں اٹھنے لگیں، ہر طرف سے جھاڑیوں میں تیز تیز ریگلتے کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرانے لگیں۔ ہزاروں سیاہ ناگ اس کے ارد گرد ایسے گھوم رہے تھے جسے یہ سانپوں کا شہزادہ ہو اور تقریباً ایسا ہی تھا کیونکہ جو سیاہ ناگ

گی۔

چلتے چلتے جب حویلی آئی تو وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔ اندر جاتے ہی اس نے اندر سے کدھی چڑھالی یہ لوگ دروازہ پینٹے ہی رہ گئے لیکن اس نے دروازہ نہ کھولا۔ گاؤں والے بھی حویلی میں جمع ہونے لگے تو نواب صاحب نے انہیں واپس بھگا دیا کیونکہ یہ ان کی عزت کا معاملہ تھا۔ وہ اپنی عزت کا تماشہ کسی اور کو نہیں دکھانا چاہتے تھے۔ ایک گھنٹہ بعد یہ سیاہ رات ختم ہو گئی لیکن دروازہ نہ کھلا دروازہ توڑنا پڑا۔

جاگیرداری مجسمے کی آنکھوں کا چند لمحے شکار ہونے سے مری تو نہ تھی البتہ اس کا دماغ چکرا گیا۔ الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگی، ذہن الٹ گیا، قہقہے لگانے لگی۔ یہ جاگیرداروں اور نمبرداروں کیلئے بے عزتی کا باعث تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے توڑنے لگی، ملازموں پر اینٹیں پھینکنے لگی۔

جاگیردار نے اسے کمرے کے اندر ہی باندھ دیا۔ ڈاکٹروں کو بلایا گیا، حکیموں کی لائیں حویلی میں لگ گئیں لیکن اس کے پاگل پن کا علاج کسی سے بھی نہ ہوا۔ جاگیرداری کا پاگل ہو جانا حویلی والوں کے لیے شرمندگی کا باعث تھا۔ ان کی عزت و ناموس پر فرق پڑتا تھا۔ ان کے وقار کی دھجیاں اڑاتا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح سے ٹھیک ہو جائے۔

حکیموں اور ڈاکٹروں کے علاوہ جادو ٹونہ کرنے والوں کو بلایا گیا۔ جنہوں نے اس کی گبڑی ہوئی حالت دیکھتے ہی کہہ دیا کہ یہ ڈرگئی ہے اس پر بھوت سوار ہو گئے ہیں اس کا جسم اندر سے آہستہ آہستہ جھٹل رہا ہے۔ ایسے جیسے اس نے تیزاب پی لیا ہو یا پھر بجلی کے تیز جھٹکے لگے ہوں لیکن فکر کرنے کی ضرورت نہیں میں اس کے جسم میں گھسی ہوئی بلا کو قابو کر لوں گا جلا کر خاک میں اڑا دوں گا ساتھ ہی وہ کبھی اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتا، کبھی جسم پر کبھی کمرے میں آگ کی دھونی دیتا اور جاگیرداری صرف قہقہے لگائے جارہی تھی۔ جو سامنے آتا اسے الٹی سیدھی سناتی جارہی تھی۔ جب دو دن کی مسلسل جدوجہد بھی بیکار گئی تو جادو ٹونے والا بولا۔

”میں دوسرے شہر جاتا ہوں اپنے گرو کو بلا کر لاتا ہوں دیکھنا کیسے گردن سے پکڑ کر نکالتا ہے اس بھوت کے بچے کو۔ بہت طاقتیں ہیں میرے گرو صاحب کے پاس اڑتے پرندے کو پتھر بنا کر روک سکتا ہے جس کے جسم سے چاہتا ہے جان کھینچ نکالتا ہے جسے چاہتا ہے جلا دیتا ہے۔“

سانپ رات کے سیاہ اندھیرے میں گاؤں تک پہنچ گئے اور زاہد نے بھی اپنے گاؤں کی جانب چلنا شروع کر دیا۔ رات بھر سفر کرتے کرتے اپنے گاؤں کے قبرستان پہنچا۔ اپنی بہنوں کی قبروں پر رویا، آنسو بہائے اور ان کو قبروں میں لٹانے والوں سے بدلہ لینے کو کہا کہ جب تک ان سب غنڈوں بد معاشوں کو جلا نہ دوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔ ابھی اتنی ہی باتیں ہو رہی تھیں کہ نواب صاحب کی بیوی چیختے ہوئے باہر گلیوں سے گزرتے ہوئے قبرستان کی طرف بڑھتی دکھائی دی تو زاہد کی آنکھوں نے خون اگلنا شروع کر دیا، آگ برسانی شروع کر دی، تپش سے بھر گئی، یکدم کھڑا ہو گیا اور بھاگتی ہوئی جاگیرداری کو گھورنے لگا۔

آنکھوں کی تپش محسوس کرتے ہی اس کے قدم رک گئے اور وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی زاہد کی طرف بڑھنے لگی۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے پر مرکوز تھیں۔ چند لمحے گزر گئے تو پیچھے سے جیسے پورا گاؤں ہی جاگیرداری کو تلاش کرتا ہوا قبرستان کی طرف بڑھتا آنے لگا تو زاہد اپنی مخصوص جگہ پر جا کر چھپ گیا۔ جاگیرداری ایک مجسمہ کی مانند وہاں کھڑی رہی۔ جب لوگ اور جاگیردار نواب اس کے قریب آئے تو اس نے گھور کر سبھی کو دیکھا۔ ایک مرتبہ تو سبھی کو اس سے خوف آیا لیکن پھر سوچا کہ یہ ڈرگئی ہے، سانپوں ناگوں سے خوفزدہ ہو گئی ہے کیونکہ پانچ سیاہ ناگ اس کے کمرے میں بیڈ پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ انہیں دیکھ کر یہ چیختے ہوئے بھاگ نکلی تھی۔ ملازموں نے ان سیاہ ناگوں پر گولیاں، ڈنڈے اینٹیں وغیرہ چلا دیں۔ انہیں وہیں لہو لہان کر دیا، وہیں ختم کر دیا۔ تب وہ اسے پکڑنے کی غرض سے قبرستان کی طرف بھاگے۔ ادھر جاگیرداری پر سکتہ کا عالم تھا آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ڈر اور خوف چہرے سے واضح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ہر کسی کو گھورتے ہوئے زبان کو بند رکھے واپس گاؤں کی طرف چل پڑی۔

گاؤں والے اور جاگیردار کے خاندان والے جن میں نمبردار کے بیٹے چھوٹے نمبردار بھی شامل تھے۔ شاید وہ اپنی بہن سے ملنے آئے تھے اور نجانے بہن کو کمرے میں اکیلے چھوڑے کسی جگہ سبھی ڈیرے جمائے بیٹھے تھے کہ حویلی سے ایک گونجتی چیخ سن کر سبھی اس کے کمرے کی طرف بھاگ گئے تھے۔

جاگیرداری کی حالت دیکھ کر پہلے تو ان کے دماغ میں یہ بات آئی کہ یہ مجسمہ کی آنکھوں کا شکار ہو گئی ہے لیکن پھر اس خیال کو جھٹک دیا کیونکہ جو مجسمے کی آنکھوں کا شکار ہو جاتا ہے اس کے قدم زمین پر جم جاتے ہیں، چلتے پھرنے سے معذور ہو جاتا ہے اور یہ تو چل رہی ہے۔ ان کے خیال میں اسے صرف ناگوں کے خوف سے شاک پہنچا ہے خود ہی ٹھیک ہو جائے

تھا کہ جن سانپوں ناگوں کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا ہے اس میں اس کا دوست ناگ تو شامل نہیں ہے کیونکہ وہ اسے کہیں بھی دکھائی نہ دیا تھا اور بس یہی ایک قوت تھی اس کے پاس۔

بھاگتے بھاگتے روشنی پھوٹنے سے پہلے ہی وہ دریا کے قریب جا پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے اپنی شہزادی کو آنکھیں بند کیے دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو تھے چہرہ غمگین اور افسردہ تھا لبوں پر مسکراہٹ نہ تھی بلکہ خاموشی اور اداسی تھی۔ آج شہزادی نے نہ تو زاہد کو پیار بھری نظروں سے دیکھا نہ مسکراہٹ بکھیری نہ ناز و غرہ دکھایا۔ نجانے بند آنکھیں کیے کیا سوچ رہی تھی؟ کہاں کھوئی ہوئی تھی؟ کس صدمے سے دوچار یہاں بیٹھی تھی؟

اسے غمگین اور پریشان دیکھ کر زاہد اس کے قریب ہوا تو اس کے قدم چلتے چلتے رک گئے۔ شہزادی کے پاس وہی پانچ ناگ مردہ حالت میں چھلنی چھلنی پڑے تھے جو زاہد کے لیے جنگ کرنے گئے تھے لڑنے گئے تھے دشمنوں کو ڈسنے گئے تھے۔

یہ یہاں کیسے آگئے؟ لوگوں نے تو انہیں ایک کھیت میں دبا دیا تھا کہ کتے وغیرہ نہ کھا جائیں۔ یہ یہاں کیسے آگئے؟ مرے ہوئے ناگوں کو وہاں موجود دیکھتے ہی زاہد بھی سوچوں میں گم تھا کہ شہزادی نے اپنی بند آنکھیں کھول دیں۔ دو موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر زمین میں جذب ہو گئے۔ اس کی خاطر کھڑی ہو گئی ایک بھر پور نظر زاہد کے چہرے پر ڈالی تو زاہد نے مرے ناگوں سے متعلق پوچھا۔ ان میں وہ ناگ نہ تھا جو اس کا ساتھی تھا جو اس کا دوست تھا۔ جواب میں دو شیزہ نے، پری نے، حسینہ نے چند آنسو بہائے اور سبھی سانپوں ناگوں کو ہاتھوں میں اٹھانے کے بعد دریا کی جانب بڑھنے لگی۔

زاہد وہیں کھڑا اس کو جانا دیکھتا رہ گیا اور سوچتا رہ گیا۔ شاید اسے بھی میری طرح سانپوں ناگوں سے پیار ہے شاید اسے بھی اس چیز کا علم ہے کہ یہ ناگ صرف میری وجہ سے مرے ہیں میری وجہ سے ان کے جسموں پر گولیوں کے نشان پڑے ہیں لیکن یہ اس قدر پریشان کیوں ہے؟ دریا کنارے کھڑی شہزادی کو دیکھتے ہوئے زاہد کے دل و دماغ میں یہ خیالات ابھر رہے تھے۔ جب شہزادی نے ہاتھوں میں پکڑے ناگوں کو دریا کے تیز پانی، ظالم لہروں کے سپرد کیا تو پھر پہلے جیسا روپ دھار لیا۔ لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے دوبارہ زاہد کی طرف بڑھنے لگی۔ قریب پہنچ کر ایک مرتبہ پھر پیار بھری نگاہیں زاہد کے چہرے پر ڈالیں اور مسکراتے ہوئے کہا۔

جاگیردار اس شخص کی باتیں سنے جا رہا تھا کہ وہ کیا کیا بولتا جا رہا ہے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ گرو بابا کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے بابا کی تافرمانی کی۔ انہوں نے آنکھوں کی آنکھوں میں اس کے کپڑوں کو آگ لگا دی۔ اگر ہم فتنے واسطے نہ دیتے تو شاید وہ جل مرتا۔ جاگیردار کو یہ بات پسند آئی اور کہا۔ ”کیا وہ پتھر بنے لوگوں کو اصل حالت میں لا سکتے ہیں؟“

”یہ تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ اسے لے کر آؤ اس لڑکے“ دماغ درست کرنا ہے۔ اگر یہ تیرے گرو بابا سے ٹھیک نہ ہوئی تو اسے بھی گولی سے اڑا دوں گا اور تجھے بھی۔“

”سرکار یہ نوبت نہیں آئے گی ان کے حویلی میں قدم رکھتے ہی دیکھنا یہ بھوت ان کے پاؤں پڑے گا۔“ بہت بڑے جادوگر ہیں لیکن دوسرے کمرے میں ویسے ہی قہقہے تھے ویسے ہی وہ چیخ رہی تھی۔ حویلی والوں کو بھی کوس رہی تھی لیکن یہ بات درست تھی کہ اس نے اندر آگ لگی ہوئی تھی چند لمحوں کی تپش کا بھی وہ سامنا نہ کر پائی تھی اور ان کو یہ خطرہ تھا کہ یہ بھی اپنی بہن کی طرح جھلس نہ جائے۔

اس سے قبل گاؤں میں اتنے زہریلے لمبے لمبے سیاہ ناگ نہ دیکھے گئے تھے۔ یہ یکدم اتنے زیادہ سیاہ ناگ کہاں سے آئے۔ تقریباً یہ الفاظ ہر فرد کی زبان پر تھے ہر کوئی مجسمے کے ساتھ ساتھ سانپوں ناگوں کی باتیں جھپٹے ہوئے تھا۔ اتنا عرصہ کچھ نہ ہوا تھا کوئی موت نہ ہوئی تھی یہ یکدم کیسے ہو گیا؟ یہ تو سبھی جانتے تھے کہ بابا مجسمے کو قابو پانے سے قبل ہی گولیاں لگنے سے چل بسا تھا۔ پتہ نہیں مجسمے کا جادو ٹوٹا تھا یا نہیں۔ اگر مجسمے کا جادو ٹوٹ جاتا تو وہ زاہد کو قابو کر سکتے تھے لیکن اگر نہیں ٹوٹا تھا تو پھر وہ چڑیلوں اور جنات کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے جو اس مجسمے کو نچا رہے تھے گھما رہے تھے غائب کر رہے تھے۔ ظاہر کر رہے تھے اور اس مجسمے سے لوگوں کے جسموں کو جلا رہے تھے پگھلا رہے تھے۔

ادھر زاہد قبرستان سے لوگوں کے جانے کے بعد چھپتے چھپاتے واپس دریا کنارے بھاگنے لگا۔ اسے اپنی جان کا بھی خطرہ تھا کہ کسی وقت بھی وہ انسانوں کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی بندوتوں کی گولیوں کا نشانہ بن سکتا تھا۔ جان گنوا بیٹھتا اسے تو ابھی زندہ رہنا تھا۔ بدلہ لینے کے لیے اس پری نما چہرے والی کے لیے اور اپنے دوست ناگ کے لیے۔ جس کے بارے میں اس نے سن لیا تھا کہ اس نے حویلی میں خوف و ہراس برپا کر دیا تھا اور ایک وجہ سے پریشان بھی

امنگ کہوں، آرزو کہوں یا بولو کیا کہوں کیا نام دوں؟“

”آپ نے تو میرے نام کی ایسی تعریف کر ڈالی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ دریا میں چھلانگ لگا کر ڈوب مروں یا فضاؤں میں بکھر جاؤں، پھولوں میں مہک جاؤں۔“ میری جان کہہ دیا ہے جس نام سے بھی پکاریں گے یہ دیوانی بھاگی چلی آئے گی۔

”اچھا تو آج کے بعد آپ میری رانی اور میں آپ کا راجہ۔“ یعنی ”آپ کا نام ہوا کوئل۔“

کوئل کا نام سنتے ہی شہزادی بولی۔ ”میرے راجہ یہ کوئل اب آپ کی ذات پر کبھی آنچ نہ آنے دے گی۔ مر تو جائے گی لیکن آپ کا دامن نہیں چھوڑے گی۔ آپ کی سانسوں میں بسی رہے گی آپ کا حسین مکھڑا میرے دل میں ایک آئینہ بنا ہوا ہے۔ جب دل چاہا دیکھ لیا، جب دل چاہا آپ کی صورت آنکھوں میں بسالی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے آنکھوں میں شرم و حیا لیے ہونٹوں میں سرخ دوپٹے کا پلو دبائے بھاگ پڑی اور پہلے کی طرح دریا میں چھلانگ لگا دی۔

اس کے جانے کے بعد زاہد سوچوں میں گم ہو گیا کہ اس نے ہزاروں نام تو اسے دے دیئے ہیں لیکن یہ نہیں پوچھا کہ وہ کہاں رہتی ہے؟ کون ہے؟ دریا کی غلام لہروں کے ساتھ کھیلتے اسے خوف نہیں آتا؟ ڈر نہیں لگتا؟ جی نہیں گھبراتا؟ سانس نہیں اکھڑتے؟ اچھا پھر کبھی پوچھوں گا۔ زاہد نے اپنی بات کو خود ہی جھٹک دیا اور اس درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک مرتبہ پھر بہنوں کی موت آنکھوں کے سامنے آگئی تو آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ناگ دوست کو پکارا تو لمحوں میں ہی اپنے بل سے نکلتا ہوا سیاہ ناگ ریگتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگا اور آتے ہی اس نے اپنی زبان سے زاہد کے پاؤں کو چائنا شروع کر دیا اور پھر اس کے جسم سے لپٹ گیا۔ جیسے خوشی کا اظہار کر رہا ہو کہ اس نے گاؤں والوں میں خوف کا پہلا تیر چلا دیا ہے۔ ہر زبان پر سانپ ناگ کی باتیں تھیں۔ چہروں پر وحشت تھی اور خیال بھی درست تھا کیونکہ گاؤں والوں کی یہی صورتحال تھی۔

مالکن کی موت کے بعد ہر طرف انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ نمبرداروں اور جاگیرداروں میں یہ بات طے ہو چکی تھی کہ اب کسی کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ گاؤں میں الارم بج اٹھے تھے حکم سنا دیا گیا تھا کہ جہاں کہیں بھی سیاہ ناگ سانپ دکھائی دے انٹوں پتھروں سے مار دیا جائے۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین میں دبا دیئے جائیں اور ہمارا کام صرف مجسمہ کی

”آپ جانتے ہیں یہ ناگ کیوں مرے ہیں۔“ آپ کی خاطر۔

”یہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں اٹھ آئے تھے۔ آپ کیوں رو رہی تھیں؟ کیوں افسردہ اور پریشان حال تھیں؟“ زاہد نے دوشیزہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

زاہد کی اس بات پر دوشیزہ پھر مسکرائی اور بولی۔ ”کاش میں آپ کی خاطر یہ قربانی دیتی، میرا جسم گولیوں سے چھلنی ہوتا، میں آپ کی بانہوں میں دم دیتی۔“ میری جان آپ نہیں جانتے میں آپ کو کس قدر چاہتی ہوں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں آپ سے کتنا پیار اور محبت کرتی ہوں۔ آپ کی خاطر مرنا چاہتی ہوں، جان کی بازی کھیلنا چاہتی ہوں۔

ابھی یہ الفاظ دوشیزہ کی زبان پر تھے کہ زاہد نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور کہا۔ ”بس آئندہ مرنے کی بات نہ کرنا، آئندہ جدا ہونے کی بات نہ کرنا۔“ میں تو آپ کے پیار کو جانتا ہوں لیکن آپ میرے پیار سے ناواقف ہیں جو تڑپ میرے دل میں ہے وہ آپ کے دل میں نہیں، جو چاہت میرے دل میں ہے آپ کے دل میں نہیں۔ آپ نے تو پہلے ہی دن اپنی حسین صورت دکھا کر مجھے گھائل کر دیا تھا، میرا سب کچھ جھین لیا تھا، دل چرا لیا تھا، سوچیں خیالات چرا لیے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے ہی مجھ سے چرا لیا تھا۔“

یہ الفاظ سنتے ہی اس دوشیزہ کے لب ہلے، ہلکی ہلکی مسکراہٹیں اس ویرانے میں بکھرنے لگیں اور بولی۔ ”بس یہی سننا چاہتی تھی میں آپ کی زبان سے۔ آج میں بہت خوش ہوں جی چاہتا ہے ناچوں قہقہے لگاؤں۔“

شہزادی شوشی سے ناز خڑے دکھانے لگی تو زاہد بھی کھلکھلا کر ہنسا۔ وہ بھی اپنی محبت پر فخر کرنے لگا۔ اتنی خوبصورت شہزادی کبھی اس نے خوابوں میں بھی نہ دیکھی تھی، جتنی خوبصورت اس کی نظروں کے سامنے تھی اور اس کی محبت کا دم بھرتی تھی۔ اس کے لیے جان کی بازی ہارنے کی خواہش مند تھی۔ خوشی کے ان لمحات میں زاہد نے اس حسینہ سے اس کا نام پوچھا تو وہ آنکھوں میں عجیب کشش بھرے اور مسکراتے ہوئے بولی۔

”جو نام آپ مجھے دیں گے بس وہی میرا نام ہوگا۔ سمجھ لیں کہ اس سے قبل میں بنا نام کے ہی تھی۔“

اس کی اس بات پر بھی زاہد مسکرایا اور بولا۔ ”آپ کو مہک کہوں، چاندنی کہوں، خوشبو کہوں، اجالا کہوں، دھڑکن کہوں، دل کہوں، کوئل کہوں، کلی کہوں، گلاب کہوں، حسینہ کہوں، مہر جیوں کہوں، شہزادی کہوں، ملکہ حسن کہوں، الفت کہوں، چاہت کہوں، ہیر کہوں، سسی کہوں، جان کہوں،

آدمی لڑکھڑاتے ہوئے بمشکل گھوڑے پر بیٹھا نجانے کتنی بار اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا، کتنی بار دماغ گھوما، کتنی دفعہ اکھڑی سانسیں محسوس ہوئیں۔ تب یہ گھوڑے پر بیٹھا اور گھوڑا بھاگ پڑا۔ گھوڑا جیسے ان راہوں سے واقف تھا اس کا منہ اپنے ہی گاؤں کی جانب تھا۔ اوپر بیٹھے نمبردار کے وفادار کو کئی مردوں اور عورتوں نے لڑکھڑاتے اور خستہ حال میں دیکھا۔ ایسے جیسے گھوڑا کسی کی لاش لیے بھاگ رہا تھا۔ ابھی گاؤں نہ پہنچا تھا کہ نیچے زمین پر گرا، سانس تو نجانے کب کے ٹوٹ چکے تھے نیچے گرتے ہی تین لمبے لمبے سانس لیے اور چل بسا۔ گاؤں والوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور کھیتوں کی طرف بھاگنے لگے۔ گھوڑا بھی ایسے تڑپ رہا تھا جیسے اس پر آگ کے انگارے لدے ہوں جہاں وہ بیٹھا تھا وہاں سے گھوڑا بھی جلا ہوا تھا۔ اس کی بھی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں اور وہ اپنے جلنے کی پیش سے تڑپ رہا تھا، ہوٹک رہا تھا۔

نیچے زمین پر گرے ملازم کی میت بھی جھلس رہی تھی، پکھل رہی تھی، چیز ہڈیوں سے علیحدہ ہو رہا تھا۔ جلدی سے اسے چارپائی پر لٹایا اور حویلی کی طرف چل پڑے۔ اگر زاہد چند منٹ اسے اور گھورتا تو وہ بھاگ نہ سکتا تھا لیکن زاہد نے ایسا نہ کیا وہ دشمنوں کو دکھانا چاہتا تھا۔ مراد چیخ رہا تھا اپنی بے بسی کو کوس رہا تھا۔ باپ نمبردار نے تمام کہانی سنا ڈالی تھی کہ یہ مجسمہ بنا لڑکا وہی ہے جس کی بہنوں کی تم نے جان لی تھی وہ ایک انتقام بنا ہوا ہے۔ نیست و نابود کر دے گا سبھی کو ایک ایک کو جلا کر پکھلا کر قبروں میں اتار دے گا لیکن یہ ہمارے نوجوان عیش و عشرت میں پڑے قہقہے لگا کر ہنستے کہ ابھی تک ایسا کوئی انسان دنیا میں پیدا نہیں ہوا جو انہیں لاکارے، جو انہیں زیر کرے، جو ان کے جسم کے ایک بال کو بھی نقصان پہنچائے۔ لیکن اب باپ نمبردار کی باتیں دماغ کے گوشوں کو پھاڑ رہی تھیں، گرتی لاشیں، جلنے، جسم پکھلتے چرے اور ہڈیاں بنتی لاشیں یہ بات ظاہر کر رہی تھیں کہ باپ سچا تھا۔ کسی سے کی جانے والی زیادتیوں کی سزا بھگتنا پڑے گی، قبرستان میں اپنی قبریں خود کھودنا پڑیں گی۔

بہادر ملازم کا جسم پکھلتا جا رہا تھا، ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتا جا رہا تھا۔ دن کے آخری حصہ میں اسے قبرستان جا کر سپرد خاک کر دیا گیا اور اب نمبردار مراد خود رات کے اندھیرے میں دس پندرہ وفاداروں کے ساتھ کھوج لگاتے ہوئے بڑھنے لگا کہ مجسمہ کس جگہ موجود ہے تاکہ اسے ختم کیا جائے۔ جس گاؤں کے کسی مرد سے پوچھتا تو پتہ چلتا کہ ادھر سے بھاگ کر آتے ہوئے گھوڑے کو دیکھا گیا تھا۔

سیاہ رات ختم ہو کر چاند کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ کھوج لگاتے لگاتے کافی آگے

تلاش ہے، اس کی موت ہمارا مقصد ہے، اس کی زندگی ہماری موت ہے اور ہماری زندگی اس کی موت ہے۔ اب ٹکراؤ ہوگا، خون سے زمین سرخ ہوگی، مجسمے کی موت پر ایک جشن منایا جائے گا۔ اس کی موت کے بعد اسے آگ میں ڈالا جائے گا۔ آگ بھڑکائی جائے گی۔ جس طرح وہ انسانوں کو جلاتا پکھلاتا ہے یہ سب کچھ اس کے ساتھ ہوگا۔

اردگرد کے گاؤں میں بھی یہ حکم جاری کر دیا گیا تھا جہاں کہیں بھی مجسمہ دکھائی دے ختم کر دیا جائے۔ ہر طرف بے چینی تھی، افراتفری تھی اور ڈرے دلوں کے ساتھ مجسمے کی تلاش جاری تھی۔

مراد نمبردار کا ایک وفادار یہ بازی جیتنا چاہتا تھا۔ مجسمے کو گرفت میں لیکر گاؤں کی گلیوں میں کھینچنا چاہتا تھا۔ تبھی تو وہ بتائے بغیر چل پڑا تھا۔ اس دریا کے کنارے آچکا تھا جہاں زاہد چھپا بیٹھا تھا۔ ابھی رات نہ ہوئی تھی سورج غروب کے آخری مراحل میں تھا۔ لمبے لمبے سایوں کے ساتھ روشنی تھی کہ نمبردار کے وفادار کو ایک جگہ خوبصورت شہزادی لیٹی دکھائی دی۔ یہ کوئل تھی جس کو ایک نظر دیکھنے کے بعد وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے دریا کنارے آیا تھا۔ ایک نظر میں ہی وہ کوئل کی زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ اس کے حسن پر مرنا اور دل چاہا کہ اسے اٹھا کر اپنے گھوڑے پر سوار کر کے لے اڑے اور اپنی زندگی کے دن حسین اور خوشنما بنائے۔ اس ویرانے میں بالکل تنہا خوبصورت حسینہ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں اور وہ اسے ایسے گھور رہا تھا جیسے شکاری اپنے شکار کو گھورتا ہے۔ ایک لمحہ کو بھی نظریں نہ ہٹاتا تھا۔ گھوڑے سے اتر کر وہ لیٹی ہوئی سوئی ہوئی کوئل کے قریب ہوتا گیا کہ یکدم پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ پڑا۔

ڈر کر پیچھے کی جانب دیکھا تو نظر کھڑے زاہد پر پڑی تو چونک اٹھا۔ اپنا ہاتھ پستول کی طرف بڑھانے لگا کیونکہ اسے پہچان لیا تھا۔ ایک مجسمے کو اصل حالت میں دیکھ لیا تھا۔ ابھی پستول ہاتھ میں نہ پکڑا تھا کہ زاہد کی آنکھوں کا نشانہ بن گیا۔ آنکھیں پتھر اگئیں مسلسل زاہد کی آنکھوں کو گھورے جانے لگا۔ لیٹی ہوئی کوئل نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور ایک عجیب منظر دیکھ کر دریا میں جا کودی ادھر مسلسل دونوں ایک دوسرے کو گھورے جا رہے تھے اور وفادار اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ جسم میں پیش پیدا ہونے لگی تو زاہد چلتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اتنے میں وہی سیاہ ناگ رینگتا ہوا بھاگا آیا اور آتے ہی اس کے جسم میں اپنے زہریلے دانت ٹھونس دیئے اور خون چوسنے لگا۔ جب اس کا جسم لڑکھڑانے لگا تو ناگ رینگتا ہوا دریا کی جانب چل پڑا۔ وہ

نجانے کب نیند کی دیوی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو دریا کے کنارے اس نے کول کو ادھر ادھر گھومتے پایا اور کول بھی شاید اپنے بچن کو اپنے محبوب کو تلاش کر رہی تھی۔

کبھی جھاڑیوں میں گھس جاتی کبھی کنارے پر آ جاتی لیکن ناکام اور مایوس رہی۔ زاہد نے اسے آوازیں لگائیں اسے پکارا لیکن اس نے زاہد کی ایک نہ سنی اس کے کانوں تک زاہد کی آواز پہنچتی تو وہ سنتی۔ زاہد نے اپنی قمیض اتار لی اور بھاگتا ہوا پانی کے قریب آتے ہی اسے لہراتا شروع کر دیا کول کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

تقریباً آدھا گھنٹہ ایسے ہی گزر گیا تو کول ہر طرف کی تلاش سے مایوس ہو کر دریا کنارے آ کر پانی کے قریب بیٹھ گئی۔ اچانک ہی اس کا دھیان سامنے دور کھڑے جزیرے میں اپنے محبوب کو کوئی چیز لہراتے دیکھا تو اس کے چہرے پر رونق آ گئی، لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ بھی اپنے ہاتھوں کو ہلانے لگی جیسے کہہ رہی ہو میرے محبوب میری جان آپ فکر نہ کریں آپ کی یہ دیوانی، آپ کی یہ داسی آپ تک ضرور پہنچے گی چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے لیکن زاہد یہ بات جانتا تھا کہ دریا کی ظالم لہریں اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں کیونکہ وہ تو پانیوں کی شہزادی تھی۔ لہذا وقت پانی کی تہہ میں گزار سکتی تھی تیرنا بھی خوب جانتی تھی۔

ہاتھ ہلاتے ہلاتے کول اٹھی اور پانی کے اندر چھلانگ لگا دی۔ ایک لمبی ڈبکی لی تقریباً آدھا دریا عبور کر لیا اور پھر دریا کی ظالم لہروں کو چیرتی ہوئی اپنے محبوب کے پاس جا پہنچی۔ کیا کسی نے خوب کہا ہے:

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو

خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو

یہی حال ان دونوں کا تھا۔ کسی کی طرح اسے گھڑے کی ضرورت بھی نہ پڑی اسے شاید اپنے قوت بازو پر بھروسہ تھا کنارے پہنچتے ہی دونوں ایک دوسرے کو ایسے دیکھنے لگے جیسے صدیوں بعد آمناسامنا ہوا ہو۔ جیسے لمبے عرصے سے ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کے حسین چہرے اپنے دلوں میں اتارنے لگے۔ دلوں میں مہک بھرنے لگے۔ ان کے چہروں پر رونق تھی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی آنکھوں میں زمانے بھر کا پیار تھا۔ دلوں کے گوشے گوشے میں مہکتا پیار تھا۔ کافی لمحات یونہی گزر گئے تو کول نے اپنے بھیکے ہوئے دوپٹے کو نچوڑتے ہوئے کہا۔

نکل گئے۔ اس سے قبل کہ دریا کے کنارے پہنچتے سامنے ہر طرف ویرانہ ہی ویرانہ اور جھاڑیاں بے ترتیب درخت دیکھ کر واپس لوٹ آئے کہ صبح یہاں آئیں گے اب جانوں کو خطرہ ہے۔ جگہ کی نشاندہی انہوں نے کر لی تھی اب مجسمہ کو پکڑنا مشکل نہ تھا صرف صبح کا انتظار تھا۔

زاہد نے بھی جھاڑیوں میں ویرانوں میں بھاگتے گھوڑوں کی آوازیں سن لیں تھیں۔ دل گھبرا گیا تھا جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اپنے آخری سانس گن رہا تھا۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی آنکھوں کے سامنے لے آتا تو ان کا صرف ایک ساتھی ضائع ہونا تھا لیکن دوسری طرف گولیوں کی چیخیں رات کے سناٹے میں گونجتی تھیں اور نجانے کتنی گولیاں اس کے جسم سے لہو زمین پر بکھیرتے ہوئے جسم سے پار ہو جاتیں۔ اس نے غفلتدی سے کام لیا اور چھپا بیٹھا رہا جب وہ واپس مڑ گئے تو اٹھ کھڑا ہوا۔ دریا کے کنارے کی طرف بھاگا ناگ کے بل کے قریب جا کر اسے آواز دی کہ دوست میری زندگی خطرے میں ہے کچھ کرو۔

ناگ پھنکارتا ہوا بل سے باہر نکلا اور دریا کے پانی کی طرف رینگنے لگا۔

زاہد سمجھ گیا کہ یہ ناگ اسے دریا کے تیز بہتے پانی کے اندر لیکر جانے والا ہے کیونکہ اس سے قبل بھی وہ ایک مرتبہ سیاہ ناگ پر سوار ہو چکا تھا۔ ڈوبتا ہوا زندگی موت کی کشمکش سے نکل کر ناگ پر سوار ہو کر کنارے آگیا تھا۔ اب پھر ایسا ہی ہوا چھوٹے چھوٹے پانی پر چلتے چلتے جب گہرے پانی میں آئے تو زاہد نے ناگ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور تیرتا ہوا دور دریا کے بچ بنے ہوئے ایک جزیرے میں لے گیا۔

یہاں انسانوں کے ہاتھوں اس کی جان کو خطرہ نہ تھا۔ یہ جزیرہ انسانی بستیوں سے کٹا ہوا تھا۔ یہاں چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ لیکن یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں قدم قدم پر خوف اور ڈر تھا وحشت تھی عجیب عجیب آوازیں کانوں سے ٹکراتی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ واقعی موت کے منہ میں چلا آیا ہے۔ جنات چڑیلوں سے تو اسے خوف نہ آتا تھا کیونکہ اس نے ہزاروں قسم کی بد صورتوں والی بے ڈھنگے جسموں والی اور لمبے لمبے قدوں والی رچی لی تھیں۔ اپنے شیطانی ورد کے دوران ایسے عجیب خوفناک اور ڈراؤنے واقعات ہر روز رات کو پیش آتے تھے۔ یہاں بیٹھے اسے اپنی کول کی یاد شدت سے سنانے لگی جو اسے کھانا کھلاتی تھی دل بہلاتی تھی لیکن اب اسے کیسے معلوم کہ میں یہاں بیٹھا ہوں وہ تو اسی جگہ ان ویرانوں میں اسے تلاش کرے گی۔

باقی کی رات اس نے ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے سوچوں میں گزاری اور

تھی۔ ابھی زاہد اس کے متعلق ہی سوچ رہا تھا اور یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ لوگ کہاں رہتے ہیں کہ کول بولی۔

”زاہد جان میں پانی میں کودتی ہوں اور آپ مجھے کنارے پر کھڑے ہو کر تلاش کریں۔“

اتنا کہتے ہی کول نے تیز بہتے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ پانی میں ایسے غائب ہو گئی کہ زاہد دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے تلاش کرتا ہی رہ گیا۔ چہرے پر رونق اس وقت آئی جب دریا کے دوسرے کنارے کول کو ہاتھ ہلاتے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو آپ مجھے پانی میں تلاش نہ کریں یہاں کنارے کی طرف دیکھیں۔ ایک خوشی سے ناچنے کے انداز میں وہ بھاگ گئی جھاڑیوں میں گھس گئی اور پھر نجانے کدھر گئی کہ زاہد دیکھ نہ پایا۔

اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی زاہد کو اسی دریا کے کنارے گھوڑے ہی گھوڑے اور آدمی ہی آدمی دکھائی دیے۔ وہ دور سے ان لوگوں کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ اس کے گاؤں کے ظالم لوگ آگئے ہیں دشمن آگئے ہیں اور اسے تلاش کر رہے ہیں۔ کوئی جھاڑیوں میں گھسا تلاش کر رہا تھا تو کوئی دریا کنارے کھڑا اس جزیرے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں زاہد انہیں دیکھ کر لیٹ گیا تھا۔ کسی شخص کی نظر اس پر پڑ گئی تو ایک گولی کی گونج زاہد کو سنائی دی تو وہ بھاگ کر ایک بڑے سے درخت کے پیچھے جا کر چھپ گیا۔ ان لوگوں کو پورا یقین ہو گیا کہ یہ وہی مجسمہ ہے جو اب اصل حالت میں آ گیا ہے۔ ان کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ آنکھوں میں خون اتر آیا تو دریا کنارے کھڑے مراد اور نواب صاحب چیخے۔

”یہ لڑکا اب ہمارے ہاتھوں سے بچنے نہ پائے۔ اسے پکڑنا ہے ہر حالت میں قابو کرنا ہے اس سے عبرتناک انتقام لینا ہے۔ اس کے جسم کے ایک ایک حصے کو جلانا ہے۔ اچلتے ہوئے گرم تیل میں پھینک کر اس کے جسم کی کھال اتارنی ہے۔ اس کی ہڈیوں کو بھی نچکا کرنا ہے۔ اسے پکڑو یہ اب ہمارے قابو میں ہے۔“ لیکن دریا کو عبور کرنے کا مسئلہ تھا وہاں کیسے پہنچا جائے؟ یہاں دریا کنارے خیمے لگ گئے۔ وفادار ساتھی گھوڑوں پر سوار بھاگ گئے۔

زاہد درخت کے پیچھے چھپا یہ تمام منظر دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں کول بھی ڈبے میں کچھ چیزیں رکھے انہیں بند کرنے کے بعد بغیر کسی خوف و ڈر کے دریا کنارے آ گئی۔ ایک نظر وہاں کھڑے لوگوں کے جہوم میں بغور نظروں سے جائزہ لیا اور شاید دل میں سوچ رہی تھی کہ یہ اس کے محبوب کے دشمن اسے ختم کرنے آئے ہیں اسے پکڑنے آئے ہیں۔ لیکن پھر پانی کی طرف

”جان کول میں صبح سے آپ کو وہاں تلاش کر رہی تھی۔ آپ کو وہاں موجود نہ پا کر میں پاگل سی ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میری دنیا اندھیر ہو گئی ہو۔ دل میں ہزاروں دوسے پرورش پانے لگے تھے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ مجھ غریب کا ساتھ چھوڑ کر رنگین دنیا میں چلے گئے ہوں۔“

یہ الفاظ سننے ہی زاہد کی آنکھیں بھر آئیں اس نے فوراً اس کے حسین لبوں پر ہاتھ رکھ دیے اور کہا۔ ”کول آئندہ دل کو زخمی کرنے والی بات نہ کرنا مر تو سکتا ہوں لیکن آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ زندگی بھر آپ کا ساتھ دینے کو کہا ہے اس پر پورا بھی اتروں گا۔“

ارے بابا یہ تو میرے لیے خوش قسمتی کی بات ہے کہ آپ جیسی حسینہ میری زندگی میں آ گئی ورنہ نجانے کیسے گزرتی۔ آپ کو دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چاند میرے دل کے آنگن میں اتر آیا ہو جیسے دنیا بھر کی مہکیں میرے جسم میں گھس آئی ہوں۔

”اچھا اچھا بس کریں۔“ کول اپنی تعریفیں سن کر شرما کر رہ گئی۔ وہ زاہد کی آنکھوں میں چھلکتے آنسو دیکھ کر جان گئی تھی کہ زاہد کی زبان سے نکلنے والی یہ تعریفیں بناوٹی باتیں نہ تھیں بلکہ دل کی آواز تھی کیونکہ اسے اپنے دل کی کیفیت کا علم تھا کہ وہ جسم ہے تو زاہد اس کی جان وہ دل ہے تو زاہد اس کی دھڑکن ہے یعنی دونوں کے دلوں میں ایک جیسی پیار کی میٹھی سی بھڑکتی آگ تھی جو ان کے دلوں کو جلاتی نہ تھی بلکہ مہکاتی تھی۔ تب کول نے بات کا موضوع بدلا اور کہا۔ ”صبح سے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔“

”کول اس ویرانے میں اس بیابان میں اس اجاڑ میں میرا کون ہے جو مجھے کھلائے پلائے بار بار پانی کے گھونٹ سے گزارا کر رہا ہوں۔“

”اچھا آرام کریں سکون کریں میں ابھی لیکر آتی ہوں۔“

”نہ نہ۔“ زاہد نے اسے روک دیا۔ ”پانی میں بازو چلا چلا کر تھک جاؤ گی اور کہیں دریا کی یہ ظالم لہریں تمہیں دبوچ ہی نہ لیں کہیں تمہیں مجھ سے چھین ہی نہ لیں کہیں مجھ سے جدا ہی نہ کر دیں۔“

زاہد کی اس بات پر کول کلکھلا کر ہنسی۔ ”میری جان مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ یوں سمجھ لیں کہ میں نے اپنی آنکھ بھی پانی کے کنارے پر ہی کھولی تھی۔ باپ دادا پردادا ماں نانی دادی سبھی کو پانی سے بہت پیار تھا سبھی تیرنے میں بہت ماہر تھے۔ ہم تو پانی کی شہزادیاں ہیں۔“

کول کی اس بات پر زاہد حیران رہ گیا کیونکہ وہ سچ کہتی تھی ظالم موجوں کو چیرنا جانتی

بڑھنے لگی ان تمام لوگوں کی نظریں اس کے حسن پر جمی ہوئی تھیں۔ اپنے ہوش کھوئے ہوئے تھے پلکیں جھپکنا بھول گئے تھے۔ اس کا حسن دیکھ کر ایک مرتبہ تو سبھی لوگ چونک گئے۔ اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر بھول گئے کہ تیز دھوپ میں یہ اکیلی حسن کی دولت سے لدی لڑکی دریا کنارے کیا لینے آئی ہے۔

نمبردار مراد اسے دیکھتے ہی اپنا دل دے بیٹھا۔ اس کی بیوی تو پہلے ہی مجھے کے ہاتھوں جل مری تھی اور یہی ایک لڑکی تھی جو اس کی ویران زندگی کو مہکا سکتی تھی۔ اندھیر دنیا کو روشن کر سکتی تھی۔ وہ رہ نہ سکا اور نواب سے کہا۔

”مجھے یہ دوشیزہ پسند آگئی ہے۔ آنکھوں کے راستے دل میں اتر گئی ہے۔ میں اسے اپنانا چاہتا ہوں۔“

یہ سن کر جاگیردار کھلکھلا کر ہنسا۔ ”مراد صاحب یہ معمولی لوگ ہیں اور آپ نے کیسے پسند کر لیا ہے۔“

”نہیں نواب نہیں اب میرے گھر کے آنگن میں خوشیاں رنگ بکھیریں گی۔ ایک مجھے کی موت اور دوسرا اس دوشیزہ کو حویلی کی رانی بنانا ہی میرا مقصد ہے۔“

”اچھا یار جیسا تو سوچتا ہے ایسا ہی ہوگا۔“ یہ کہتے ہی جاگیردار نے لڑکی کو آواز دے دی۔

”اے لڑکی!“

کوئل نے لڑکی کا نام سنتے ہی مڑ کر دیکھا تو جاگیردار بولا۔ ”ادھر آؤ۔“ کوئل دریا عبور کرنے کی بجائے جاگیردار کی طرف بڑھنے لگی۔ قریب پہنچ کر سبھی کو ایک نظر دیکھا تو بولی۔

”کیا بات ہے مجھے کیوں بلایا ہے۔“

تب جاگیردار بولا۔ ”دیکھو لڑکی ہم اونچے لوگ ہیں اور جو بات دل میں ہوتی ہے فوری کہہ دیتے ہیں۔ آپ میرے دوست نمبردار کو پسند آگئی ہیں ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ تم کون ہو کہاں رہتی ہو؟ بس تم انہی قدموں واپس گھر لوٹ جاؤ اور اپنے ماں باپ کو ہمارا پیغام دے دو کہ ہمارا دوست آپ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

کوئل بھی زندہ دل تھی یہ بات سن کر قہقہہ لگانے لگی۔ وہاں کھڑے لوگوں کو حیران کرنے لگی۔ ”آپ اونچے لوگ ہیں تو ہوں گے دوسرا یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ آپ نے

مجھے پسند کر لیا تو میں آپ کے آنگن میں چلی آئی۔ میں تم لوگوں کو ٹھکراتی ہوں۔ لعنت بھیجتی ہوں تمہاری دولت، تمہاری اونچی شان پر۔ اس کوئل کے دل میں صرف ایک شہزادے کا راج ہے، وہی اس کا مالک ہے، وہی اس کا راجہ ہے، آپ کی میرے سامنے کچھ حیثیت نہیں۔“

”اے گستاخ لڑکی۔“ جاگیردار کا ہاتھ کوئل کے منہ پر طمانچہ مارنے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ نمبردار مراد نے روک لیا کہ یہ اب ہماری عزت ہے اسے کچھ نہ کہا جائے اور وہاں کھڑے تمام لوگوں سے کہا اپنی غی مالکن کو سلام کرو۔ تمام لوگ سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

تب نمبردار خود بولا۔ ”یہ تو پتہ چل گیا ہے کہ تیرا نام کوئل ہے لیکن ایک بات یاد رکھو تم پہلے تو میری پسند تھی لیکن اب میری ضد بھی بن گئی ہو۔ تمہیں نہ اپنانا میری توہین ہے جو سیدھی طرح سے نہیں مانتے اسے ہم زبردستی منالیتے ہیں۔“

”بول کون ہیں تیرے ماں باپ تاکہ ان سے تمہیں خریدا جائے۔“

نمبردار کی بات پر کوئل کے منہ سے پھر قہقہہ بلند ہوا۔ ”؟؟ مر گئے ہیں تم جیسے لوگوں نے ان کے جسموں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا پھر خون میں ڈبو دیا۔“

”اچھا تو اکیلی ہے۔“ جاگیردار بولا۔

”کوئل سے زیادہ تیز آواز میں جاگیردار کے منہ سے قہقہہ بلند ہوا۔ لیکن کوئل ان کی پرواہ کیے بغیر اٹنے پاؤں چلتے ہوئے دریا کے پانی کے قریب آگئی اور پانی میں کود پڑی۔

وہاں کھڑے لوگ حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ جب کافی دیر تک وہ اوپر پانی میں نہ آئی تو ان کے دل کی دل میں رہ گئی۔ جاگتی آنکھوں دیکھے گئے خواب ٹوٹنے دکھائی دیئے لیکن جب دوسرے کنارے اسے باہر نکل کر زاہد کی جانب بڑھتے دیکھا تو ان کے دلوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ وہ یہ بات بھول گئے کہ اتنا لمبا وقت وہ پانی میں کیسے رہی اور دریا کنارے کیسے پہنچی؟ ان کے دلوں کو چیرنے والی بات یہ تھی کہ وہ ان کے دشمن کی پسند تھی جو بغیر خوف اور ڈر کے زاہد کے پاس گئی۔ اسے درخت کے پیچھے بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا اور اس ویرانے میں گھومنے لگے۔ دریا کنارے کھڑے جاگیردار اور نمبردار کو جلائے لگے۔

نمبردار مراد کی آنکھیں آگ اگل رہی تھیں۔ اپنی پسند کو اپنے دشمن کے ساتھ قہقہہ لگاتے گھومتے دیکھ کر تڑپ رہا تھا۔ غصہ سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو اڑ کر ان دونوں کے سر جسموں سے کاٹ کر دریا میں پھینک دیتا۔

نمبردار کا چھوٹا بھائی اس سے بھی زیادہ گرم طبیعت کا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے جلتی تیلی چھینکے اور وہاں جزیرے کو آگ لگ جائے اور وہ ان دونوں کو یہاں دریا کنارے بیٹھ کر جلتا دیکھ کر لطف اٹھائے لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

ادھر زاہد سر پر موت کو اڑتے دیکھ کر بھی میٹھی میٹھی پیار بھری باتوں میں مصروف تھا۔ شاید وہ آج اپنے دل کی رانی سے تمام دل کی باتیں کر لینا چاہتا تھا۔ تمام نصیحتیں وصیتیں کر دینا چاہتا تھا کیونکہ کوئل نے بتایا تھا کہ وہ آج کسی نہ کسی طریقے سے یہاں پہنچ ہی جائیں گے۔ تب زاہد بولا۔

”کوئل جان مجھے اپنی جان کی فکر نہیں صرف تمہاری فکر ہے کہ تم کیا کرو گی؟ میں تو شروع سے خطروں سے کھیلتا آیا ہوں اور اب زندگی ختم ہونے والی ہے۔“

زاہد کی اس بات پر کوئل بولی۔ ”جان کوئل میرے ہوتے ہوئے آپ پر ذرا بھی آنچ نہ آئے گی ڈٹ جاؤں گی لیکن آپ کو خطرہ میں نہیں پڑنے دوں گی۔ یہ جو نمبردار ہے ناں جو گرج رہا ہے چیخ رہا ہے اس کی کل دونوں آنکھیں آپ کے قدموں میں ہوں گی۔“

کوئل کی زبانی یہ الفاظ سن کر زاہد چونک سا گیا لیکن پھر مسکرایا۔ ”ارے خدا کی بندی وہ عام آدمی نہیں ہے جو اپنی آنکھیں نکال کر تیرے ہاتھ پہ رکھ دے گا وہ رعبہ ہے گاؤں کا دیکھ رہی ہوتاں اس کے ارگرد اس کی حفاظت کو کتنے آدمی جمع ہیں۔ تین چار آدمی تو دریا میں بھی کود پڑے تھے لیکن ہم تک نہ پہنچ پائے اور راستے میں ہی ڈوب مرے۔ ویسے کوئل تم کیا چیز ہو جو نمبردار کے سامنے بھی اکڑ کھڑی ہوئی۔“

زاہد کی اس بات پر کوئل ہنس پڑی قہقہے لگانے لگی اور بولی۔ ”جان آپ نے میری طاقت نہیں دیکھی چیر پھاڑ دیتی ہوں جب طیش میں آ جاؤں اور یہ سب تو میرے سامنے معمولی چیزیں ہیں۔“

زاہد اس کی باتیں سن کر صرف مسکرا کر رہ گیا۔

”اچھا جان اب میں چلتی ہوں کل نمبردار کی آنکھیں بھی تو لانی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی دریا کنارے آئی اور تیز پانی میں چھلانگ لگا کر غائب ہو گئی۔ جب دوسرے کنارے نمودار ہوئی تو نمبردار کے حکم پر وفاداروں نے اسے قابو کر لیا اور زبردستی گھوڑے پر بٹھا کر بھاگ نکلے۔

زاہد یہ منظر دیکھ کر کانپ کر رہ گیا کیونکہ وہ جانتا تھا ان درندوں کو کہ وہ حسین لڑکیوں

”ختم کر دو ان حرام زادوں کو۔“ نمبردار گر جا تو ان لوگوں نے کافی فائر کیے لیکن شاید بندوق سے نکلنے والی گولیوں کی طاقت ان تک پہنچنے کی نہ تھی۔

نمبردار چیخا۔ ”وہ لڑکی ہو کر دریا عبور کر گئی ہے اور تم مرد ہو کر ڈر رہے ہو کانپ رہے ہو۔ ڈوب مرو نمک حراموں چلو کوڈ جاؤ پانی میں اور قابو کر لو اس جسے کو اور اٹھا لاؤ اس اکڑی گردن والی کو۔ دیکھتا ہوں وہ کیسے نہیں آئے گی میری بانہوں میں کیسے حویلی کی رونق نہ بنے گی۔“

یہ اب نمبردار مراد کی انا کا مسئلہ تھا۔ نمبردار کے کہنے پر تین ملازم ڈرتے دلوں کے ساتھ پانی کے قریب آئے۔ ہمت کر کے چھلانگ لگا دی۔ دونوں طرف ہی موت تھی چھلانگ نہ لگاتے تو نمبردار کی بندوق سے نکلنے والی گولیوں سے ان کے جسم رنگ جاتے اور دریا میں کودتے تو ظالم موجوں کی لپیٹ میں آ کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لہذا انہوں نے وفاداری ہی دکھائی اور بہتے تیز پانی میں کود پڑے۔ لحوں میں ہی ظالم موجوں کی لپیٹ میں آ کر ڈوبنے لگے۔ آخری سانس لینے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمیشہ کیلئے پانی کی نظر ہو گئے۔

ان کو ڈوبتے دیکھ کر نمبردار گرجنے لگا۔ ”جان نہیں ہے ان لوگوں کے جسموں میں حالانکہ ان کے سامنے اس حسینہ نے دریا عبور کیا تھا۔ دیکھا نہیں ایک ڈبکی میں دوسرے کنارے جا لگی تھی۔ میرا دل چاہتا ہے کہ سبھی کو گولیوں سے اڑا دوں اور وہ دیکھو کیسے گھوم رہا ہے ہماری عزت کے ساتھ۔ ہمیں ذلیل کرنا چاہتا ہے ہمیں رسوا کرنا چاہتا ہے۔ ہماری پسند پر قبضہ جمانا چاہتا ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی نکلے کر دوں گا اس کے جسم کے اور یہ حسینہ اسے ایسی اذیت دوں گا کہ اپنے حسن پر ناز کرنا چھوڑ دے گی۔ جلا دوں گا اس کا بھی حسین چہرہ بھیا نک بنا دوں گا اس کی صورت کاٹ دوں گا اس کی لمبی زبان کو۔ بہت اکڑ کر گردن اٹھا کر بولتی ہے ہمارے سامنے۔ وہ جانتی نہیں کہ ہم کون ہیں؟ ہم نمبردار ہیں دس بارہ گاؤں کے مالک ہیں۔“ زاہد کوئل کو ایک ساتھ چلتے پھرتے اور قہقہے لگاتے دیکھ کر نمبردار مراد نے پتے ہوتے کہا۔

اگر اس کا بس چلتا تو وہ اڑ کر دریا عبور کر لیتا اور جاتے ہی ان دونوں کی گردنیں نوچ لیتا۔ ختم کر دیتا ان کی زندگی کا کھیل تماشا لیکن وہ بے بس تھا۔ صرف چیختا ہی رہا۔ دو گھنٹے ہو گئے وہاں بیٹھے بیٹھے جاگیردار اسے تسلیاں دیے جا رہا تھا۔

”مراد صاحب کیوں چیخ چیخ کر اپنا گلا خشک کر رہے ہو آج یہ لڑکا زندہ نہیں بچے گا تھوڑا صبر تو کرو۔“

کا کیسے گلا دباتے ہیں؟ کیسے ان کو نچاتے ہیں؟ کیسے ان کو نوچتے ہیں؟ کیسے ان کے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں؟ اسے اپنی بہنیں یاد آگئی تھیں جو ان کی وجہ سے ہی گلے میں سرخ دوپٹے ڈال کر پھندے لے کر مری تھیں اور یہ کوئل یہ بھی آج زندہ نہ بچے گی۔

زاہد نے اسے بہت آوازیں دیں۔ بہت چیخا ترپا بہت رویا لیکن وہ تو اسے گھوڑے پر بٹھا کر غائب ہو گئے تھے۔ زاہد ایک مرتبہ پھر خود کو اکیلا محسوس کرنے لگا۔ اپنی بے بسی پر ماتم کرنے لگا۔ اس کی نظروں کے سامنے ہی اس کی دنیا اندھیر ہونے والی تھی۔ چاہنے والی پیار کرنے والی، مسکراہٹیں بکھیرنے والی، نیلی آنکھوں والی موت کی وادی میں پہنچنے والی تھی۔ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر آنسو بہا تا رہ گیا، ترپتا رہ گیا، سسکتا رہ گیا لیکن کچھ بھی نہ کر سکا۔ کوئل راستے بھرنے تو چینی اور نہ ہی ترپتی شاید وہ خود یہ چاہتی تھی کہ وہ لوگ اسے قابو کر لیں اور وہ ان کیلئے آگ بن جائے، طوفان بن جائے۔

گاؤں پہنچ کر جاتے ہی اسے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ جب رات ہوئی تو نمبردار کمرے میں گیا اور فوری دروازہ بند کر لیا۔ باہر کسی ملازم کا نام و نشان نہ تھا کیونکہ نمبردار نے بھی کو حویلی سے باہر بھیج دیا تھا کہ وہ لوگ ان کے گھناؤنے کارنامے نہ دیکھ سکیں۔

کمرے میں یکدم چیخیں ابھرنے لگیں یہ چیخیں کوئل کی نہ تھیں بلکہ مراد صاحب کی تھیں۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہی کوئل خستہ حال بکھرے بالوں سے باہر نکلی اس کے دونوں ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھوں میں نمبردار کی آنکھیں تھیں۔ چیخنے کی بار بار آوازیں سن کر ملازم جمع ہونے لگے۔ گاؤں والوں کو حویلی میں آنے کی اجازت نہ تھی۔

کوئل بھاگتے ہوئے گاؤں سے باہر نکل گئی۔ نمبردار صاحب نکلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ، بہتے خون کے ساتھ حویلی کے لان میں آگئے اور چیخنے لگے۔ ”اس کو پکڑو جانے نہ پائے“ فوری گولی چلا دو۔“ ملازم اس کے پیچھے بھاگے نجانے اسے زمین نکل گئی تھی یا آسمان کہ وہ رات بھر اسے ڈھونڈتے رہے لیکن وہ کسی کو بھی دکھائی نہ دی۔

وہ تو ظالموں کی گولیوں سے بچتے ہوئے بھاگتے ہوئے دریا کنارے آگئی اور دریا میں کود گئی اور دوسرے کنارے جا کر اپنے محبوب کے سامنے ان کی آنکھیں رکھ دیں اور کہا۔ ”جان کوئل آپ کے دشمنوں کی آنکھیں نکال لائی ہوں۔ اگر چاہتی تو ان کی جان بھی لے سکتی تھی لیکن انہیں ترپنے کیلئے چھوڑ دیا ہے جب چاہوں گی ان کی روئیں کھینچ لوں انہیں لوگوں کے سامنے عبرت بنانا ہے۔“

زاہد سامنے پڑی آنکھیں دیکھ کر حیران و ششدر بیٹھا تھا۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ ایک لڑکی اتنا بڑا کارنامہ دکھا سکتی ہے وہ کبھی کوئل کا چہرہ دیکھتا اور کبھی آنکھیں۔ آخر نہ رہ سکا اور بولا۔ ”دل تمہیں میری قسم کچ بچتاؤ تم کیا چیز ہو؟ تمہارے اندر کون سی قوت ہے؟ نہ تم ڈرتی ہو نہ خوف کھاتی ہو اور دریا کا تیز پانی، ظالم موجیں بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ بتاؤ تم کون ہو؟“

”کیا کرو گے میری جان میرے بارے میں جان کر؟“

”کچھ نہیں صرف آپ کی طاقت دیکھنا چاہتا ہوں۔“ آخر میرا بھی تو آپ پر حق

ہے۔

یہ سننے کے بعد کوئل کی آنکھیں چھلک پڑیں اور بولی۔ ”جان میرے بارے میں جان کر آپ مجھے چھوڑ تو نہ دیں گے۔ مجھ سے دور تو نہ ہو جائیں گے۔“ خدا گواہ ہے میں آپ کے بنا ایک پل نہیں رہ سکتی۔ آپ پر جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ میری رگوں میں آپ بس چکے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار کسی کو چاہا ہے اور وہ آپ ہیں۔

اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ بولتی زاہد نے اس کی بہتی آنکھوں سے آنسو صاف کیے اور کہا۔ ”مجھے تیری محبت کی قسم میں نہ تو تمہیں چھوڑوں گا اور نہ ہی جدا ہوں گا بلکہ تم جو بھی ہو (کیونکہ اس لمحے زاہد کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے یہ انسان نہ ہو خوبصورت چڑیل ہو جو عورت کے روپ میں اس کے سامنے آگئی ہو کیونکہ جو کارنامے اس نے دکھائے تھے وہ کسی عورت کا کام ہو ہی نہیں سکتا تھا بلکہ غیبی مخلوق ہی کر سکتی تھی۔) میری محبت ہو میرا پیار ہو میری چاہت ہو۔ میرا وعدہ ہے کہ زندگی تمہارے سنگ ہی گزاروں گا۔ مجھے اپنا اصل روپ دکھا دو۔“

یہ سن کر کوئل چپک اٹھی اور کہا۔ ”اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خود ہی دس تک گنتی گن کر آنکھیں کھول لیں۔“

زاہد نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور گنتی شروع کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے سامنے ایک لمبی ترنگی بد صورت سی لمبے لمبے دانتوں والی سیاہ اور بکھرے بالوں والی جلتی آنکھوں والی خونخوار ناخنوں والی بلا کھڑی ہوگی لیکن جب آنکھیں کھولیں تو سامنے کچھ نہ تھا بالکل خاموشی تھی۔ وہ ادھر ادھر اسے تلاش کرنے لگا لیکن کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ پاگلوں کی طرح دیوانوں کی طرح اسے پکارنے لگا آوازیں دینے لگا لیکن سب بیکار گیا۔

کوئل شاید چھپی ہوئی اس کی بیتابی و بے چینی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ دیکھنا

چاہتی تھی کہ اس کے دل میں اس کیلئے کتنی تڑپ اور محبت ہے اور زاہد اس لئے واقعی ایک دیوانہ بنا ہوا تھا۔

تم جہاں بھی چھپی ہو آ جاؤ تمہارے بنا میں خود کو اکیلے محسوس کر رہا ہوں۔ اس کے دل و دماغ میں ہلچل برپا تھی۔ عجیب الجھن میں گرفتار تھا۔ میری شہزادی روٹھ گئی ہے، نجانے کہاں چلی گئی ہے، میں نے اس سے اصلیت پوچھی تھی لیکن وہ غائب ہو گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ آجیسی مخلوق ہے، بہادر اور طاقت ور ہے اور مجھے خبر ہے کہ میں نے کسی ایسی چیز کا انتخاب کیا ہے جو دشمنوں سے بدلہ لینے میں میری مدد کرے۔ میرا ساتھ دے، مجھے تنہا نہ چھوڑے۔ ساتھ ہی ساتھ چاند کی روشنی میں اندھیرے میں سناٹے میں اپنی شہزادی کو بھی تلاش کر رہا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح دریا کنارے کھڑے ہو کر دریا کی اچھلتی لہروں کو دیکھتا کہ شاید ان لہروں سے ابھی وہ اوپر آ جائے اور کہہ دے کہ زاہد جان گئے ہو میں کون ہوں؟ اور کبھی جزیرے کی خوفناک جھاڑیوں میں بھاگتا جہاں سے کئی ناگ، کئی سانپ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ انہیں جگہوں میں ایک طرف سے قہقہے بلند ہونے لگے۔ کول جھاڑیوں سے یکدم اس کے سامنے آ گئی۔ اسے اپنے سامنے دیکھتے ہی زاہد نے سکون کا سانس لیا اور دل ہی دل میں ہزاروں باتیں اس سے کر ڈالیں۔

ادھر کول اپنے پیار کو اپنے محبوب کو محبت کی نظروں سے دیکھنے کے بعد زاہد کی نظروں کے سامنے دوبارہ اپنا روپ بدلنے لگی۔

حسین و جمیل دو شیرہ سے سیاہ ناگ کا روپ بدلنے کے بعد جھاڑیوں میں ریختے ہوئے دریا میں کود پڑی۔ اسے ناگ بنا دیکھ کر زاہد ہر بات سمجھ گیا۔ اسے ناگ کی دوستی یاد آ گئی، سانپوں کی فوج یاد آ گئی جو بدلہ لینے کیلئے گئی تھی۔ کول کے ہاتھوں میں مرے ناگوں کو دیکھ کر رونما یاد آ گیا۔ کول نہ تو انسان تھی اور نہ ہی جن زادی وہ ناگن تھی۔ پہلے تو اس کا دل دھڑکا لیکن پھر کول کی محبت یاد آ گئی۔ کول کے آخری الفاظ یاد آ گئے کہ میری اصلیت جان کر مجھے چھوڑ نہ جانا، مجھ سے جدا نہ ہو جانا ورنہ میں مر جاؤں گی، نکھر جاؤں گی، ریزہ ریزہ ہو جاؤں گی، ٹوٹ جاؤں گی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں تڑپتے آنسو یاد آ گئے اور دوسری طرف کول کا ناگ بننے ہی دریا میں کودنا دیکھ کر زاہد سوچوں میں گرفتار ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

زاہد رنجی ہوئی ناگن کول کو دیکھ کر تڑپ کر رہ گیا۔ اسے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ اس کی محبوبہ ناگن بھی ہو سکتی ہے۔ وہ تو اسے ایک حسین لڑکی، حسین دو شیرہ سمجھ کر اس پر دل پھینک چکا تھا، اپنی زندگی اس کے نام لگا چکا تھا، اسے دل میں بسا چکا تھا، آنکھوں میں سا چکا تھا، لیکن کول کا یہ روپ اس کے دل کو گھائل کر گیا۔ پہلے تو دل میں خیال آیا کہ دریا میں کود کر خود کو ختم کر لے، لیکن جب اس کا دھیان کول کی محبت، اس کے پیار کی جانب گیا تو اپنے قدم روک لئے۔ آہستہ آہستہ تمام کہانی اسے یاد آنے لگی۔ کول کا دریا میں کودنا اور پانی کی لہروں میں غائب ہو جانا، سانپوں ناگوں کی فوج کا گاؤں پر حملہ کرنا اور مرے ناگوں کے جسموں کو ہاتھوں میں لے کر آنسو بہانا۔ سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ ناگن ہے یا انسان اب صرف اس کی ہے۔ اس کی زندگی ہے، یہی اس کی چاہت ہے، یہی اس کی محبت ہے۔ اب وہ اس کا ناگن والا روپ دیکھ کر نفرت نہیں کرے گا بلکہ اسے اور زیادہ چاہے گا اور زیادہ اس کے قریب ہوگا۔ ویسے بھی ان لمحات میں ایسے ہی کسی انسان کی تلاش تھی جو قدم قدم پر اس کا ساتھ دے سکے۔ اگر یہ ناگن نہ ہوتی، انسان ہوتی تو اس کے دشمنوں سے کیسے نکرا سکتی تھی؟ کیسے ان کا خاتمہ کر سکتی تھی؟ کیسے انہیں نیست و نابود کر سکتی تھی؟ یہ خیال آتے ہی اس نے زور زور سے پکارنا شروع کر دیا۔ دریا کنارے چھپی ناگن دو شیرہ کے روپ میں، حسن نکھرے لمبوں پر مسکراہٹ نکھیرنے نیلی آنکھوں میں شرم و حیا لئے، دیوانوں کی طرح، پاگوں کی طرح زاہد کی جانب بھاگی۔ جیسے اس کے ہاتھ قارون کا خزانہ لگ گیا ہو۔

جیسے اسے ہر وہ چیز مل گئی جس کی اس نے آرزو کی تھی، جس کی اسے تلاش تھی۔
”کول آئی لو یو۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں، تم سے محبت کرتا ہوں، تم میری ہو، صرف اور صرف میری۔“

زاہد کی زبان سے اپنے لئے بے انتہا پیار دیکھ کر کول خوشی سے ناچنے لگی، فضا اس

ہمت نہیں ہے۔ اچھا اپنے آنسو صاف کرو اور آئندہ کبھی ایسی بات زبان نہ لانا بلکہ سوچنا بھی نہیں۔ ”میرا تم سے وعدہ ہے کہ دونوں کے درمیان کسی تیسرے کو گھسنے نہیں دوں گا۔ مجھے تو تمہاری فکر ہے کہ اگر کوئی اور آپ کے حسن کا دیوانہ ہو گیا، آپ کو لے کر فرار ہو گیا تو میرا کیا بنے گا۔ کیسے جی پاؤں گا، میں کیسے زندگی گزاروں گا۔“

زاہد کی اس بات پر کوئل کے بھیکے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”ڈسکہ کے قریب پہنچاؤ گی اگر کسی نے میری طرف ہاتھ بھی بڑھا کر دیکھا۔ نمبردار کا حال دیکھ لیا ہے۔ عشق جھاڑنے لگا تھا مجھ پر۔ کہتا تھا کہ تم مجھے پسند آ گئی ہو، میں تمہیں اپنا چاہتا ہوں۔ ایسی سناٹی تھیں کہ دوبارہ مجھ سے عشق نہیں جھاڑے گا۔“

نمبردار کا نام سن کر زاہد کا دماغ گھوم گیا۔ ”کوئل یہ سب میرے دشمن ہیں۔ یہ نمبردار جاگیردار کے گاؤں جاتے رہتے تھے۔ یہ بھی میری بہنوں کو دیکھ کر قہقہے لگاتے تھے۔ کسی میں ہمت نہیں ہے کہ ان کی گردنوں کو نوچ سکے۔“

”زاہد جان میں نوچوں گی ان کی گردنوں کو، میں ملاؤں گی ان کو مٹی میں، تڑپا تڑپا کر ماروں گی، گاؤں والوں کے سامنے عبرت بناؤں گی انہیں۔ ایک تو پاگل بنی ہوئی ہے، قہقہے لگاتی ہے پاگلوں کی طرح، رسیوں سے باندھ کر کمرے میں بند رکھا ہوا ہے۔ اس کے پاگل پن نے نمبرداروں اور جاگیرداروں کی زندگی اجیرن بنا رکھی ہے۔ گاؤں والے اس کا تماشہ دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کی اکثری گردنیں ایک دن ضرور جھکیں گی۔ گاؤں والوں کو دشمن بنا دوں گی ان کا۔“

کوئل کی باتیں سن کر زاہد خوشی سے بولا۔ ”بس یہی چاہتا ہوں کوئل! میں یہی چاہتا ہوں۔“

”آپ کو دیکھ کر میں نے اپنا درد ختم کر دیا۔ قبضے میں لیے ہوئے تمام جنات، چڑیلوں بھوتوں کو آزاد کر دیا۔ ورنہ ان کی مدد سے گاؤں میں خون کی نہریں چلا دیتا، آندھوں اور طوفانوں میں اڑا دیتا۔“

جنات کا نام سنتے ہی کوئل ایک مرتبہ بھر کانپ کر رہ گئی اور حسرت بھری نظروں سے محبوب کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ جنات کے نام سے کوئل خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ یہ زاہد کو معلوم نہ تھا تبھی جنات کی بات زاہد چھیڑتا ہی نہ۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئل کا دل زخمی ہو وہ دکھی ہو۔ وہ اسے ہنساتا رہتا اور دونوں پیار میں مست رہتے۔ اب تو ہر روز فضاؤں میں قہقہے بکھرنے لگے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے بغیر خود کو ادھورا سمجھنے لگے۔ جب تک ایک دوسرے کو

میں اڑنے لگی۔ وہ تو سمجھ بیٹھی تھی کہ زاہد اس کا اصل روپ دیکھ کر اس سے نفرت کرنے لگے گا، اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو جائے گا اور وہ آنسو بہاتی رہ جائے گی، ٹوٹ کر بکھر جائے گی، ریزہ ریزہ ہو جائے گی، خود کو ختم کر لے گی لیکن ایسا نہ ہوا تھا۔

”کوئل جان تم مجھے مل گئی ہو تو زندگی کی ہر چیز مل گئی ہے۔ تمہارا ناگن والا روپ مجھے اچھا لگا ہے۔ ختم کر ڈالو میرے دشمنوں کو، ڈس لو۔ ان سب سے ان کے جسموں کا تمام خون نچوڑ ڈالو۔ آئی لو کوئل آئی لو یو۔“

زاہد کافی دیر تک کوئل کے معصوم چہرے کو دیکھ کر جذباتی ہو کر بول اٹھا تھا اور کوئل نے اپنے جذبات کو قابو نہ رکھتے ہوئے اپنے حسین شہزادے کے ہاتھ چوم لئے۔

”زاہد جان میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ میرا اصل روپ جان کر بھی تم مجھے اتنی خوشی دو گے۔ جب آپ نے میرا دل موہ لیا ہے، مجھے جیت لیا ہے، میری محبت کو جیت لیا ہے اب میں تمہا نہیں ہوں۔ اب میں اکیلی نہیں ہوں، ہر چیز میرے پاس ہے۔ آپ کی خاطر ہر کسی سے ٹکڑا جاؤں گی۔ آپ کے دشمنوں کو چاڑھاؤں گی، ان کے جسموں میں چلنے والے گرم خون کو نچوڑ ڈالوں گی۔ آج میں بہت خوش ہوں، آج مجھے میری منزل مل گئی ہے، وہ سب کچھ مجھے مل گیا ہے جو میں نے خدا سے مانگا تھا۔“

تب ہی اس کی پلکیں بھیگنے لگیں، نیلی آنکھیں اند آئیں، سرخ گالوں پر آنسو تیرنے لگے، ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

تو کیوں روتی ہے۔ زاہد اسے دیکھ کر تڑپ کر رہ گیا۔

”کوئل! کوئل جان کیا ہوا ہے۔ لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرتے بکھیرتے آنسوؤں میں خود کو کیوں بھگوا ڈالا ہے۔“

کوئل بھیگی پلکوں کے ساتھ زاہد کے معصوم چہرے کو دیکھنے لگی۔ ”جان آپ سے جدائی کا منظر یاد آ گیا تھا۔ ایسا لگا جیسے کوئی آپ کو مجھ سے چھین کر لے جائے گا، آپ کسی اور کے دل کے راجہ بن جائیں گے اور میں تڑپتی رہ جاؤں گی، ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاؤں گی۔“

کوئل کی اس بات پر زاہد کھلکھلا کر ہنسا۔

”خوب کہا ہے تم نے کوئی مجھے اٹھا کر لے جائے گا۔“ ارے بابا میں بچہ نہیں ہوں کہ کوئی اٹھا کر مجھے لے جائے گا، کوئی جن بھوت ہی ایسا کر سکتا ہے اور کسی انسان میں اتنی

بچتا تھا اور کچھ نہیں۔

دریا کی موجوں کے ساتھ کھلتی کول نے اپنے محبوب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ سوچوں میں غرق دیکھا تو تیرتی ہوئی دریا کے کنارے آئی اور زاہد کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”زاہد جان کیا بات ہے؟ کیوں رو رہے ہو؟ کن سوچوں میں گم ہو؟“
کول کی اس بات نے سوچوں کے طاعن کو توڑا تو زاہد چونک گیا اور جھوٹی مسکراہٹ لیں پر بکھیرتے ہوئے بولا۔ ”کول اپنے اوپر بیٹے ظلمات نظروں کے سامنے آ گئے تھے۔“
”جانتی ہوں زاہد جان آپ کے دکھ کو غم کو درد کو۔ چلیں چلتے ہیں گاؤں۔ سنبھال لوں گی سبھی کو نچوڑ ڈالوں گی سبھی کا خون۔ آپ پریشان نہ ہوں غمزدہ نہ ہوں۔ جب تک جسم میں سانس ہیں قدم قدم پر ساتھ دوں گی۔“

زاہد کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ جاگیرداروں کے چہرے نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ اسی وقت دونوں دریا کو عبور کرتے ہوئے گاؤں کی طرف چل دیئے گاؤں کے قبرستان میں جا ڈیرا لگایا لیکن رات کے اہل خوفناک سناٹے میں کوئی بھی شخص دکھائی نہ دیا۔ یہ قبرستان اس قدر خوفناک اور بھیساں تھا کہ دن کے اجالے میں بھی خوف آتا تھا۔ دونوں یہاں چھپے رہے۔ کول ناگن بنے ریگتے ہوئے قبرستان سے باہر نکلی اور باہر کا منظر دیکھا۔ لوگوں کے چہروں سے اڑی ہوئی رونق دیکھ کر سمجھ گئی کہ گاؤں والے خوفزدہ ہیں ڈرے ہوئے ہیں۔ سانپوں کی کہانی بھی انہوں نے سن لی تھی۔ ان کا حملہ وہ جان چکے تھے اور دوسرا نمسے کا خوف ان کے سروں پر سوار تھا اور جاگیردار بھی گرج رہا تھا۔

اس ظالم حینہ کو میں معاف نہیں کروں گا۔ اس نے صرف میرے دوست کی آنکھیں نکالی ہیں لیکن میں اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔ اس کے خوبصورت جسم کو آگ کی بجلی میں پھینک کر جلا کر راکھ بنا دوں گا۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ ایسی حرکت بھی کر سکے گی ورنہ جیسے اسے قابو کیا تھا اسے قتل بھی کر سکتے تھے۔

یہ وہی حینہ ہے جو دریا کنارے ملی تھی۔ جو اس ظالم نمسے کی محبوبہ بنی ہوئی ہے۔ اس نے ہی نمبردار کے سامنے انکار کر کے ہمارے سر نیچے جھکائے تھے لیکن دونوں بھائی جاگیردار کی باتیں سننے کے بعد خاموش تھے۔ اگر اس دن وہ بھی دریا کنارے ہوتے اس حینہ کو دیکھتے تو ہو سکتا تھا کہ اب تک وہ حینہ خون میں ڈوب چکی ہوتی۔ لیکن بھیا اس کا چہرہ بتائیں کیا

دیکھ نہ لیتے کھانا نہ کھاتے۔ کول نے بھی زاہد کو اپنے دل میں ایسا بسایا کہ ہر آدمی میں اسے زاہد کی صورت ہی دکھائی دیتی۔ دریا کی لہروں میں بھی اپنے محبوب کا عکس ہی دکھتی۔ چلتے پھرتے خیالوں میں تصورات میں بھی اپنے محبوب سے ہی باتیں کرتی۔ دونوں پیار میں بہت آگے نکل گئے۔ ہر رات کول ناگن کے روپ میں زاہد کو دریا کو موجوں کو چیرتی ہوئی دوسرے کنارے تک لاتی اور رات بھر یہ میدانوں میں گھوما کرتے۔ ہاتھوں میں ہاتھ دیتے آنکھ پجولی کھیا کرتے۔ کول کو زاہد کی صورت میں اپنا پیار مل گیا تھا اور زاہد کو کول کی صورت میں اپنا پیار۔ کئی بار کول نے دشتوں پر حملہ کیا انہیں ڈسا خون چوسا۔

ایک رات دونوں درخت کے نیچے بیٹھے باتوں میں مگن تھے کہ کول بولی۔ ”زاہد جان کیوں نہ اب ہم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایک ہو جائیں ایک دوسرے کو حقیقت میں اپنا لیں۔“
”ارے بنگی اب بھی ہم ایک ہیں دو تو نہیں۔ تم میرے پاس ہو۔ میں تیرے پاس۔“ میرا مطلب ہے کہ حالانکہ زاہد کول کا مطلب جان چکا تھا کہ یہ کیا کہنا چاہتی ہے؟
”کیا ہے مطلب آپ کا بکنی کہ ہم دونوں۔۔۔۔۔۔“

ساتھ ہی کول شرما گئی۔ اپنا آئینل دانتوں تلے دبا دیا۔

زاہد کو کول کی یہ ادا اتنی اچھی لگی دل کو ایسی بھائی کہ قہقہے لگانے لگا اور کول شرماتے ہوئے دریا کی طرف بھاگ نکلی۔ چاند کی چمکتی روشنی میں کول دریا کی لہروں سے آنکھ پجولی کھیتی رہی اور زاہد اسے پانی میں ڈھونڈتا رہا۔ زاہد نے بھی اپنے دل میں کول کو ہمیشہ کیلئے پانے کا عہد کر لیا تھا کیونکہ یہ ہی اس کی زندگی تھی یہی اس کی قیمت تھی یہی اس کا پیار تھا یہی اس کی چاہت تھی اور یہ اس کا سبھی کچھ تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے وہ کسی دوسرے کا کیسے تصور کر سکتا تھا۔ ویسے بھی کول ہمت والی تھی۔ حسن میں لا جواب تھی۔ انسانی حسن سے کہیں زیادہ بڑھ کر تھی۔ طاقت میں اس قدر زیادہ تھی کہ لہجوں میں ہی دشتوں کا خون نچوڑ لیتی تھی۔

زاہد کو اپنی تمام کہانی یاد تھی۔ پانچوں بہنوں کی صورتیں یاد تھیں۔ جاگیرداروں کے ہاتھوں باپ کا قتل یاد تھا۔ خود کارسیوں سے باندھ کر گلیوں میں گھسیٹا یا دھما دھما کر پایا کی صورت یاد تھی جس سے اس نے درد حاصل کیا تھا۔ بابا کا چہرہ تصورات میں دکھائی دیا تو اس کی آنکھیں بہہ نکلی۔ بابا کو قتل نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اسے قتل کر کے اچھا نہیں کیا تھا۔ کتنا پیار کرتا تھا وہ اس سے۔ بیٹا بیٹہ کہہ کر پکارتا تھا۔ دشتوں سے مقابلہ کے طریقے بتاتا کرتا تھا۔ کمزور دل کو مضبوط بنانے کا عمل بتاتا کرتا تھا لیکن میں نے اسے قتل کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی لیکن اب صرف

ان پر حملہ کرنا، قتل کرنا بھول گیا۔ کانپتے جسم کے ساتھ، جلتی آنکھوں کا نشانہ بنے وہ بالکل زاہد کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ زاہد کی جلتی آنکھوں نے اسے جکڑ لیا، بے بس کر دیا۔ یہ ان بزرگ کی عنایت کردہ آنکھیں تھیں جنہیں زاہد نے خود مارا تھا۔ اگر مرتے وقت بزرگ اپنی آنکھوں کی روشنی، جلن اسے عنایت نہ کرتے تو ہو سکتا تھا کہ زاہد کمزور کا کمزور رہتا۔ ماں باپ بہنوں کی طرح وہ بھی قبر میں اتر گیا ہوتا۔ لمبی لمبی مونچھوں والا اپنی جگہ ساکت سامنے کھڑے زاہد کی آنکھوں کو گھورتا رہا۔ جسم پگھلتا رہا، جلتا رہا لیکن نہ تو تڑپ سکا اور نہ ہی چیخ سکا۔ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد زاہد نے سر پر خوف کو سوار کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئل اس شخص کے پیچھے گاؤں والے قبرستان میں آ پہنچیں گے۔ ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔“

زاہد کی بات سن کر کوئل بھی پریشان ہو گئی کیونکہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر یہ گھناؤنے قبرستان سے باہر نہ نکلا تو ضرور اسے تلاش کیا جائے گا۔ اسے جلانے پگھلانے کے بعد عجیب خدشات ذہن و دماغ میں ابھرتے رہے لیکن کوئل نے دل کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

”زاہد جان یہ بھی تو ہو سکتا ہے یہ ہمارے پیچھے نہ آیا ہو ہماری تلاش میں نہ آیا ہو، ویسے ہی آیا ہو۔“

کوئل کی یہ بات بھی درست تھی۔ زاہد کے دل کو لگی تھی لیکن قبرستان سے باہر کی افراتفری یہ بات ظاہر کر رہی تھی کہ ضرور کچھ نہ کچھ ہوگا۔ تب دونوں کانٹوں بھری جھاڑیوں کو اونچے اونچے سروٹوں، بے ترتیب درختوں اور اونچی نیچی قبروں کو چیرتے ہوئے قبرستان کے دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگے۔ سورج ہلکی روشنی کے ساتھ غروب ہونے کے مراحل میں تھا اور یہ دونوں چاہتے تھے کہ کسی طرح اندھیرا پھیل جائے اور بھاگتے ہوئے جزیرے تک پہنچ جائیں۔ ان کے خدشات غلط نہ تھے، صبح تھے۔ قبرستان سے باہر لوگوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ایک افراتفری تھی۔ جیسے کسی کی تلاش ہو۔ یہ منظر دیکھتے ہی دونوں کے دل زلزلے کی مانند ہلنے لگے۔ جسم کانپنے لگے لیکن کوئل نے ہمت کرتے ہوئے ناگوں سانپوں کو پکارا تو ہر طرف سے ریگتے ہوئے سانپ قبرستان سے باہر بھاگنے لگے۔ گولیاں چلنے لگیں چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ گولیاں شاید سانپوں ناگوں پر چلائی جا رہی تھیں اور چینیں ناگوں کو دیکھ کر خوف سے بلند ہو رہی تھیں۔ بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دی جانے لگیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے روکے بیٹھے رہے۔ دل میں خوف تھا، چہروں پر پریشانی تھی۔ جب سورج غروب ہوا۔ اندھیرا پھیلنے لگا، خوفناک بھیانک قبرستان کے باہر سناٹا چھانے لگا، انسانی آوازوں کا آنا بند ہو گیا، ہر

ہے؟ وہ دریا کنارے رہتی ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ کون ہے؟

”کسی کو علم نہیں جو مجسمہ لوگوں کو جلاتا ہے، پگھلاتا ہے۔ اس کے قریب رہتی ہے۔“ یہ وہی زاہد ہے جس کے گھر کو آگ لگائی تھی۔ رسیوں سے باندھ کر گلیوں میں کھینچا تھا۔ اس نے ہی چچا نمبر دار ابا اور بھائی کو جلایا ہے، پگھلایا ہے لیکن ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔ وہ اکیلے ہو کر بھی ہم سے ٹکر لے رہا ہے اور ہم ہیں کہ اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے۔

”پھیل جاؤ دریا کنارے ختم کر ڈالو۔ اسے اور وہ حینہ اسے تو باندھ کر میرے قدموں میں لاؤ میں اسے اپنے پاؤں کی جوتیاں چٹوانا چاہتا ہوں۔ اس کی اکڑی گردن کو پاؤں میں رکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے حسن کو بھیانک بنانا چاہتا ہوں لیکن کوشش کے باوجود بھی وہ لوگ ان دونوں کو تلاش نہ کر سکے۔

زاہد اور کوئل بھی ان لوگوں کی باتیں سن چکے تھے۔ ناگن کے روپ میں کوئل نے ہر بات زاہد کو بتا دی تھی کہ وہ صرف آپ کے ہی نہیں میرے بھی دشمن ہیں۔ میرے حسن کو بھی مٹانا چاہتے ہیں۔ آپ کو مجھ سے جدا کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے پاؤں میں میرا سر رکھنا چاہتے ہیں۔ میرے جسم پر جلتا تیل پھینکنا چاہتے تھے لیکن جان مجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں ہے میں چاہتی ہوں کہ آپ کے جسم کو خراش تک نہ آئے۔

زاہد کی آنکھیں بھیگ گئی۔ بولا ”کوئل یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارا حسین چہرہ کوئی بگاڑے۔“ ہم یہاں اب نہیں رکھیں گے۔ میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا۔ یہاں رہنا موت کو آواز دینا ہے۔ رات کی تنہائی میں دوبارہ جزیرے پر چلے جاتے ہیں اور وہیں رہیں گے۔ یہ لوگ کبھی بھی وہاں تک نہ پہنچیں گے۔ کبھی بھی ہم دونوں کو جدا نہ کر سکیں گے۔ کبھی بھی ہمیں ایک دوسرے سے دور نہ کر سکیں گے۔ دشمنوں کے بیچ زندگی گزارنا مشکل ہے۔

زاہد کی زبانی اپنے متعلق پیار بھری باتیں سن کر کوئل شرما گئی۔ اتنے میں خوفناک قبرستان کے اونچے اونچے سروٹ، کانٹوں بھری جھاڑیاں ہلکی دکھائی دیں۔ چھپے بیٹھے زاہد اور کوئل دونوں کے چہرے خوف سے لرزے لگے۔ جلد ہی کوئل نے اپنا روپ بدل لیا ایک ناگن بننے آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو گئی۔ زاہد کی آنکھیں بھی بھڑکنے لگیں۔ گھور گھور کر ہلٹے ہوئے سروٹوں، کانٹوں کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں جاگیردار کا ایک وفادار لمبی لمبی مونچھوں والا نظروں کے سامنے آ گیا لیکن زاہد کی جلتی آنکھوں کو دیکھتے ہی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

دیکھنا تھا پیار کیا تھا ایک اشتیاق بنا رہا، بہادر طاقتور بنا رہا اور جب کسی کودل میں بسالیا، اپنا بنالیا، آنکھوں میں سجالیا تو دل کمزور ہو گیا، ڈر پوک ہو گیا، اپنی زندگی بچانے کی فکر کرنے لگا۔ اب اسے ایک کول کی جدائی کا دکھ تھا اور دوسرا اپنی موت کا جو اسے کسی بھی وقت اپنے مضبوط پنجوں میں لے سکتی تھی۔ کب تک وہ بچوں سے گزارا کرتا، کب تک جانوروں جیسا کھانا کھاتا، یہ جزیرا بھی ایسا تھا کہ جس کا کوئی بھی حصہ کنارے سے نہ ملتا تھا۔ اگر دریا میں پانی نہ ہوتا تو بھاگ کر دوسرے کنارے پہنچ جاتا اور اپنے پیار کو ڈھونڈ نکالتا لیکن اس دریا کا پانی تو ٹھاٹھیں مارا بہہ رہا تھا اور صدیوں سے ایسے ہی بہتا چلا آ رہا تھا۔ نہ تو اس کی گہرائی کا علم تھا اور نہ ہی چوڑائی کا۔ جدھر نظر ڈالو پانی ہی پانی تھا۔ دور سے وہ کنارہ دکھائی دیتا تھا جہاں کول جا کر گم ہو گئی تھی۔ جہاں اس کا پیار جا چھپا تھا جہاں ہر سو پھیلے اس کے دشمن تھے اور دشمنوں کے چھ چلتے پیار کو انہوں نے روند ڈالا تھا۔ زاہد کنارے بیٹھا اپنی قسمت سے متعلق سوچ رہا تھا آنسو بہا رہا تھا اپنی آنکھوں کے پانی کو بھی دریا کی لہروں میں ڈبو رہا تھا۔ چند دن گزر گئے لیکن کول نہ آئی۔

ایک دن وہ دریا کے کنارے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا کہ اسے پانی میں بہتے تیرتے کئے ہوئے ٹاگ سانپ دکھائی دینے لگے۔ ان کئے ٹاگوں سانپوں کو دیکھ کر کر زاہد تڑپ کر رہ گیا۔ ان کے ٹکڑوں کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ گاؤں والوں نے ٹاگوں سانپوں کے ٹکڑے کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ بکھری لاشوں کا بدلہ لینا شروع کر دیا۔ ان کئے ٹاگوں کے ٹکڑوں میں اس کی محبوبہ بھی ہو سکتی ہے۔ ان ٹکڑوں نے زاہد کی آنکھوں سے انتظار کھینچ لیا۔ امید کی آخری کرن بھی دم توڑ گئی۔

وہ بے بس آنسو بہاتا رہ گیا۔ کول کا پیار نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ اس کی میٹھی میٹھی باتیں یاد آنے لگیں۔ شوخ اور چٹیل ادا میں یاد آنے لگیں۔ اسے کیا خبر تھی کہ اتنی جلد اسے جدائیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کول سے متعلق کتنے اس نے خواب دیکھے تھے، کتنے سہانے سنے دیکھے تھے بہت جلد اسے اپنا لیتا چاہتا تھا لیکن ان ظالموں نے اس کا پیار بھی چھین لیا۔ تصورات میں ہی اپنی جان اپنی کول کو مردوں میں شمار کرتے ہوئے آنسو بہانے لگا۔ اب ایک تڑپ دل میں پیدا ہو گئی پہلے تو گاؤں والوں سے اپنی بہنوں اپنے ماں باپ کا بدلہ لیتا رہا تھا لیکن اب اس اشتیاقی جنگ میں اس کی کول بھی شامل ہو گئی تھی۔ اس کا پیار بھی شامل ہو گیا تھا۔ جن لوگوں نے اس کی ہنسی مسکرائی زندگی کو آنسوؤں میں بھگویا تھا ان کو ہمیشہ ہمیش کے لئے جلا دینا

طرف سکوت چھا گیا اور جب چاند ابھرنے لگا تو کول نے قبرستان سے باہر نکل کر حالات کا جائزہ لیا اور ہر طرف سے تسلی کر لینے کے بعد زاہد کو لئے چل دی۔

راستہ بھر میں کئی گاؤں آئے لیکن سبھی سنسان اور ویران دکھائی دیتے۔ شاید سبھی گاؤں والے ان دونوں کے خوف سے گھروں میں گھسے ہوئے تھے۔ چھتوں پر دکھائی دے رہے تھے لیکن گاؤں سے باہر کچھ نہ تھا۔ دور دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں جو خطرے کی نشاندہی کر رہے تھے لیکن لوگ اپنی جانیں بچائے گھروں میں گھسے رہے۔

یہ دونوں دریا کنارے پہنچ گئے۔ دشمنوں کے چنگل سے نکل آئے۔ دریا عبور کیا۔ جزیرے پہنچ کر سکون کا سانس لیا۔ یہاں پہنچتے ہی زاہد بولا۔

”کول آج کے بعد نہ تم دریا کے دوسرے کنارے جاؤ گی اور نہ میں دوسرے کنارے۔“ موت ہے دشمن کے ہر جگہ ڈیرے ہیں ہر کوئی ہماری گردنیں اڑانے پر تیار ہوا ہے۔ لیکن کول کی دوسرے کنارے جانا مجبوری تھی۔

کھانے وغیرہ کا بندوبست اس کے ذمہ تھا۔ وہ کیسے لاتی صرف وہی جانتی تھی۔ چند دن گزر گئے تو ایک دن کول دوسرے کنارے گئی تو واپس نہ آئی۔ دن گزر گیا رات بیت گئی لیکن واپس نہ آئی۔ زاہد کا دل دھڑکنے لگا، خدشات اور دوسوں نے دماغ کو بجڑ لیا۔ جزیرے میں کھڑا بار بار دریا کی لہروں کو دیکھتا، تیز بہتے پانی کو دیکھتا کہ شاید ابھی اس کی جان واپس آجائے لیکن ایسا نہ ہوا۔ ایک ہی دن رات کی جدائی نے زاہد کے جسم کا آدھ سے زیادہ خون نچوڑ لیا۔ پاگوں کی طرح دیوانوں کی طرح جزیرے میں بھاگتا دریا کنارے آتا۔ آنکھیں پانی پر لگی رہتیں لیکن کول دکھائی نہ دے پاری تھی۔ وہ خود اس کو تلاش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ راہیں ہی دیکھ سکتا تھا۔ بار بار پھری ہوئی اچھلتی موجوں کو بہتے پانی کو کیسے عبور کر سکتا تھا۔ صرف تڑپ سکتا تھا انتظار ہی کر سکتا تھا۔ لوگوں کا خیال اس کے دل کو زخمی کر رہا تھا ریزہ ریزہ کرتا تھا۔ کہیں ظالم گاؤں والوں نے اسے ختم تو نہیں کر دیا، کہیں اس کے ٹکڑے تو نہیں کر دیئے اسے آگ کی بھٹی میں جلا تو نہیں دیا، اگلے تیل میں پکھلا تو نہیں دیا، اس کے جسم کے ٹکڑے کتوں کے آگے تو نہیں ڈال دیئے۔

دو راتیں گزر گئیں لیکن اس کی محبوب آتی دکھائی نہ دی تو وہ درختوں پر لگے پتے چبانے لگا۔ آنسو بہانے لگا۔ پیار بھی عجیب چیز ہوتی ہے مل جائے تو جدائی کا غم کھائے جاتا ہے۔ نہ ملے تو تڑپ دل میں اٹھتی رہتی ہے۔ یہی حال زاہد کا تھا جب تک خوبصورت چہرہ

چاہتے تھا۔ لہذا دریا عبور کرنے کے لئے مختلف پلان بنانے لگا اور اٹھ کھڑا ہوا اور وسیع پھیلے ہوئے جزیرے کا چکر لگانے لگا۔ چند ایک پودے پھلوں والے مل گئے۔ خوراک کا مسئلہ حل ہو گیا تھا لیکن سوچیں پوری طرح کول کے پیار میں جکڑی ہوئی تھیں۔ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ چلتے چلتے وہ جزیرے کے بالکل وسط میں جا پہنچا۔ سامنے بھیانک اور خوفناک شکلوں والے چند آدمیوں کو دیکھ کر کانپ کر رہ گیا لیکن جب انہیں غائب ہوتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ انسان نہیں ہیں جنات ہیں۔ یہ بات تو وہ جانتا تھا کہ جنات اس کو ڈرا نہیں سکتے، خوفزدہ نہیں کر سکتے، جان نہیں لے سکتے لیکن اس کے باوجود بھی خوف اس کے دل میں اتر گیا۔ ساکت کا ساکت کھڑا رہا۔ کافی دیر تک کھڑا رہنے کے بعد ہمت کر کے اس جگہ تک گیا جہاں جنات کھڑے تھے۔ یہ ایک گہری کھائی تھی جس میں کانٹوں سے بھری جھاڑیاں تھیں۔ ان کانٹوں میں اس گہری کھائی میں ایک خوبصورت دوشیزہ کو بے ہوشی کی حالت میں خون میں بھیگی ہوئی زنجیروں میں جکڑی دیکھ کر چونک کر رہ گیا۔ بار بار اس کے حسین چہرے کو دیکھتا رہا۔

یہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ کس نے اسے خونی زنجیروں سے باندھ کر یہاں خاردار گہری کھائی میں پھینکا تھا؟ زاہد سوچوں میں الجھ گیا۔ کبھی خاردار جھاڑیوں کو دیکھتا اور کبھی بے ہوش پڑی شہزادی کے چہرے کو۔ نہ تو نیچے کھائی میں اترنے کا راستہ تھا نہ اوپر چڑھنے کا۔ یہاں کون آیا تھا؟ لیکن جب وہاں کھڑے جنات کا خیال آیا تو ہر بات سمجھ گیا کہ یہ شہزادی جنات کے قبضہ میں ہے۔ انہوں نے ہی اسے جکڑا ہوا ہے۔ انہوں نے ہی اسے لہو لہان کیا ہے۔ پہلے تو اس کا دل چاہا کہ اسے آواز دے کر پکارے لیکن پھر خاموش رہا۔ اس حسن پری کو دیکھ کر چند لمحوں کو وہ اپنی کول کا حسین چہرہ بھی بھول گیا۔ حالانکہ نیلی آنکھوں والی کول بھی حسن میں کم نہ تھی لیکن یہ شہزادی بے ہوشی کے عالم میں بھی یوں اسے دکھائی دے رہی تھی جیسے چاند زمین پر اتر آیا ہو۔

اس نے اپنے دل کو بہت ضبط کیا کہ وہ اسے نہ پکارے لیکن وہ رہ نہ سکا اور آوازیں لگانا شروع کر دیں لیکن بے ہوش پڑی شہزادی نے نہ تو آنکھیں کھولیں اور نہ ہی زاہد کی آوازیں کا جواب دیا۔ بے ہوش کی بے ہوش بے سدھ پڑی تھی۔ زاہد کے دل میں ایک عجیب الجھل برپا تھی نجانے کیوں وہ اسے پہلی ہی نظر میں اچھی لگی تھی۔ وہ اسے ہر حال میں جنات کے قبضہ سے چھٹکارہ دلانا چاہتا تھا۔ اسے آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اپنا منتر ختم نہ کرتا

تو ہو سکتا تھا کہ جنات خود اسے آزاد کر دیتے لیکن منتر کو بھی اس نے ختم کر ڈالا تھا۔ جنات کو جکڑنے والا کام چھوڑ دیا تھا۔ کھائی میں نیچے اترنے کا راستہ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ کوئی ایسی جگہ نہ تھی جسے پکڑ کر وہ نیچے اترتا اور اسے باہر نکالتا۔ اسی کھائی کے کنارے اس نے اپنا ڈیرا بجا لیا کہ یہ شہزادی اس کی نظروں کے سامنے رہے۔ جنات اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ یہاں سے دریا کا دوسرا کنارہ دھندلا دھندلا دکھائی دیتا تھا۔ پتہ چل جاتا تھا کہ دریا کے دوسرے کنارے کیا کچھ ہو رہا ہے۔ کول کو تو وہ مردہ سمجھ بیٹھا تھا۔ ناگوں کے تیرتے ٹکڑوں میں اس کے ٹکڑے بھی شمار کر بیٹھا تھا۔ شاید کول کے ساتھ اتنا ہی ملاپ تھا اتنا ہی ساتھ تھا لیکن کول کے پیار کو دل سے نہ نکال سکا۔ اس کی اداؤں کو ذہن سے نہ ہٹا سکا۔ اس کے حسین چہرے کو آنکھوں سے نہ ہٹا سکا تھا۔ دوسری طرف اس بے ہوش پڑی زنجیروں میں جکڑی شہزادی کا چہرہ بھی دل میں اترتا چلا گیا۔ اس کا لا جواب حسن آنکھوں میں سا گیا۔ اسے دیکھ کر دل مچلتے لگا تھا۔ ایک انجانی سی مہک اپنے ارد گرد محسوس کرنے لگا تھا۔ بھوک پیاس سبھی کچھ بھول گیا تھا۔ کبھی بھاگتا ہوا دریا کنارے جاتا وہاں سے پانی منہ میں ڈال کر لاتا اور بے ہوش لیٹی ہوئی دوشیزہ کے اوپر پھینکتا، کبھی درختوں سے پھل توڑ کر اس کو مارتا کہ کسی طرح سے وہ ہوش میں آجائے لیکن اس کی ہر کوشش ناکام ہوتی جا رہی تھی۔ جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور سوچوں میں گم ہو گیا۔

رات آنکھوں میں ہی گزاردی صبح ہو گئی۔ صبح سویرے ہی سب سے پہلے اس حسینہ کا دیدار کیا لیکن وہ بے ہوش ہی تھی۔ جیسے پڑی تھی ویسی ہی حالت تھی۔ نہ ہی اس نے اپنے جسم کو جنبش دی تھی اور نہ آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کو بار بار دیکھنے کے بعد ایک سوچ اس کے دماغ میں گھسی۔ جس نے سر سے پاؤں تک اسے ہلا کر رکھ دیا کہیں یہ حسینہ بھی مروتو نہیں گئی؟ کہیں جنات کے یوں جکڑنے سے اس نے جان تو نہیں دے دی۔ جس طرح خاردار جھاڑیوں میں زخمی حالت میں پڑی ہے کہیں دنیا کی رونقوں کو الوداع تو نہیں کہہ گئی۔ اس سوچ نے اسے پریشان کر دیا، اداس کر دیا، اسے یہاں گہری کائی میں کوئی انسان نہیں پھینک سکتا تھا۔ نہ تو وہ دریا کی ابھرتی لہروں کو چیر سکتا تھا اور نہ ہی اس خوفناک جزیرے میں آنے کی ہمت کر سکتا تھا۔

اس جزیرے میں نہ تو بندر تھے نہ ہی کوئی اور خونی جانور۔ صرف سناٹا تھا، ویرانہ تھا، بے ترتیب درختوں کا جھرمٹ تھے، ہاں البتہ مگر کچھ سانپ اور پانی کی دوسری مخلوق یہاں آباد

ڈر خوف نہیں ہے ”کول اب مجھ سے جدا نہ ہوتا“ نظروں سے دور نہ ہوتا۔ ورنہ میں مری جاؤں گا تمہارے بنا۔ چند دن جدا رہ کر دیکھ لیا ہے جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ میں تمہیں بہت جلد اپنا لینا چاہتا ہوں۔ بہت جلد اپنے قریب کر لینا چاہتا ہوں۔“

زاہد کی اس بات پر کول پھر شرما کر رہ گئی۔ پھر سے اس ویران اور سنسان جزیرے میں ان دونوں کے قہقہے ابھرنے لگے۔ پیار بھری باتیں فضاؤں میں گونجنے لگیں۔ جب بھی کول کھانے پینے کا سامان لینے دوسرے کنارے جاتی تو نظریں اس کا تعاقب کرتی رہتیں۔ جب تک وہ واپس نہ آ جاتی اسے سکون نہ ملتا، چین نہ آتا۔ تین چار دن ایسے ہی بیت گئے۔ ایک دن جب کول دوسرے کنارے پہنچی تو زاہد کو کھائی میں شہزادی کا خیال آیا۔ بھاگتا ہوا کھائی کے پاس پہنچا۔ ابھی اسے ہوش میں لانے کی غرض سے آواز لگانے ہی والا تھا کہ اسے اوپر کھڑے کھڑے ہی اس شہزادی کے ہلتے ہوئے ہاتھ پاؤں دکھائی دیے۔ یہ منظر دیکھتے ہی زاہد خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ مری نہ تھی، زندہ تھی۔ کافی دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا پھر چلتا ہوا دریا کنارے آ گیا کیونکہ جب سے نمبرداروں نے کول کو زخمی کیا تھا اسے اسی کی فکر لگی رہتی تھی۔ نظروں میں اسی کا انتظار رہتا تھا۔ اسے نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اسے اپنی زندگی سمجھ بیٹھا تھا۔ دل ہی دل میں اس کی پوجا کرنے لگا تھا۔ دل ہی دل میں اس کی صورت کو اپنی نظروں میں سما چکا تھا۔ اسے اپنے ارد گرد جھومتی فضا میں دکھائی دینے لگتی تھیں۔ مہکتی خوشبوئیں محسوس ہونے لگتی تھیں۔

ادھر کول بھی دریا کی لہروں کو چیرتی ہوئی واپس جزیرے میں آ گئی۔ زاہد نے دور سے ہی کول کو آتے دیکھ لیا تھا۔ زاہد کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھتی تو مسکرا دی۔ اور کہا۔ ”جان آج بہت خوش ہیں لگتا ہے کوئی انہونی چیز مل گئی ہے۔“

”ہاں کول میں واقعی آج بہت خوش ہوں، دل چاہتا ہے ناچوں، بھنگڑا ڈالوں، گنگناؤں۔“

”آخر ایسی کون سی بات ہے مجھے بھی تو بتاؤ۔“

”اگر کوئی اور لڑکی میری زندگی میں آ جائے تو آپ کیا کریں گی۔“

زاہد کی اس بات پر کول نے پہلے تو ایک جھرجھری لی۔ رونے کو دل چاہا لیکن پھر خود کو سنبھالا اور کہا۔ ”زاہد جان میں تو آپ کی دیوانی ہوں آپ کو چاہنے والی ہوں، آپ پر اپنی جان قربان کرنے والی ہوں۔ اگر مجھ سے حسین، مجھ سے زیادہ پیار کرنے والی مجھ سے زیادہ

تھی۔ ان کی بھرمار تھی جو کبھی پانی میں گھس جاتی اور کبھی اس جزیرے میں چلی آتی۔ پندرہ راتیں گزر گئیں کہ ایک صبح سویرے زاہد کو دریا کے دوسرے کنارے کھڑی ہاتھوں کو ہلاتی ہوئی کول دکھائی دی۔ کول کو زندہ دیکھ کر زاہد کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ جی چاہا کہ وہ پانی میں کود جائے اور جا کر اس سے پوچھے کہ وہ کہاں چلی گئی تھی؟ کیوں ساتھ چھوڑ گئی تھی؟ کیوں اکیلا چھوڑ گئی تھی؟ لیکن ان لہروں میں کودنے کی ہمت نہ تھی لیکن ادھر کول پانی میں چھلانگ لگا چکی تھی اور جزیرے تک پہنچ رہی تھی۔

کنارے پر پہنچنے ہی زاہد نے کول پر سوالات کی بارش کر ڈالی۔

”کول کہاں چلی گئی تھی؟ کہاں عتاب ہو گئی تھی؟ کیوں مجھے بھول گئی تھی؟ کیوں میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی؟ کیوں مجھے تنہا چھوڑ گئی تھی؟ کیوں مجھ سے دور رہ کے مجھے تڑپاتی رہی ہو؟ دیکھ رہی ہو میری آنکھیں تمہاری واپسی کی راہیں دیکھ دیکھ کر پتھر اگئی ہیں۔ ان آنکھوں میں سے پانی ختم ہو گیا ہے۔“

کول جو شاید خود بھی اپنے محبوب کی جدائی میں آدھی ہو چکی تھی، صرف اپنے محبوب کا چہرہ ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی پٹلیں ہلکی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اس نے زاہد کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ اپنے پانچے کو تھوڑا سا اوپر سرکایا تو ٹانگ پر بندھی پٹی دیکھ کر زاہد تڑپ کر رہ گیا۔

”کول کیا ہوا ہے یہاں کس نے لگایا ہے یہ زخم؟“

”گوئی لگی ہے یہاں۔ پھرے ہوئے نمبردار نے مجھ پر وار کیا ہے۔ اگر میں چھیتی نہ تو آپ میری لاش.....“

اس سے آگے کہ کول کچھ بولتی زاہد نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ زاہد جان سانیوں ناگوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ بدلا لیا جا رہا ہے سانیوں ناگوں سے۔ شاید میری قسمت میں ابھی آپ کا پیار تھا بھی تو چمک گئی تھی ورنہ.....

”کول میں مجبور ہوں، تنہا ہوں، بدلہ نہیں لے سکتا ورنہ کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔“ زخم دیکھ کر زاہد کی آنکھیں بھر آئی لیکن کیا کر سکتا تھا چپ رہا۔

”کول سانیوں ناگوں کے کئے جسم دیکھ کر میری نظروں میں تمہارا مردہ چہرہ بھی گھومنے لگا تھا۔“

آپ کو بھی ٹکڑوں میں تقسیم تصور کرنے لگا تھا لیکن اب تم آ گئی ہو تو مجھے کسی چیز کا

پاگل سا ہو گیا تھا۔ کبھی تمہیں دریا کی لہروں میں تلاش کرتا تھا اور کبھی اس جزیرے میں اگی ہوئی اونچی اونچی گھاس میں۔ ایک رات چلتے چلتے میں جزیرے سے بہت دور چلا گیا۔ وہاں ایک جگہ عجیب قسم کی صورتوں والے انسانوں کو دیکھ کر ٹھنک کر رہ گیا۔ جنات کی بات سنتے ہی کوئل کانپ کر رہ گئی۔

زاہد جان یہ ایک لمبی اور عجیب کہانی ہے۔

کہانی کا نام سنتے ہی زاہد چونک پڑا جیسے کوئل اس شہزادی سے متعلق کبھی کچھ جانتی ہو۔

تبھی تو بولا۔ ”کوئل کہو کیا کہانی ہے ان جنات کی۔“

اپنے محبوب کے چہرے پر بے تابی، بے چینی اور بے قراری دیکھتے ہوئے نجانے کوئل کیوں اداس ہو گئی؟ کیوں اس کا چہرہ اتر گیا؟ کیوں آنکھیں بھر آئیں؟ شاید اس کہانی کے پیچھے دکھ تھے، آنسو تھے۔ یہ تو صرف کوئل ہی جانتی تھی تب وہ بولی۔

”زاہد جان یہ جو جنات آپ دیکھ رہے ہیں یہ صرف جنات ہی نہیں یہاں ایک گہری کھائی ہے اور اس میں ایک حسینہ جکڑی ہوئی ہے۔ اسے زنجیروں سے باندھا گیا ہے۔ خاردار جھاڑیوں میں بے بس پڑی ہوئی یہ حسینہ جن زادی ہے۔“

جن زادی کا نام سنتے ہی زاہد چونک کر رہ گیا۔ وہ تو اسے انسانی لڑکی سمجھا تھا اور چہرے کے حسن، لباس کی شان و شوکت سے کسی بادشاہ کی ملکہ سمجھ بیٹھا تھا لیکن جن زادی کا نام سنتے ہی ایک دفعہ وہ لرز کر رہ گیا۔

”زاہد جان اسے باہر نکالنے کی نہ جنات میں طاقت ہے اور نہ ہی انسان اس کھائی میں اتر سکتے ہیں۔ یہ عاشق ہے آپ کی۔“

کوئل کی زبان سے ایک نیا انکشاف سن کر زاہد کی آنکھیں چمک اٹھیں اور چونکتے ہوئے کہا۔ ”میری عاشق۔“

”ہاں زاہد جان۔“ کوئل کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ راز ظاہر کر کے شاید اسے اپنی بربادی، اپنی ویرانی، محبوب سے جدائی کی کہانی یاد آنے لگی تھی۔ زاہد جان یاد کریں جب آپ گرد بابا کے پاس ورد کیا کرتے تھے تو کسی کے قدموں کی آہٹ سنا کرتے تھے، بیٹھے بیٹھے تہمتیں سنا کرتے تھے ناچنے کی آوازیں سنا کرتے تھے لیکن اس طرف توجہ نہ دیتے تھے کہ آپ کے ورد میں خلل نہ پڑے آپ کا مشن ادھور نہ رہ جائے آپ اپنے مقصد میں ناکام نہ ہو جائیں۔ یہ

آپ کو چاہنے والی مل جائے تو خوشی سے اسے اپنانے کی حامی بھریں گی۔ جان مجھے آپ کے لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ چاہئے۔ آپ کے حسین چہرے پر چمکتی ہوئی خوشی چاہئے۔“

کوئل کی اس بات پر زاہد کلکھلا کر ہنسا اور کہا بہت بڑا دل ہے۔ آپ کے اندر میں تو نہیں یونہی تنگ کر رہا تھا مذاق کر رہا تھا۔ چلو مسکرا دو اور کوئل مسکرا دی۔

دن بھر جزیرے میں گھومتے رہے۔ اس دوران اس شہزادی کا بار بار چہرہ زاہد کی نظروں کے سامنے گھومتا رہا کہ وہ کوئل کو بتائے یا نہ بتائے کہ وہ کون ہے؟ کس نے یہاں باندھا ہے؟ پھر یکدم زاہد کی چمکتی آنکھیں بہہ نکلیں۔ مسکراتے لب اداس ہو گئے۔ وہ تڑپ کر رہ گیا کیونکہ اس حسینہ کا نیکو خیال زاہد کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ چکا تھا، پچل پیدا کر چکا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ حسینہ کسی بادشاہ کی صاحبزادی ہو اور جن اسے اٹھا لائے ہوں۔

یہ ایسا خیال تھا کہ زاہد تڑپ کر رہ گیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ ایک حسرت بھری نظر کوئل پر ڈالی اور کہا کوئل میری بات سے آپ کے دل کو نہیں تو نہیں بچنی۔

نہیں جان ایسی بات نہیں ہے۔ کوئل میری زندگی کی صرف اور صرف تم ہی مالک ہو۔ تمہارے علاوہ اس دل میں کوئی دوسرا نہیں سا سکتا۔ آپ کے بغیر میں ادھورا ہوں، تنہا ہوں، اکیلا ہوں، نامکمل ہوں۔ دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ آج دریا کے دوسرے کنارے چلتے ہیں اور کسی علم والے سنے ملتے ہیں اور شادی کر لیتے ہیں۔ میں تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے دل کی رانی بنانا چاہتا ہوں۔

پہلے تو کوئل نے اپنے محبوب کی یہ بات سن کر شرماتے ہوئے دوپٹے کا آئینل دانتوں تلے دبایا لیکن دوسرے ہی لمحے لرزی جیسے اسے کرنٹ لگا ہوا۔

”نہیں زاہد جان شادی ضرور کریں گے لیکن ابھی نہیں میں نے دریا کے دوسرے کنارے کا حال دیکھ لیا ہے آپ کی اور میری دونوں کی ہی انہیں تلاش ہے۔ جگہ جگہ گھوم پھر رہے ہیں آپ کے دشمن۔ گاؤں میں اعلان ہو چکے ہیں وہ آپ کے کئے سر کے منتظر ہیں۔ میرے حسن بھرے چہرے کو بھی ایک صورت میں دیکھنے کے منتظر ہیں۔“

زاہد کی عقل میں کوئل کی تمام باتیں آ گئیں۔ موت کا خیال آتے ہی کانپ گیا اور اپنے قدم روک لئے۔ ایک رات جب دونوں ایک درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ پیار بھری باتوں میں مگن تھے۔ ایک دوسرے کے چہرے کا دیدار کر کے آنکھوں کی پیاس بجھا رہے تھے تب زاہد نے جنات والی بات چھیڑ دی کہ جب تم مجھ سے جدا ہو گئی تھیں تو میں

نے اس بزرگ کی میت پر اپنے عمل کی آخری رات پوری کی اور جنات وغیرہ پر قبضہ جمایا۔ آپ کی آنکھوں میں اس سے کہیں زیادہ چمک آگئی جو آپ گرو بابا کی آنکھوں میں دیکھا کرتے تھے اور ان سے ان کی آنکھوں کی چمک مانگا کرتے تھے۔ ان بزرگ کے الفاظ درست نکلے کہ بیٹا تم جسے چاہو گے جلا ڈالو گے، پکھلا ڈالو گے ویسا اب ہی ہوتا ہے۔

زاہد جان میں بھی ناگن سے انسانی روپ میں آگئی۔ اس شہزادی جیسا حسن اپنا لیا، اس جیسا جسم اپنا لیا لیکن اس نے اپنے حسن کو اور زیادہ کر لیا۔ میں آپ سے اس قدر محبت کرنے لگی تھی کہ دل چاہتا تھا کہ آپ مجھ سے ایک لمحہ بھی جدا نہ ہوں لیکن میری یہ محبت یکطرفہ تھی لیکن میرے دل میں محبت کی آگ تھی تب میں نے ایک دن اپنا آپ آپ پر ظاہر کر دیا اور لحوں میں ہی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ پہلی نظر میں ہی یہ بات جان گئی کہ آپ مجھے ضرور اپنا میں گے لیکن کچھ آپ کو تڑپانا چاہتی تھی۔ آپ کے دل میں اپنی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دینا چاہتی تھی۔ سو میں کامیاب ہو گئی۔ آپ کو اپنے قریب کر لیا لیکن اس شہزادی کا خیال آتے ہی میں تڑپ جاتی، چھپ چھپ کر آنسو بہاتی کہ اگر آپ نے اس کا حسن دیکھ لیا تو ضرور اسے زنجیروں سے آزاد کر لیں گے کیونکہ آپ کے پاس علم تھا۔ سب کچھ کر سکتے تھے لیکن جب آپ نے اپنے علم کو چھوڑ دیا تو تب مجھے سکون ملا لیکن میں نے اس راز کو راز ہی رکھا۔

زاہد جان میں مجرم ہوں آپ کی کہ آپ سے اس شہزادی کا ذکر نہ کیا۔ جان میں خود غرض ہوں اپنی محبت میں ملاوٹ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے حسین لبوں پر آپ کا نام نہیں سن سکتی تھی۔ یہ میں نے جان بوجہ کر کیا ہے۔ آپ کی جدائی کا غم برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ساتھ ہی کوئل بلک پڑی۔

زاہد نے اسے دلا سہ دیا۔ کبھی نہ چھوڑنے کا وعدہ کیا تو کوئل بولی۔

”آپ کو وہ جگہ دکھاؤں۔“

زاہد نے تو جگہ پہلے ہی دیکھ لی تھی لیکن انجان بننے ہوئے کوئل کے ساتھ چل دیا۔ نیچے گہری کھائی میں اپنی محبوبہ کو خون میں بھیگی، لت پت شہزادی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے نیچے کھائی میں گر کر سیدھے اس حسن پری کے سرخ گالوں پر پڑے۔ کافی دیر تک وہ کبھی کوئل کو اور کبھی جن زادی کو دیکھتا رہا۔

اتنے میں کوئل چلائی زاہد دیکھو۔ جب زاہد نے دور دریا کے دوسرے کنارے کھڑے لوگوں کو دیکھا اور دریا کے پانی پر کشتی کو پھینکتے دیکھا تو لرزے لگا۔ موت سر پر سوار

سوچ کر آپ اسے صرف جڑیل سمجھتے رہے لیکن یہ آپ کی عاشق بن چکی تھی۔ آپ کی حفاظت میں قدم قدم آپ کے ساتھ چلا کرتی تھی اور جب آپ مجسمہ بنے۔ مجسمہ کا نام سنتے ہی زاہد ایک مرتبہ پھر چونک گیا۔

”کیا کہا کوئل مجسمہ“

”ہاں زاہد جان! آپ نہیں جانتے بزرگ کو قتل کرنے کے بعد آپ ساکت ہو گئے تھے۔ ہلنے جلنے سے معذور ہو گئے تھے۔ صرف آپ کی آنکھیں کام کرتی تھیں جو ان بزرگ نے عنایت کی تھیں ورنہ نجانے آپ زندہ بھی نہ بچتے۔ جب آپ مجسمہ بنے تو یہ غیبی قہقہے لگانے والی رقص کرنے والی آپ کی حفاظت کرنے والی بے انتہا حسن اپنا ظاہر ہو گئی۔ اس کا حسن دیکھ کر میں بھی اسے دیکھتی رہ گئی۔ یہ آپ کی حفاظت کیلئے آپ کے ارد گرد گھومنے لگی۔ زاہد بہان میں بھی دل ہی دل میں آپ کی پوجا کرنے لگی تھی۔ آپ سے پیار کرنے لگی تھی۔ ابھی ناگن کے روپ میں تھی اور زندگی کے ان مراحل میں تھی کہ ایک نئی صورت اپنانے والی تھی اس شہزادی کو دیکھتے ہی میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اس کا حسن میں اپناؤں گی، اس جیسا جسم ہی اپناؤں گی، اس کی محبت مجھ سے بڑھ کر تھی۔

یہ آپ کی حفاظت کیا کرتی تھی۔ آپ کے بالوں کو سنوارا کرتی تھی لیکن علم والوں سے ڈرا کرتی تھی۔ گاؤں والے آپ کو ختم کرنے کے لئے، آپ کی جلتی آنکھوں کو بے نور کرنے کے لئے علم والوں کو بلاتے رہے کیونکہ آپ کی جلتی آنکھوں سے کئی گاؤں والے جلے تھے۔ نمبردار جاگیردار ان کا بیٹا بھی آپ کی آنکھوں کے باعث جل پھلے تھے۔ ان کے طیش عروج پر تھے۔ وہ اپنے بڑوں کی موت کا بدلہ لینے کیلئے نئے نئے حربے سوچتے اور جب علم والا آتا آپ کو بے نور کرنے کی کوشش کرتا اور جس دن وہ آخری بار اپنے منتر پڑھتا تو میں اپنے بل سے نکل کر اسے ڈس لیتی، اس کا خون نچوڑ لیتی۔ یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ آپ کا خاتمہ ہو۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی آپ کو اذیت دیتا۔ مجھ سے کیسے برداشت ہو پاتا۔

دو علم والوں کا میں نے خاتمہ کر دیا آخر کار آپ کو دریا میں پھینک دیا گیا۔ میں بھی قبرستان سے اپنا ڈیرہ اٹھا کر دریا کنارے آگئی۔ یہ حینہ بھی آگئی لیکن یہاں جس بزرگ نے آپ کو بے نور کرنے کی کوشش کی سب سے پہلے اس نے آپ کی اس عاشق، اس مہ جبین، اس حسن پری کو جکڑا اور یہاں کھائی میں لا پھینکا۔ تب سے وہ یہاں ہے اور میں نے آخری روز اس بزرگ کا بھی خاتمہ کر دیا۔ آپ کا جسم بھی حرکت میں آ گیا۔ ہاتھ پاؤں ہلنے لگے اور آپ

وہ چیخی۔ ”زاہد جان تم اپنا خیال رکھنا۔ انسان آپ کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ آپ کو قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمت نہ ہارنا اگر میں آزاد ہوگئی تو ایک ایک سے آپ کا بدلہ لوں گی“ خاک میں ملا کر رکھ دوں گی سب کو زمانے سے ٹکرا جاؤں گی طوفان بن کر تباہ کر دوں گی سب کو۔ اپنا خیال رکھنا۔“ یہ کہہ کر شہزادی نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

اپنی شہزادی کی باتیں سن کر زاہد کی ہمت بڑھی۔ جب اس نے دریا کی طرف دیکھا تو دوسرے کنارے افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ شاید کسی نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ چھپتے پھر رہے تھے لیکن کشتی مسلسل جزیرے کی طرف بڑھتی آرہی تھی۔ وہ بھاگ کر دریا کنارے ایک درخت کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا قتل آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ بہنوں کی اموات یاد آگئیں۔ ان کے تڑپتے جسم دکھائی دینے لگے۔ جلتا ہوا گھر دکھائی دینے لگا۔ ظالم درندوں کے چہرے دکھائی دینے لگے۔ بہنوں کے گلے میں سرخ پھندے دکھائی دینے لگے۔ قبرستان میں بہنوں کی قبریں دکھائی دینے لگیں تو اس کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی۔ رگوں میں دوڑتا خون اٹپنے لگا۔ آنکھیں شعلے ابھارنے لگیں۔ وہی تیش، وہی تیزابیت آنکھوں میں چمکنے لگی جس سے انسان جل جاتے تھے پکھل جاتے تھے۔ وہ کشتی کو گھورنے لگا۔ جزیرے کے قریب آتی ہوئی کشتی یکدم جلنے لگی۔ تختوں سے آگ بھڑکنے لگی۔ اس میں سوار لوگوں کی چیخ و پکار شروع ہوگئی۔ چہروں کے رنگ بدل گئے اور خوف سے مدد کو پکارنے لگے۔

زندہ جل جانے کا خیال آیا تو دریا میں چھلانگیں لگا دیں لیکن باہر بھی موت دریا کے پانی میں بھی موت۔ زندہ جلنے سے بچتے بچتے ظالم لہروں کی لپیٹ میں آ گئے۔ غوطے کھانے لگے ڈوبنے لگے لمحوں میں ہی وہ سبھی دریا کے گہرے پانی میں غرق ہو گئے۔ دشمنوں کو مرتے دیکھ کر ڈوبتے دیکھ کر زاہد کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ آتش آنکھوں میں خوشی کی چمک ابھرنے لگی۔ ادھر کوئل بھی دریا کے دوسرے کنارے افراتفری، خوف و ہراس پھیلانے کے بعد دوبارہ جزیرے میں آگئی۔ آتے ہی ایک ناگن سے کوئل کے روپ میں بھاگتی ہوئی زاہد کے قریب پہنچی۔ اس کے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ دیکھ کر وہ بھی مسکرا دی اور کہا۔ ”زاہد جان شکر ہے کہ ایک بہت بڑی مصیبت سے بچ گئے ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔“

”ہاں کوئل تم سچ کہتی ہو انہیں دیکھ کر میرا دل کانپ کر رہ گیا تھا۔ خود کو موت کے شعلے میں جکڑا سمجھ رہا تھا۔“ جکڑنے کا لفظ زبان پر آیا ہی تھا کہ وہ چونکا کوئل وہ جن زادی وہ میری محسن۔

دکھائی دینے۔ لگی اسے ایسا لگا تھا جیسے زمین آسمان ہر چیز گھوم رہی ہو۔ ساکت قدموں کے ساتھ کھڑا رہا۔ نظر سامنے دریا کی جانب تھی جو کشتی کو دریا میں پھینکنے کے بعد اس پر سوار ہوئے تھے یقیناً وہ لوگ اس کے دشمن تھے اور جزیرے میں آکر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتے تھے۔ کوئل نے سینہ سے ناگن کا روپ دھارا اور ریگنے لگی۔ ادھر کشتی دریا کے تیز بہاؤ اچھلتی موجوں کو چیرتے ہوئے جزیرے کی طرف بڑھنے لگی۔ جوں جوں کشتی جزیرے کی طرف بڑھتی آرہی تھی زاہد کو اپنے سر پر موت سوار دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے توہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے دشمن ایسا بھی کریں گے اس تک پہنچیں گے۔ وہ تو خود کو محفوظ جگہ پر سمجھ رہا تھا لیکن اب یہ سب دیکھ کر اس کے جسم میں دوڑنے والی سانسیں انک انک کر چلنے لگیں۔ زبان گنگ ہو کر رہ گئی تھی، گلا خشک ہو کر رہ گیا تھا، وہ اکیلا تھا۔ اتنے زیادہ لوگوں کا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا؟ کیسے انہیں زیر کر سکتا تھا؟ کیسے انہیں شکست دے سکتا تھا؟ وقفے وقفے سے گولیوں کی آوازیں اس دیرانے میں گونجتیں جو سیدھی اس کے دل پر لگتیں۔ کبھی وہ ریگتی ہوئی کوئل کو دیکھتا، کبھی گہری کھائی میں پڑی ہوئی شہزادی کو اور کبھی اپنی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی کشتی کو۔ کچھ سمجھ نہ آرہی تھی کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ کوئل کی دیرانے میں ایک عجیب آواز گونجی تو زاہد کو ہر طرف ریگنے ہوئے سیاہ ناگ دکھائی دینے لگے۔ ہر کسی کا رخ دریا کی طرف تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہ ناگ ایک ساتھ مل کر کشتی کو الٹا کر رکھ دیں گے۔ ان سب کو ڈبو کر رکھ دیں گے۔ یہ دیکھ کر زاہد کو حوصلہ ہوا، ہمت بڑھی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، بند زبان سے قتل ٹوٹا تو اس نے گہری کھائی میں پڑی شہزادی کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ اس بار اپنے محبوب، اپنی جان کی آواز سنتے ہی کھائی میں جکڑی، خون میں لت پت پڑی جن زادی نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے ساجن کو زندہ سلامت اپنی نظروں کے سامنے کھڑا دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ چمکتا چہرہ مزید حسن اور مہک بکھیرنے لگا وہ تو سمجھ بیٹھی تھی کہ جس ظالم شخص نے اسے جکڑ کر اس گہری خاردار جھاڑیوں میں پھینکا ہے اس نے اس کے محبوب، اس کے پیار کو بھی ختم کر ڈالا ہوگا، جلا ڈالا ہوگا، اس کے جسم کا قیہ قیہ بنا دیا ہوگا، خولصورت چہرے کو روند دیا ہوگا۔ اس لئے وہ مرنے کو ترجیح دے رہی تھی۔ ہمت ہار بیٹھی تھی۔ موت کے بچوں میں جکڑی رہی تھی لیکن اب اپنے محبوب کو دیکھ کر دل میں مرجھا جانے والا پیار دوبارہ مہک اٹھا۔ لبوں پر مسکراہٹیں بکھرنے لگیں۔ دل چاہا کہ اڑ کر باہر نکل آئے لیکن ایسا نہ کر سکتی تھی۔ خود کو آزاد نہ کر سکتی تھی۔ اس بزرگ نے اس کی طاقت چھین لی تھی۔ جب تک آزاد نہ ہو جاتی طاقت نہیں مل سکتی تھی۔

بات تھی جسے سوچ کر زاہد نے کول سے کہا کہ تم آج رات مجھے دریا کے دوسرے کنارے تک پہنچا دینا تاکہ جن زادی کو خونی جھاڑیوں سے باہر نکالنے کیلئے کسی علم والے سے رابطہ کروں۔ کسی بزرگ کو تلاش کروں۔ آپ کی خواہش سر آنکھوں پر لیکن جان دریا کے دوسرے کنارے موت ہے۔ ہر کوئی دشمن ہے آپ کا۔ کہیں آپ کو کچھ ہو گیا تو۔

”نہیں کول مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ مجھے خدا پر بھروسہ ہے۔ خدا تعالیٰ میری ضرورت فرمائیں گے۔ ضرورت میری یہ خواہش یہ تمنا پوری کریں گے۔“ ویسے بھی یہ زندگی موت کا کھیل تو کھیلنا ہی ہے ناں۔ آپ نے بھی تو میری زندگی بچائی تھی۔ آپ بھی تو میری وجہ سے گولیوں کا نشانہ بنی تھیں۔ زخمی ہوئی تھیں۔

یہ لفظ سن کر کول کی آنکھیں بھر آئیں۔ گالوں پر آنسو چمکنے لگے۔ ”زاہد جان مجھے آپ کو ہر حال میں بچانا تھا۔ ناگن کے روپ میں ہی آپ کو دل کار لہجہ بنالیا تھا تو پھر زندگی کی میرے سامنے کیا اہمیت ہے۔ مجھے تو بس آپ کا ساتھ چاہئے۔ آپ کے لبوں پر بکھرتی مسکراہٹ چاہئے۔ آنکھوں میں خوشی کی چمک چاہئے۔ میں رات کے اندھیرے میں ضرور آپ کے ساتھ چلوں گی تاکہ جن زادی کو کسی طریقے سے آزاد کرا سکیں۔ دن بھر باتیں ہوتی رہیں جب رات ہوئی تو کول ناگن بنے دریا کے پانی پر تیرنے لگی۔ زاہد اسے پکڑے موجوں کو چیرتا دوسرے کنارے کی طرف بڑھتا رہا۔ دوسرے کنارے کوئی انسان نظر نہ آیا۔ شاید دن والے واقعہ سے ہر کوئی خوفزدہ تھا۔ کسی کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ دریا کنارے آئے۔ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چاند کی چمکتی روشنی میں جھاڑیوں، ویرانوں سے گزرتے ہوئے بہت آگے نکل گئے۔ ان کی اس لمحے کوئی منزل نہ تھی۔ صرف کسی بزرگ کی تلاش تھی، علم والے کی تلاش تھی۔

نظریں ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ دونوں رات بھر چلتے رہے، بھٹکتے رہے لیکن ناکام رہے۔ کچھ نہ ہوا۔ رات ختم ہو گئی لیکن انہیں کوئی بزرگ دکھائی نہ دیا۔ کوئی اللہ والا دکھائی نہ دیا۔ کوئی علم والا دکھائی نہ دیا۔ صبح ہو گئی، روشنی پھیل گئی تو ایک ایسے قبرستان میں انہوں نے پناہ لے لی جہاں خوف ہی خوف تھا۔ جہاں انسان کم آتے تھے۔ کول ناگن کے روپ میں قبرستان میں ادھر ادھر گھومتی رہی۔ دوسرے لوگوں کو چلتے پھرتے گھورتے رہی۔ سینکڑوں ناگ سانپ اس قبرستان میں زاہد کے ارد گرد حفاظت کیلئے جمع تھے اور وہ بوجھل آنکھوں سے چھپا بیٹھا رہا۔ نیند سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ نجانے کس لمحے وہ سو گیا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب سورج اپنی روشنی کھوپکا تھا۔ جب سائے لمبے لمبے ہونے کے بعد ختم ہو گئے تھے۔ اس نے آنکھیں کھولیں

”زاہد جان اس کا باہر نکلتا بہت مشکل ہے کیونکہ اسے علم کی بدولت جکڑا گیا ہے اور علم والا ہی اسے آزادی دلا سکتا ہے۔ ویسے کوشش کرتے ہیں کہ وہ گہری کھائی سے باہر نکل آئے۔“ یہ کہتے ہی وہ دونوں دوبارہ اس جگہ پہنچے۔ کول نے ناگوں کو جمع کیا اور اپنی زبان میں کچھ سمجھایا تو تمام ناگ ایک دوسرے سے خود کو گرہ کی شکل میں باندھنے لگے۔ تیس پینتیس ناگوں نے خود کو ایک دوسرے سے باندھنے کے بعد نیچے کھائی میں اتر جانے لگیں لیکن جو ناگ بھی جن زادی کے جسم سے چھوٹا جل کر ریزہ ریزہ ہو جاتا، بکھر جاتا۔ یہ زندگی موت کی جنگ تھی۔ جل مرنے کی جنگ تھی۔ ملکہ کا حکم تھا۔ ناگوں کی رانی کا حکم تھا خوشی سے موت کو گلے لگا رہے تھے۔ وفاداری دکھا رہے تھے۔ موت کو گلے لگا رہے تھے۔ خود کو موت کے منہ میں دھکیل رہے تھے۔

زاہد نے سانپوں، ناگوں کو ریزہ ریزہ ہوتے دیکھا، جلتے دیکھا تو کہا۔ ”کول بس کریں شہزادی کو باہر نکالنے والا یہ طریقہ ناکام ہو گیا ہے۔ بیچارے کتنے ناگ جل مرے ہیں کوئی اور حل تلاش کرتے ہیں۔“ لیکن کوئی اور حل بھی تو ذہن میں نہ آ رہا تھا۔ پریشان حال اداسیوں کے پہاڑوں تلے دبے ہوئے زاہد سوچوں میں گم تھا۔ ایک حسین دیوی کو باہر نکالنے کی فکر سے دو چار تھا۔ اسے خون میں ڈوبا ہوا خونی جھاڑیوں میں پھنسا ہوا مضبوط زنجیروں سے جکڑا ہوا کیسے دیکھ سکتا تھا۔ ایک پل ایک لمحہ بھی اسے سکون نہ تھا۔

کول بھی زاہد کی دلی کیفیت سے واقف تھی۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ کسی طرح سے جن زادی باہر آجائے۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے زاہد پر قبضہ نہ کرے گی، اسے اس سے چھین لے گی لیکن پھر بھی وہ اسے باہر نکالنے کی تگ و دو کر رہی تھی کیونکہ یہ اس کے زاہد کی زندگی کا مسئلہ تھا۔ وہ آزاد ہو جاتی تو گن گن کر زاہد کے دشمنوں سے بدلے لے سکتی تھی۔ وہ کام کر سکتی تھی جو سوچوں سے بھی باہر ہوتے۔ یہ صرف پیار کی جنگ نہ تھی زندگی کی بھی جنگ تھی۔ قربانی دینے کی جنگ تھی۔ اگر زاہد دریا کے دوسرے کنارے جاتا تو وہاں موت کے شکار میں پھنس جاتا۔

دریا کے دوسرے کنارے افراتفری تھی، خوف و ہراس تھا۔ دریا میں کشتی کا جلنا، انسانوں کا ڈوب کر مرنا معمولی بات نہ تھی۔ دلوں کو نچوڑنے والی بات تھی۔ نمبردار کی آنکھیں ضائع کرنا، انہیں اندھا کرنا معمولی بات نہ تھی لیکن پیار تو قربانی مانگتا ہے۔ پیار کرنے والوں کو اپنی جائیں پھیلی پر رکھنی پڑتی ہیں۔ اپنے پیار کو بچانے کیلئے زمانے سے ٹکرانا پڑتا ہے۔ بس یہی

زاہد نے ہلے ہونٹوں کو روک لیا اور کول کو اشارے سے اٹھنے کو کہا اور بغیر کوئی بات کہے پیچھے ہٹتے ہوئے چل پڑے۔ زاہد کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ سوچوں میں غرق تھا۔ چہرے پر پریشانی کے اثرات نمایاں اور واضح تھے۔ شاید سوچ رہا تھا کہ بزرگ نے کیسے جان لیا کہ ہم یہ خواہش لے کر آئے ہیں؟ ہم کیا کہنا چاہتے ہیں؟ انہیں کیسے علم ہو گیا؟ لیکن کول کو پورا یقین تھا کہ وہ حسن پری زنجیروں سے آزاد ہو گئی ہوگی۔ گہری کھائی سے باہر نکل آئی ہوگی۔ چلتے چلتے کبھی وہ زاہد کے ماند پڑے چہرے کو دیکھتی اور کبھی بزرگ کی باتیں دماغ میں دہراتی۔

سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ اسی قبرستان میں آ بیٹھے جہاں وہ کل پورا دن چھپا بیٹھا رہا تھا۔ یہ خوفناک قبرستان تھا۔ گھاس اتنی اتنی اونچی تھی کہ قبریں بھی دکھائی نہ دے رہی تھیں۔ یہاں بیٹھتے ہی کول نے کہا۔

”زاہد جان آپ پریشان نہ ہوں وہ حسن پری آزاد ہو گئی ہوگی۔ مجھے بزرگ کی باتوں پر پورا یقین ہے۔“

”کول میں کیسے یقین کر لوں؟ کیسے مان جاؤں کہ کچھ بات کہے کچھ بتائے بغیر وہ جان گئے ہیں اور اسے آزاد کر دیا۔“ اچانک اسے اپنی اس بات پر گرو بابا کی بات یاد آ گئی جس نے پہلی نظر میں اس کا نام اور گھر کے تمام حالات بتا دیئے تھے اور کہا تھا کہ میں جو تیرے دل میں ہے وہ بھی جانتا ہوں اور جو ہوا ہے وہ بھی جانتا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی زاہد کی خوشی سے آنکھیں چمک اٹھیں۔ خوشی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”کول تم سچ کہتی ہو۔ تمہاری بات میں وزن ہے۔ وہ یقیناً آزاد ہو گئی ہوگی۔ بزرگ صاحب نے اس دیوی کو گہری کھائی میں زنجیروں میں جکڑا ہوا لہو میں بھیگا ہوا دیکھ لیا ہوگا اور اس کی حالت پر ترس آ گیا ہوگا۔ اس کے ماند پڑے چہرے کی پریشانی کو دیکھ لیا ہوگا۔ ہمارے دلوں کو دیکھ لیا ہوگا کہ ہم کیا عرض لے کر آئے ہیں۔“

زاہد کو خوشی و مسرت میں جھومتے دیکھتے ہی نجانے کیوں کول کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور ہینگی آنکھوں کے ساتھ بولی۔ ”زاہد جان حسن پری کو پا کر مجھے چھوڑ تو نہ دو گے۔ آنکھوں میں آنسو تو نہ دے دو گے روگی تو نہ بنا دو گے تڑپتا ہوا چھوڑ تو نہ دو گے۔ کول کی آنسوؤں بھری آنکھیں دیکھ کر گالوں پر چمکتے آنسو دیکھ کر زاہد کی آنکھیں بھی بھیگ گئی۔ محبت بھری نظر اس کے حسین چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”کول تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تم کو چھوڑ دوں گا؟ تم تو میری زندگی ہو میرے

تو سامنے کول کو بیٹھے پایا۔ قریب پڑا ہوا کھانا دیکھا تو بھوکے بھیڑے کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کول اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ لیوں پر ہلکی مسکراہٹ بکھرتی رہی اور زاہد نوالے چباتا رہا۔ تب کول بولی۔

”زاہد جان ایک بزرگ کا پتہ چلا ہے۔ آپ سو رہے تھے تب میں بزرگ کی تلاش میں بہت دور نکل گئی تھی۔ ایک قبرستان میں لگا ہوا خیمہ دیکھ کر آئی ہوں وہاں لوگوں کا جھوم تھا۔ ایک سفید لباس والے سفید بالوں والے سفید داڑھی والے بزرگ دیکھے ہیں۔ لوگوں کے جھوم سے اندازہ لگایا ہے کہ وہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ہر کوئی انہیں دعا کرنے کو کہہ رہا تھا۔“

زاہد نے کھاتے کھاتے ہاتھ روک لئے۔ ایک پیار بھری نظر کول پر ڈالی اور کہا۔

”کتنی مشقت کرنی پڑی ہے آپ کو میری وجہ سے۔“

”نہیں زاہد جان ایسی بات نہیں ہے۔ جس مقصد کو لے کر یہاں آئے ہیں اسے پورا بھی تو کرنا ہے۔ نجانے وہ دیوی کس حال میں ہوگی۔ مجھ سے تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ رہ رہ کر اس کا چہرہ نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ کتنا ظلم کیا ہے اس ظالم انسان نے۔ چلو اچھا ہوا کہ میں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ورنہ وہ تو آپ کو بھی ختم کرنا چاہتا تھا۔ خیر آپ کھانا کھائیں۔ نجانے کب سے بھوکے ہیں۔“

زاہد نے کول کی اس بات پر دوبارہ کھانا شروع کر دیا اور جب کھانا کھا چکا تو دونوں ایک ساتھ چل پڑے۔ کافی مسافت طے کرنے کے بعد وہ قبرستان آ گیا جہاں کول ناگن کے روپ میں چکر لگا چکی تھی۔ رات کی سیاہی میں ان بزرگ کے پاس کوئی شخص موجود نہ تھا۔ وہ اکیلے تھے اور ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ یہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے قریب جا بیٹھے۔ بزرگ صاحب کا قیام اتنا لمبا تھا کہ رات بیت گئی لیکن قیام ختم نہ ہوا۔ آنکھوں سے آنسو ایسے جاری تھے جیسے بہت گناہگار ہوں اور خدا سے اپنے گناہوں کو بخشوا رہے ہوں۔ ابھی کچھ اندھیرا باقی تھا کہ بزرگ جھکے تو زاہد سمجھ گیا کہ نوافل ادا کر رہے ہیں۔

جب انہوں نے اپنی نماز ختم کی دعا سے فارغ ہوئے تو آنکھیں بند کیے ہی بولے۔

”جاؤ بیٹا تم مقصد لے کر یہاں آئے ہو پورا ہو گیا ہے۔ واپس لوٹ جاؤ۔“

بزرگ کی بات سن کر زاہد چونک کر رہ گیا۔ بات کرنے کیلئے لیوں کو حرکت دینی چاہی تو بزرگ نے آنکھیں بند کیے وہی الفاظ دہرائے اور کہا۔ ”واپس لوٹ جاؤ تمہارے دل کی مراد پوری ہو گئی ہے۔“

ہی نہ آ رہا تھا کہ وہ جن زادی یکدم اس کے سامنے آ جائے گی۔ ادھر اس شہزادی کا بھی زاہد جیسا حال تھا۔ وہ بھی اپنے شہزادے کو نظروں کے سامنے پا کر لبوں پر مسکراہٹ بکھیر رہی تھی۔

جس کی حفاظت دن رات کرتی رہی تھی وہ آج چلتا پھرتا اس کے سامنے تھا۔ جس کی وہ دیوانی تھی وہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ نجانے کتنے ہی لمحات دونوں ایک دوسرے کے چہرے میں اپنا اپنا پیار تلاش کرتے رہے پھر جن زادی آگے بڑھی تو کوئل سمجھی کہ شاید اسے گلے لگانا چاہتی ہو۔ تب وہ بھی مسکراتی ہوئی آگے بڑھی لیکن وہ اس کی بجائے زاہد کے قریب ہوئی۔ اس کا ہاتھ تھما اور کوئل کو اکیلے تنہا چھوڑ کر ہواؤں میں لے اڑی۔ ایک جھٹکا کوئل کے دل کو لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا، زمین آسمان گھومتے دکھائی دیئے، روح جسم سے نکلتی محسوس ہوئی۔ آنکھوں میں آنسو لئے تڑپ کر رہ گئی۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس کے رانجن کو لحوں میں ہی وہ جھین کر لے جائے گی۔ لحوں میں ہی اس کی نظروں سے اوجھل کرے گی، لحوں میں ہی اس کی زندگی کو روگی اور اجیرن بنا ڈالے گی، لحوں میں ہی اسے عذاب تنہائی میں مبتلا کر دے گی۔ کوئل بکھر کر رہ گئی، ٹوٹ کر رہ گئی۔ جس جگہ اس کا شہزادہ کھڑا تھا جھک کر اس جگہ کو چومنے لگی۔ ٹکریں مارنے لگیں، اپنی بے بسی پر آنسو بہانے لگی، ماتم کرنے لگی۔ عجیب عجیب خیالات، سوچوں اور تصورات نے اس کے دل و دماغ کو جکڑا ہوا تھا۔ دل کے ایک کونے سے آواز ابھری کوئل ذرا اپنے آپ کو دیکھو تو ہے کیا چیز؟ ناگن صرف ناگن قابل نفرت۔ تیرا کام پیار کرنا نہیں ڈنسا ہے۔ تو کیا سمجھتی ہے کہ انسانی روپ اپنا لینے سے لوگ تیرے حسن پر مر مٹیں گے، تیری پوجا کرنے لگیں گے، تجھ پر جان چھڑکتے پھیریں گے۔ نہیں تو ایسی نہیں ہے تو صرف اور صرف ناگن ہے لیکن ساتھ ہی دوسرے ہی لمحے ایک اور آواز گونجی۔ کوئل تو خود کو ناگن کیوں کہتی ہے کیوں کہتی ہے کہ تجھے چاہنے والا کوئی نہیں، تجھ سے پیار کرنے والا کوئی نہیں، تجھ پر مر مٹنے والا کوئی نہیں۔ دیکھا نہیں تو نے اپنے زاہد کی آنکھوں کو کتنے پیار سے کتنی گہرائی سے تجھے دیکھا تھا۔ اس کے دل کی آواز نہیں سنی تھی جو صرف اور صرف تیرے نام پر دھڑکتا تھا۔ دیکھا نہیں تو نے اپنے زاہد کے ہلنے لیوں کو کہ کوئل یہ زاہد صرف تمہارے لئے بنا ہے صرف تیرا ہے اس پر کسی اور کا حق نہیں ہے تو کیوں روتی ہے؟ کیوں آنسو بہاتی ہے؟ کیوں دل کو جلاتی ہے؟ کیوں ٹکریں مار مار کر ماتھا چھاڑتی ہے۔ کیوں لہو سے خود کو سرخ کرتی ہے؟ تلاش کر اپنے محبوب کو، ڈھونڈ اسے وہ بھی تیرے بغیر تیری جدائی میں تڑپ رہا ہوگا، آنسو بہا رہا ہوگا، پکار رہا ہوگا، چل اٹھ تلاش کر اسے وہ زور والی تھی طاقت والی تیرے محبوب کو لے اڑی ہے تو اسے اپنا

جسم کی روح ہو۔ تم کلی ہو تو میں اس کی خوشبو ہوں۔ تم نے میرے لئے بہت قربانیاں دیں ہیں اور پھر تم تو میرا پیار ہو۔ کیوں ایسی بات سوچی ہے۔“ زاہد نے اس کی آنکھوں میں چمکنے والے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اگر کو تو بزرگ سے کہہ کر اسے دوبارہ جکڑنے کو کہہ دیتا ہوں۔ میں تیرے لبوں سے مسکراہٹ چھیننا نہیں چاہتا۔“

”نہ زاہد جان ایسا نہ کرنا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ دیکھا نہیں اس کا کتنا برا حال تھا۔ لہو میں بیگی ہوئی تڑپ رہی تھی۔ نوک دار اور تیر کاٹنے کیسے اس کے جسم کے اندر دھنسے ہوئے تھے اور پھر میری طرح وہ بھی تو آپ کو چاہتی ہے، بلکہ مجھ سے پہلے سے وہ آپ کی عاشق ہے۔ مجھ سے پہلے اس نے اپنا آپ آپ کو سوپ دیا تھا۔ اپنا دل اپنی جان آپ کے نام کر دیئے تھے۔ میرا کہنے کا مطلب تھا کہ میں بھی آپ کی دلتی ہوں۔ میں بھی آپ کو چاہنے والی ہوں۔ میرے دل میں بھی امنگیں آرزوئیں ہیں۔ میرے اندر بھی آپ کے پیار کی تڑپ ہے۔ میری نظروں میں بھی آپ کا پیارا کھڑا ہے۔ میں بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نہیں جی سکتی۔“

زاہد کوئل کی بات سن کر ہنس پڑا اور کہا۔ ”تم سچ کہتی ہو۔ یاد کرو میں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا کہ صرف اور صرف تمہیں ہی اپناؤں گا۔ میں اپنے وعدے میں کامیاب رہنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ تم سے جدائی میری اپنی موت ہوگی۔“ خوفناک قبرستان میں چھپے بیٹھے یہ لیلیٰ مینوں میٹھی میٹھی باتوں میں دن گزارتے رہے۔ اندھیرے کا انتظار کرتے رہے کہ اندھیرا چھائے اور وہ دونوں جزیرے تک پہنچیں۔ کوئل کے دل میں جو پچھڑنے کا خوف تھا وہ ختم ہو گیا۔ زاہد کی باتوں نے اس کے دل کو تسلی دے دی تھی کہ وہ صرف اس کا ہے اور اس کے بنا نہیں رہ سکتا۔ تبھی تو زاہد کو ناز خڑے دکھا رہی تھی۔ کبھی سرخ رنگ کے دوپٹے کو دانتوں میں چباتی، کبھی تنکھی نظروں سے اپنے محبوب کو دیکھتی، کبھی شرماتی، کبھی مسکراتی، کبھی مستی میں جھومتی اور زاہد اس کی ان اداؤں کا دیوانہ ہوتا جا رہا تھا۔ دل بے قابو ہو رہا تھا۔ قسمت پر ناز کر رہا تھا۔ دن گزرتے گزرتے اندھیرا چھوڑنے لگا۔ اندھیرا ہونے سے کچھ وقت بعد ہر طرف سناٹا ہی سناٹا ہوا تو دونوں خوفناک قبرستان سے باہر نکلے۔ ابھی باہر نکلے ہی تھے کہ سامنے ایک درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے، لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے سرخ جوڑا پہنے، لہن بنے کھڑی حسن پری جن زادی کو دیکھ کر چونک گئے۔ زاہد اپنی پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ اسے یقین

نمبردار کی کہانی سن کر نواب صاحب بولے۔ ”مراد صاحب تم بھی تو اسے دیکھ کر جذباتی ہو گئے تھے۔ اپنا آپ لٹا بیٹھے تھے۔ پہلی ہی نظر میں اس کا دم بھرنے لگے تھے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کس ذات سے تعلق رکھتی ہے؟ تم پر تو بس عشق کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اس کا حسن دیکھ کر ہی لٹو ہو گئے تھے۔ ہزاروں حسین لڑکیاں تمہارے ارد گرد منڈلاتی پھرتی ہیں۔“

نہیں نواب صاحب نہیں بات لڑکی کی نہیں بات ضد کی تھی لیکن جب تک اس کی آنکھیں نکال کر کتوں کو نہ کھلا دوں گا میں بھی چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ جب تک اس کے حسن کو تیل چھڑکا رہا تک نہ بنا دوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔

میرے آدمی تلاش کر رہے ہیں اسے ڈھونڈ نکالیں گے اسے انہی دیرانوں میں کہیں چھپی بیٹھی ہوگی۔ انسان کی بوسونگھنے والے کتے بھی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ بہت جلد قابو آ جائے گی۔ نواب صاحب اسے کہہ دو کہ اپنی زندگی کے دن اپنی انگلیوں پر گننے شروع کر دے۔ مجھ پر ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کس سے ٹکر لے رہی ہے؟ کس سے مقابلہ کر رہی ہے؟ میری تو صرف آنکھیں ضائع ہوئی ہیں اس کی حسین جوانی ضائع ہوگی۔ گلے میں پھندا ڈال کر سرعام درخت پر لٹکا دوں گا۔ تمام گاؤں والوں کو دکھاؤں گا کہ جاگیرداروں اور نمبرداروں سے ٹکر لینے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ نمبردار جذباتی انداز میں بولے جا رہا تھا اور جاگیردار اس کی باتیں سن کر خود بھی جذباتی ہو رہا تھا۔

مراد صاحب میرے آدمی بھی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ مجھ سے آپ کا صدمہ کیسے برداشت ہو سکتا ہے اور اس زاہد کے بچے کو تلاش کر رہے ہیں۔ اس نے تو لوگوں کے دلوں میں ایسا خوف و ہراس پھیلا رکھا ہے کہ لوگ گھروں سے نکلتے ہی موت کو سروں پر سوار کر لیتے ہیں کہ وہ زندہ لوٹ کر گھر آتے ہیں یا نہیں۔ مراد صاحب وہ معمولی انسان حویلی والوں کو کھلا رہا جلا رہا ہے، ختم کرتا جا رہا ہے۔ ماں جی کو بھی ختم کر گیا ہے اب تو ایسا لگتا ہے جیسے ہم بھی اس کی لپیٹ میں ہیں.....

نواب صاحب نہ ڈر پوک لوگوں والی باتیں نہ کرو۔ تم جانتے ہو کہ کمزور دل والے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ بہادر بنو جلد ہی وہ ہمارے قبضے میں ہوگا۔ مجھے تو بہن کشور کی یاد ستاتی ہے اس ظالم نے اس کا دماغ مفلوج کر کے رکھ دیا ہے اب بتاؤ کچھ ٹھیک ہوئی ہے کہ نہیں۔

نہیں یار ویسے کی ویسی ہے۔ کمرے میں بند رکھا ہوا ہے۔ اندر ہی کھانا بھیج دیتے

مجھتی تھی اس پر بھروسہ کر بیٹھی تھی۔ دیکھ لیا تو نے کیسے اس نے تجھے اندھیروں میں دھکیل دیا ہے۔ مختلف سوچوں نے کوئل کے دل و دماغ کو جکڑا ہوا تھا۔ انتشار میں پھنسی ہوئی کوئل نے اپنا سر اٹھایا۔ بھگی پلکوں کو سرخ دوپٹے سے صاف کیا اور ایک فیصلہ کیا۔ پختہ فیصلہ کہ جب تک اسے اس کا محبوب دکھائی نہ دے گا اس وقت تک کسی کو بھی اپنا چہرہ نہیں دکھائے گی کسی کے سامنے نہیں آئے گی۔ وہ صرف اپنے محبوب زاہد کیلئے بنی تھی اب وہ نہیں تو پھر کس کیلئے بنے سنو رہے۔

یہ خیال آتے ہی اس نے سیاہ ناگن کا روپ دھار لیا اور ٹوٹے دل کے ساتھ ریٹگنے لگی اور دریا کنارے پہنچ کر اس میں کود پڑی اور جزیرے کے اس درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئی جہاں شب بھر پیار بھری باتیں کیا کرتے تھے جہاں ایک دوسرے کے چہروں پر نظریں جمائے رکھتے تھے لیکن اب وہاں کیا تھا ویرانہ۔ صرف ویرانہ تنہائیاں جدائی کی لمبی کہانیاں۔ وہاں بھی اس کا دل نہ لگا سکون نہ ملا تو ریٹگنے ہوئے ایک مرتبہ پھر کنارے پر آ گئی اور اسی بل میں جا کھسی جہاں بیٹھ کر اپنے محبوب مجھے کی حفاظت کیا کرتی تھی۔ جہاں اس کا محبوب مجسمہ سے دوبارہ انسان بنا تھا۔ جب اس کا دھیان مجھے کی جانب گیا تو تڑپ اٹھی۔ محبوب کی تمام باتیں اسے یاد آنے لگیں۔ کوئل میرا ساتھ دینا میں اکیلا ہوں۔ ہر سو میرے دشمن پھیلے ہوئے ہیں۔ گولیوں کے نشانے پر ہوں۔ کسی وقت بھی کوئی میری زندگی چھین سکتا ہے۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ غصہ سے تڑپی اور اپنی زندگی کی پرواہ کیے بغیر اپنے محبوب کے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوئی۔

جاگیردار نواب گھوڑے پر سوار ہواؤں کو چیرتا ہوا اپنے دوست نمبردار مراد کے پاس پہنچا۔ اپنے اندھے دوست کو دیکھتے ہی اسے اس رات والا تمام واقعہ یاد آ گیا تو بولا۔

”مراد صاحب آپ نے بتایا ہی نہیں کہ وہ لڑکی ہو کر آپ سے مقابلہ کرتی رہی اور آپ کی آنکھیں نکال کر لے گئی۔“

نواب نواب صاحب وہ لڑکی نہیں ناگن ہے ناگن میں نے اسے قریب سے دیکھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ خوبصورت نیلی آنکھیں حسین نہ رہی تھیں ان میں خون اتر ا ہوا تھا۔ بھوک شہرینی کی طرح مجھ پر جھپٹ رہی تھی، حملے کر رہی تھی۔ مجھے بے بس کر رہی تھی۔ بار بار میری آنکھوں پر وار کرتی رہی تھی اور پھر اس نے ہاتھوں کے لمبے ناخن میری آنکھوں میں گھسائے اور آنکھیں نکال کر باہر لے آئی۔

سے لوگوں کو دیکھتی تو ان میں سے اپنے محبوب کے چہرے کو تلاش کرتی۔ ان میں اپنا پیار تلاش کرتی لیکن محبوب کیسے ملتا وہ تو نجانے کن روشنیوں میں گم تھا؟ کن شہنائیوں میں مست تھا۔ ریگتے ریگتے ہی وہ نمبردار کے گاؤں کے قریب چلی گئی۔ وہاں ہی ایک بل تیار کیا، اپنا ٹھکانا بنایا اور محبوب کے دشمنوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے پلان تیار کرنے لگی۔ لوگوں کی باتیں سننے لگی۔ چند قدم کے فاصلے پر بابا امام دین اور بابا خیر دین آپس میں نمبردار سے متعلق مگو گفتگو تھے۔ امام دین کہہ رہا تھا خیر دین بزرگ کی موت والی بات نجانے کیوں میرے دل و دماغ سے نہیں نکل رہی۔ بار بار کوشش کرتا ہوں کہ یہ بات دل میں ہی دفن رہے لیکن ہر بار زبان پر پھلنے کو آ جاتی ہے۔ مجھے شک ہی نہیں پورا یقین ہے کہ بزرگ کو نمبردار کے آدمی نے قتل کیا ہے۔ جب وہ قبرستان گیا تھا تو اس کی آنکھیں اس کا چہرہ اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ ضرور گڑبڑ ہے ضرور کچھ ہونے والا ہے اور ویسا ہی ہوا۔

بزرگ مجھے کی آنکھوں کا نشانہ نہ بنے تھے بلکہ اس ظالم کے بچوں کا نشانہ بنے تھے۔ امام دین، امام دین پہلے بھی تجھے سمجھایا تھا کہ ایسی باتیں زبان پر نہ لایا کرو۔ یہاں سچ بولنے والوں کی زبانیں کاٹ دی جاتی ہیں۔ تم اکیلے ہی نہیں ہم بھی جانتے ہیں کہ بزرگ کو قتل کیا گیا ہے اور بس تم دیکھتے جاؤ خدا کی لاشی بے آواز ہے۔ یہ سزا پا رہے ہیں۔ مجھے کی نظروں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ سنا ہے ایک حسینہ کو اٹھالائے تھے لیکن وہ نمبردار مراد کی آنکھیں نکال کر لے گئی۔ ہمت والی تھی طاقت والی تھی ہماری عورتوں کی طرح نہ تھی کہ جو ان کے خوف سے پھندے گلے میں ڈال لئے اور اپنا خاتمہ کر لیا لیکن اندھے ہونے کے باوجود بھی اس کی اکثر ختم نہیں ہوئی۔ ابھی بھی کہتا ہے کہ جس حسینہ نے اس کی آنکھیں نکالی ہیں، اندھا کیا ہے، روشنی چھینی ہے، ہم اس حسینہ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ بوٹی بوٹی بنا ڈالیں گے۔ سبھی بھرے ہوئے ہیں۔ تم کیوں جلتی پر تیل چھڑکنا چاہتے ہو۔ انہیں پہلے صرف مجھے کا خوف تھا لیکن اب اس حسینہ کا بھی خوف ہے جو نجانے کہاں غائب ہو گئی ہے۔ ابھی تک ان دونوں کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ وہ ان کیلئے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔

خیر دین کی باتیں ایک مرتبہ پھر امام دین کے دماغ میں بیٹھیں اور کہا۔ خیر دین تم سچ کہتے ہو جو انہوں نے بویا وہی کاٹ رہے ہیں۔ بہت اچھا ہوا ہے میں بہت خوش ہوں ان کو مرنا چاہئے، جلنا چاہئے۔ ان کی اکثری گردنوں کو جھکنا چاہئے۔ میں تو چاہتا ہوں کوئی ایسا طوفان

ہیں اس کی وجہ سے شرمندگی ہوتی ہے۔ اس کے پاگل پن نے ہمیں لوگوں کی نظروں سے گرا دیا ہے۔ ہر وقت چیختی رہتی ہے۔ حالانکہ جواد نے اسے ہزاروں ڈاکٹروں کو دکھایا ہے ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ اس کا دماغ آہستہ آہستہ جھلٹا جا رہا ہے۔ سمجھ نہیں آتی کیا ہوگا؟ نواب صاحب یہاں ایک علم والا کہتا تھا کہ اس کا گردلوں میں اس کا دماغ درست کر دے گا۔ اس زاہد کے بچے کو قابو کرے گا لیکن وہ کم بخت ابھی تک اپنے گردو کو لے کر واپس نہیں آیا حالانکہ کافی جگہ اسے تلاش کیا ہے۔

اچھا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ نہ کچھ حل ضرور نکل آئے گا۔ جزیرے تک پہنچنے کیلئے کشتی دریا میں ڈالی تھی لیکن اس کم بخت نے اس کشتی کو بھی جلا کر راکھ بنا دیا اور وہ حسینہ نجانے دنیا کی کس کسٹ میں جا چھپی ہے۔ اسے کوئی بھی پکڑ نہیں سکا، قابو نہیں کر سکا۔ یہ جو ہمارے آدمی ہیں یہ بھی نمک حرام ہو گئے ہیں۔ کمزور پڑ گئے ہیں۔ مقابلہ کرنے کی ان میں ہمت نہیں رہی۔ جہاں بھی بھیجتے ہیں منہ لٹکا کر آ جاتے ہیں۔ جیسے ان کے جسموں میں خون ختم ہو گیا ہو۔ حویلی میں بہت بڑھکیں مارتے ہیں لیکن گاؤں سے باہر نکلتے ہی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کے سروں پر بھی موت سوار ہو گئی ہے۔ مجھے کا نام سننے ہی کانپ جاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے بھون ڈالوں ان سب کم بختوں کو۔ کتوں کے آگے ڈال دوں۔ اب خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ جواد فواد تو اپنی عیش و عشرت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر وہ حسینہ میری آنکھیں نہ نکالتی تو دیکھتا کہ کیسے وہ زاہد کا بچہ قابو نہ آتا؟ کیسے حسینہ قابو نہ آتی؟

اچھا مراد تو آرام کر میں چلتا ہوں۔ بہت دھندے کرنے ہیں۔ لگتا ہے کہ آج رات کو کوئی سراغ مل جائے گا کیونکہ حیات اور وہاب نے بھی دلچسپی لیتی شروع کر دی ہے۔ وہ بھی حسینہ کے نام سے ٹپل رہے ہیں۔ تیری طرح وہاب بھی اس کا عاشق بن بیٹھا ہے۔ حسینہ حسینہ کا لفظ سن کر اس پر بھی اسے دیکھنے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ آج گیا ہے دریا کنارے۔ کہتا تھا رات کو حسینہ کو قابو کر کے لے آئے گا۔ میں جا کر دیکھتا ہوں کہ وہ بھی ناکام لوٹا ہے یا واقعی اسے قابو کر کے لے آیا ہے۔ یہ کہہ کر نواب نے دوبارہ اپنا پاؤں گھوڑے پر رکھا اور ہواؤں کو چیرتا ہوا واپس گاؤں آ گیا۔

ادھر کوئل اپنا وعدہ پورا کرنے پر قتل گئی تھی۔ محبوب کے دشمنوں کی جانیں کھینچنے کی ان کے جسموں کو داغنے اور اپنا زہر ان میں اٹھیلنے کو تیار ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں آگ لئے بل سے باہر نکلی اور ریگتے ریگتے اکیلے ہی کسی بھی ناگ، سانپ کو ہمراہ نہ لیا تنہا ہی چل پڑی۔ دور

گئی تھی۔ جس کو اندھا کر گئی تھی۔ اسے باہر نکلتے دیکھتے ہی کوئل غصہ سے پھنکارنے لگی۔ خون خوار درندے کی طرح اس پر جھپٹی اور لحوں میں ہی اپنے زہریلے دانت اس کی گردن میں پیوست کر دیئے۔ نمبردار مراد چیخ تو نہ سکتا تھا صرف تڑپ سکتا تھا کیونکہ پوری گردن کوئل کے منہ میں تھی۔ کوئل نے نمبردار کے جسم کو اپنے قبضہ میں لے لیا، پوری طرح اسے جکڑ لیا۔ نمبردار مراد کی کی سانس اٹھنے لگیں۔ کوئل نے اس وقت تک اس کی گردن کو نہ چھوڑا جب تک نمبردار کا تڑپنا جسم ساکت نہ ہو گیا، جب تک اٹھڑے سانس خاموش نہ ہو گئے۔ جب تک وہ زمین پر نہ گرا۔ اس کے نیچے گرتے ہی ناگن بجلی کی سی تیزی سے باہر نکل گئی۔ ادھر لان میں کسی چیز کے گرنے کی آواز سن کر سوائے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ دروازے کھلتے رہے، حویلی والے اکٹھے ہوتے رہے۔ ایک چیخ بلند ہوئی جس نے آس پاس کے گھر والوں کو جگا دیا۔ نمبردار فواد اور جواد اپنے بھائی کی لاش کو گھور رہے تھے۔ انہیں یقین نہ آ رہا تھا کہ ان کا بڑا بھائی یکدم لحوں میں، منٹوں میں، گھڑیوں میں ان کا ساتھ چھوڑ دے گا۔

مراد کی موت پر تین دن کا گاؤں میں سوگ منانے کا اعلان کر دیا۔ ان تین دنوں میں کوئی بھی کام نہیں کرے گا، کوئی بھی سفید لباس نہیں پہنے گا، کوئی بھی تقیہ نہیں لگائے گا۔ لاش دیکھ کر ڈاکٹروں، حکیموں نے بتایا کہ اسے زہریلے ناگ نے کاٹا ہے اسی لئے مرنے کے بعد بھی اس کے منہ سے زرد رنگ کی جھاگ بہہ رہی ہے۔ اس کا پورا جسم زہر سے بھرا ہوا ہے۔ ناگ کے ڈسنے کا سنتے ہی نمبردار جواد گر جا کہ صبح سویرے ہی گاؤں میں سپیروں کی لائیں دی جائیں۔ گاؤں اور آس پاس پھیلے تمام ناگوں سانپوں کو پکڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے کیونکہ وہ پہلے بھی ناگوں کا حملہ دیکھ چکے تھے۔ یہ ناگ انسانی زندگی سے کیوں کھیلتے ہیں؟ کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ حویلی میں افراتفری تھی۔ نمبردار مراد کی موت دیکھ کر بھائیوں کی گردنیں اکڑی کی اکڑی تھیں۔ جاگیردار کے گاؤں پیغام بھیج دیا گیا۔ جاگیردار نواب نے مراد کی موت کا مہر اثر لیا۔ کل والی باتیں اس کے دل و دماغ میں گھومنے لگیں۔ کیسے غصہ سے چیخ رہا تھا کہ وہ خود حالات کا مقابلہ کرے گا۔ موت کا سامنا کرے گا۔ اس زاہد کی کمینے کو قابو کر کے اس کے جسم کا قیمتی قسیم بنا دے گا۔ سامنے بڑی مراد کی میت کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ کتنا خاموش لیٹا ہوا تھا وہ؟ کتنا چپ چاپ لیٹا ہوا تھا؟ دل چاہا کہ اسے جھنجھوڑے اور کہے مراد کیوں چپ ہو؟ اٹھو تم نے تو انتقام لینا ہے۔ اس حسینہ سے، اس مجسمہ سے، اس کے

آئے جوان سب کو بہا کر لے جائے۔ ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ نمبردار کا ایک ملازم یکدم سامنے آ گیا جس کی آنکھوں میں جلتے شعلے دیکھ کر یہ دونوں کانپ کر رہ گئے۔ اس نے شاید ان دونوں کی تمام باتیں سن لی تھیں۔ ایک زوردار تھپڑ بابا امام دین کے منہ پر پڑا۔ وہ چیخ پڑا۔ اس سے قبل کہ وہ خیر دین پر ہاتھ اٹھاتا یکدم چیخنا چلانا شروع ہو گیا۔

کوئل نے ناگن بنے بل سے باہر نکل کر اس کی ناگ پر اپنے زہریلے دانت گاڑ رکھے تھے۔ اپنا تمام زہر اس کی رگوں میں پھیلا رہی تھی۔ یہ کام کرنے کے بعد وہ دوبارہ اس بل میں جا کھسی تھی۔ کوئل یہ جان گئی تھی کہ یہ نمبردار کا خاص آدمی بھی اس کے محبوب کا دشمن ہے۔ اس کے محبوب کی دشمن پارٹی کا آدمی ہے۔ زہر نے لحوں میں ہی اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ لوگوں کا ہجوم جمع ہوتا گیا۔ حویلی کے ملازم آ گئے۔ وہ درد شدت سے تڑپتا رہا۔ زہر اس کی رگوں میں پھیلتا رہا۔ لحوں میں ہی وہ تڑپتے تڑپتے ٹھنڈا ہو گیا۔

منہ سے زہریلی جھاگ بہنے لگی۔ امام دین اور خیر دین ابھی تک حیران کھڑے تھے۔ خدا کی قدرت دیکھ کر دل ہی دل میں ذات باری کا شکر ادا کر رہے تھے کہ اگر ناگن اسے نہ ڈستی تو ہو سکتا تھا کہ یہ دونوں بھی رسیوں میں جکڑے جاتے۔ گلیوں میں کھینچے جاتے، ڈنڈوں پتھروں سے لہو لہان ہوتے، نمبردار کی گولیوں کا نشانہ بننے اور ہو سکتا تھا کہ قبروں کی بجائے ان کے جسم کتوں کے آگے ڈال دیئے جاتے۔ ناگن ان کیلئے فرشتہ ثابت ہوئی تھی۔ جس نے ان دونوں کو کچھ نہ کہا صرف اسے ہی اپنا شکار بنانے کے بعد بل میں جا کھسی۔ ناگن کے ڈسنے کی خبر گاؤں میں پھیل گئی لیکن لوگوں کے ذہنوں میں اس بات کا خوف یا ڈر پیدا نہ ہوا کیونکہ ایسا تو ہوتا رہتا تھا۔ کوئی سانپ کے ڈسنے سے مر جاتا تھا تو کوئی بچ جاتا تھا۔ اس کی موت پر کسی نے اثر نہ لیا اور اسے دفن کر دیا۔ رات ہو گئی۔ اندھیرا پھیل گیا تو کوئل ناگن کے روپ میں گلیوں میں رینگتے رینگتے حویلی تک جا پہنچی۔ حویلی کے کھلے لان میں چکر لگانے لگی۔ حویلی والوں کو تلاش کرنے لگی لیکن تمام کمرے بند تھے۔ حویلی ایسے تھی جیسے سنسان کھنڈرات ہوں۔ حویلی کے کونے کونے میں گھومنے کے بعد ناکامی کی صورت میں ابھی واپس مڑنے ہی والی تھی کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلتا دکھائی دیا۔ یہ دیکھ کر وہ دیوار کے ساتھ چھپ گئی لیکن اس کی تمام تر توجہ دروازے پر تھی۔ کمرے سے باہر نکلتے والا شخص نمبردار مراد تھا۔ وہی نمبردار جو اسے زبردستی اٹھا کر حویلی لایا تھا اور انسان سے درندہ بنا تھا اور جس کی دونوں آنکھیں وہ پہلے ہی نکال کر لے

جگہ جا بیٹھی جہاں اس کا محبوب اس سے میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتا تھا، جہاں وہ اپنے محبوب کے چہرے میں کھوئی رہتی تھی لیکن اب وہاں بیٹھے اپنی قسمت کو کوس رہی تھی۔ آنسو بہا رہی تھی۔ محبوب کی جدائی میں تڑپ رہی تھی۔ وہ اسے بے وفا بھی تو نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ وہ بے وفا نہیں تھا ایک آتش قوت کے قابو میں تھا۔ ایسی قوت جو طوفان برپا کر سکتی ہے۔ دریاؤں میں آگ لگا سکتی ہے۔ ہواؤں میں اڑ سکتی ہے، بند کمروں کے اندر گھس سکتی ہے۔ اپنی صورتیں بدل سکتی ہے۔ اس جن زادی والی طاقت اس میں کہاں وہ تو صرف ڈس سکتی تھی، زہر اگل سکتی تھی اور بس نجانے کیوں اس کے محبوب کے چلے جانے کے بعد جزیرے میں دل نہ لگتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو لئے جدائی کے زخم لئے وہ رات بھر تنہا جزیرے میں، ویرانے میں گھومتی رہی۔ اپنے محبوب کو تلاش کرتی رہی کہ ہو سکتا ہے وہ جن زادی اس کے محبوب کو لیے یہاں ہی چھپی بیٹھی ہو، یہاں ہی اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھی ہو۔ اس نے تو جن زادی کو اپنی بہن سمجھا تھا کہ وہ بھی اس کے محبوب کی رانی بن کر رہے اور وہ جن زادی بھی لیکن اس نے تو ایک لمحہ بھی رکھنا گوارا نہ کیا اور لے اڑی اسے۔ اب وہ اسے کہاں کہاں تلاش کرتی پھرے؟ کہاں کہاں ڈھونڈتی پھرے۔ تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ محبوب سے لمبی جدائی کا سوچ کر روتی رہی، بڑپتی رہی۔ جب یہ ویرانے اسے ڈسنے لگے تو ایک مرتبہ پھر دریا میں کود پڑی اور اپنا رخ اس قبرستان کی جانب کر لیا جہاں بزرگ بیٹھے تھے جنہوں نے جن زادی کو زنجیروں سے آزاد کیا تھا۔ جنہوں نے اس کے مقدروں میں جدائی لکھ ڈالی تھی۔ جنہوں نے اس کی قسمت میں آنسو بھر دیئے تھے۔ تنہائیوں کے زہرے لمحوں میں تڑپنے کیلئے چھوڑ دیا تھا۔ کوئل یہ بات بھول گئی کہ دریا کے اس کنارے سپیرے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے دشمن پھیلے ہوئے ہیں جو ناگوں کو قریب لا کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے نمبردار کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ وہ مسلسل رینگتے ہوئے آگے ہی بڑھتی گئی لیکن بزرگ کے پاس نہ پہنچ سکی۔

راستے میں ہی قابو آ گئی ایک سپرے نے اسے آتے ہی دیکھ کر بین کی لے پر اسے مست کر ڈالا۔ وہ ناگن سے کوئل کی صورت میں ناچنے لگی، تڑپنے لگی۔ سپرے نے خوبصورت شہزادی کی صورت میں ایک ناگن کو ناچتے ہوئے دیکھا تو خوشی سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے اس خوبصورت ناگن پر وار نہ کیا۔ اس کے خوبصورت جسم کو ٹکڑوں میں نہ بانٹا بلکہ نظروں ہی نظروں میں اس پر عاشق ہو گیا اسے دل دے بیٹھا۔ اس کے حسن پر مر مٹا۔ اس کے

جسموں کو پھوٹتا ہے لیکن اسے بے بس لینے دیکھ کر جاگیردار کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔ حویلیوں میں اموات کو دیکھتے دیکھتے چپ رہنا اب گوارہ نہ رہتا تھا۔ میت کے قریب کھڑے کھڑے ہی نواب صاحب گر جے۔ یہ معمولی انسان کی موت نہیں ہے نمبردار مراد کی ہے۔ نمبردار گاؤں والوں کے سروں سے رینگنے والی موت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کو جلا دینا چاہتا تھا لیکن موت نے اسے موقع نہ دیا۔ اب اس وقت تک سکون نہ لیں گے جب تک اس کمینی کی آنکھیں نکال کر دفن نہ کر دیں گے۔ مراد یار میرا وعدہ ہے کہ تیری قبر کی مٹی میں تیرے دشمنوں کی آنکھیں دفن کروں گا۔ اس کے جسموں کی بوٹی بوٹی کر کے گٹھڑی بنا کر تیری قبر کے اندر رکھوں گا۔ تو دیکھ لینا کہ تمہیں قبر میں اتارنے والے کا تیرا دوست کیا حشر کرتا ہے؟ اسے بھی سفید کفن میں لپیٹا گیا۔ اس کی میت کو بھی کندھا دیا گیا۔ اسے بھی خوفناک اور ڈراؤنے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

کوئل بل میں چھپے ہوئے یہ تمام منظر دیکھ رہی تھی۔ گونجنے والی چینیں سن رہی تھی۔ اس کا محبوب بھی ایسے ہی چیخا تھا، ایسے ہی روتا تھا، ایسے ہی تڑپتا تھا لیکن ان ظالموں نے اس کے محبوب پر ترس نہ کھایا۔ اس کی نظروں کے سامنے ہی اس کے خاندان کو صفحہ ہستی سے مٹایا تھا اور اب وہ بھی اپنے محبوب کے دشمنوں کو ختم کر دے گی۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ ساتھ ہی محبوب کا چہرہ تصورات میں سامنے آیا تو رو دی۔ آنسو بہانے لگی۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ اس بل میں چھپی ہوئی ناگن کے دل میں کیسے کیسے زخم ہیں؟ کیسے کیسے غم ہیں؟

نمبردار مراد کو دفن کرنے کے بعد امام دین اور خیر دین بل کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ نمبردار کا اعلان وہ سن چکے تھے اور وہ جانتے تھے کہ مراد کو بھی اسی ناگ نے ہی ڈسا ہے۔ اسی نے ہی اس کا بھی خاتمہ کیا ہے۔ اس نے ہی اسے قبر میں پہنچایا ہے۔ اس نے ہی اس کو لٹکا ہے۔ اس نے ہی اس کی جان کھینچی ہے۔ اسی نے ہی اسے اگلی دنیا میں پہنچایا ہے۔

خیر دین حویلی والوں کا اعلان سنا ہے سپیروں کو بلا کر سانپوں ناگوں کے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے۔ انہیں جلانا چاہتے ہیں۔ اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ وہ یہ سب محسن ناگ کو بتانے کی غرض سے بول رہے تھے۔ کوئل بل میں چھپی بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی اور ان کی موجودگی میں ہی بل سے باہر نکلی اور تیزی سے رینگتے ہوئے دریا کی جانب بڑھتی جانے لگی۔ جب تک سپرے گاؤں کے آس پاس بکھرتے یہ دریا کودنے کے بعد جزیرے میں اسی

دل میں یہ بھی خدشہ تھا، یہ بھی فکر تھی، پریشانی تھی کہ کوئی دوسرا سپیرا نہ آ جائے اور اس خوبصورت ناگن پر گرفت حاصل نہ کر لے۔ وہ اسے مست کرتا رہا۔ نچا نچا کر حال سے بے حال کرتا رہا۔ نڈھال کرتا رہا جب کوئل مستی کے عالم میں ناچتے ناچتے تھک گئی تو نیچے زمین پر گر پڑی اور دوبارہ ناگن بنے بیہوش ہو گئی۔ سپیرے نے اسے قابو کیا۔ اپنے جھولے میں ڈالا اور بجائے کہ نمبردار کی حویلی میں بنانا اپنے گاؤں کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

کوئل کو کیا خبر تھی کہ سپیرا اسے کہاں لئے جا رہا ہے۔ زندہ بھی چھوڑتا ہے یا نہیں۔ وہ تو ابھی تک بے ہوشی کے عالم میں تھیلے میں بند تھی۔

دریا کنارے چلتے چلتے دور بہت دور ایک پل کو کراس کرتے ہوئے سپیرا ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا پہنچا۔ یہ گاؤں جاگیرداروں اور نمبرداروں کی حدود سے باہر تھا۔ یہاں ہر کوئی خود کو چودھری سمجھتا تھا۔

سپیرے نے جاتے ہی ایک کمرے میں تھیلا رکھا، ناگ کو باہر نکالا۔ یہ گھر کیا تھا یوں سمجھ لیں کہ سانپوں، ناگوں کا ٹھکانہ تھا۔ کوئی سانپ ڈبوں میں بند تھے اور کوئی بڑے سے پنجرے میں گھوم رہے تھے۔ کوئل ناگن نے تھیلے سے باہر نکلتے ہی ایک نظر صحن کی ایک دیوار کے ساتھ بنے بڑے سے پنجرے کی طرف دیکھا۔ وہاں گھومتے ناگوں کو، سانپوں کو دیکھا تو نجانے کیا سوچ کر پنجرے کی طرف بڑھی۔

اسے دیکھتے ہی پنجرے میں گھومنے والے ناگ ایسے سیدھے ہو گئے جیسے ملکہ ان کے گھر آ گئی ہو۔ بات بھی درست تھی۔ یہ کوئل ناگوں کی ملکہ ہی تو تھی لیکن اس سپیرے کے سامنے بے بس تھی۔ خود کو قابو آنے سے بچانہ سکی تھی۔ اس کی گرفت سے باہر نہ ہو سکی تھی۔ رات ہو گئی تو سپیرے نے پنجرے کی بجائے کوئل ناگ کو اپنے کمرے میں رکھا۔ دوسرے ناگوں سے بچا کر اپنے قریب ہی رکھا کیونکہ اس کے اصل روپ کو جان چکا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ سامنے خود کو بل دیئے بیٹھی ناگن پر تھی۔

شہزادی کے روپ میں اس کے سامنے ناچنا اس کے تصورات میں گھوم رہا تھا۔ حسین اور پیار بھرا چہرہ نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہزاروں ارمان اس کے دل میں بچل رہے تھے۔ خوشی سے آنکھیں چمک رہی تھیں اور کوئل ناگن سپیرے کو التجائیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ خدا را مجھے چھوڑ دو، مجھے آزاد کر دو۔ میں کسی اور کی امانت ہوں۔ مجھے

محبوب کے قریب لا رہی ہے، وہ اس کی خوشیوں کی قاتل ہوگی۔ وہی اسے آنسوؤں میں ڈبو دے گی۔ وہی اس سے اس کا پیار چھین کر غائب ہو جائے گی۔

سپیرا ناگن کے حسن میں کھویا تھا اور ناگن اپنے محبوب زاہد کے خیالوں میں کھوئی رہی۔ جب وہ جن زادی کے متعلق سوچتی تو آنکھیں بھر جاتیں۔ کوئل کو شاید اپنے کئے کی سزا مل رہی تھی۔ اس نے بھی تو ہر بات جانتے ہوئے اس راز کو دل میں چھپائے رکھا تھا۔ کبھی بھی زاہد پر ظاہر نہ کیا تھا کہ زاہد جان آپ کو چاہنے والی صرف میں ہی نہیں، کوئی اور بھی ہے۔ کوئی اور بھی آپ کی دیوانی ہے۔ کوئی اور بھی آپ کی پوجا کرتی ہے لیکن یہ تو اس راز کو دفن کر کے اپنے محبوب کو خود اپنا لینا چاہتی تھی۔ خود اپنی زندگی میں رنگ بھرنا چاہتی تھی لیکن اب اپنے ساجن کی جدائی میں سوائے آنسوؤں کے اس کے پاس بچا ہی کیا تھا۔ سوائے تڑپ کے بچا ہی کیا تھا۔ سوائے ریزہ ریزہ دل کے اور بچا ہی کیا تھا۔ اپنے محبوب کی یاد میں سوائے آنسوؤں کے اس کے پاس بچا ہی کیا تھا۔

اپنے محبوب کی یاد میں آنسو بہاتی رہی۔ کسی اور کے قبضہ میں رہ کر بھی اپنے محبوب کو یاد کرتی رہی۔ اس کی راہیں دیکھتی رہی کہ شاید وہ آجائے لیکن وہ کیسے آتا۔ کیسے اسے آزاد کراتا۔ کیسے اپنے دل کی رانی بناتا۔ وہ تو نجانے حسن پری کے ساتھ شیشوں کے محلات میں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے قہقہے لگا رہا ہوگا۔ ہواؤں کی سیر کر رہا ہوگا۔ بھلا اپنی کوئل کو کیسے یاد کر سکتا تھا۔ دن رات اندھروں، اجالوں میں بدلتے رہے۔ سورج طلوع ہوتا رہا، غروب ہوتا رہا۔ لمحے منٹوں، منٹ گھنٹوں میں، گھنٹے دنوں میں، دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے۔ تین ماہ گزر گئے۔ کوئل سپیرے کے قبضہ میں رہی۔ وہ اسے ہر روز نچاتا رہا۔ اپنے پیار کا اظہار کرتا رہا لیکن جواب میں اسے صرف آنسو ملے۔

کوئل تو نہ سپیرے سے محبت کا اظہار کرتی اور نہ اپنی زخمی آنسوؤں بھری داستان اسے سناتی۔ بس روتی رہتی۔ آنسو بہاتی رہتی۔ سپیرا مایوس ہو کر بیٹھ جاتا۔ حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھتا۔ ایک رات جب زاہد کی یادوں نے اسے بہت ستایا، بہت رلایا تو اس نے سپیرے کے گھر کی دہلیز پار کر لی۔

رینگتے ریگتے دریا کنارے آگئی۔ وہاں دریا کی ابھرتی، چلتی، شور مچاتی لہروں کو چیرتی ہوئی دوسرے کنارے آگئی۔ یہاں سے اپنا رخ اسی بزرگ کی طرف کر لیا جنہوں نے جکڑی ہوئی جن زادی کو آزاد کیا تھا۔ جن کی وجہ سے اسے دکھوں، مصیبتوں سے گزرنا پڑا تھا

اپنے قبضہ میں کرنے والا تو نہیں کوئی اور ہے۔ کسی اور کا میرے دل پر قبضہ ہے۔ میں تو کسی کی جدائی میں تڑپ رہی ہوں۔ اسے تلاش کر رہی ہوں جو مجھے اندھیرے، اداسیوں، ویرانیوں، آنسوؤں کی دنیا میں چھوڑ گیا ہے جو مجھے پیار کا روگ لگا گیا ہے۔

لیکن سپیرا اس کی مرجھائی آنکھوں کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ وہ تو اس کے سامنے خود زاہد کا روپ دکھانا چاہتا تھا۔ اس کے دل کا راجہ خود بننا چاہتا تھا۔ اس کے جسم کی رگ رگ میں اپنا پیار دوڑانا چاہتا تھا۔ سچی تو پاس پڑی بین پکڑ کر اسے مست کرنے لگا۔ اسے نچانے لگا۔

بین کی آواز کے ساتھ ہی کوئل مستی کے عالم میں جھونے لگی۔ ناگن سے خول صورت دوشیزہ کے روپ میں آنسوؤں میں بھیگا رقص اسے دکھانے لگی اور شاید دل میں اپنے ساجن سے شکوہ بھی کر رہی تھی کہ زاہد جان یہ کوئل تو صرف آپ کو اپنا ناچ دکھانا چاہتی تھی۔ آپ کا پیار پانے کی خاطر ناچنا چاہتی تھی۔ آپ کو اپنی طرف مائل کرنے کی خاطر مستی میں جھومنا چاہتی تھی لیکن آج آپ کی بجائے بے بسی کے عالم میں کوئی اور اسے نچا رہا ہے۔

کوئی اور اس کے جسم، اس کے چہرے کے حسن میں کھویا ہوا ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ پنجرے میں بند ناگ سانپ بھی بین کی سریلی آواز پر مستی میں جھوم رہے تھے لیکن سپیرے کو دوسرے ناگوں، سانپوں سے کیا وہ تو صرف اسے مست کر رہا تھا جیسے بہت دور سے لے کر آیا تھا۔ جس کے حسن پر مر مٹا تھا۔ جس کی گہری نیلی آنکھوں پر فریفتہ ہو چکا تھا۔

ناچتے ناچتے کوئل بے ہوش گئی۔ ایک مرتبہ پھر ناگن کے روپ میں بے سدھ سپیرے کے سامنے پڑی تھی اور سپیرا حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ رات بیتی جا رہی تھی اور سپیرا بے ہوش ناگن کے متعلق سوچوں میں گم تھا کہ وہ بنا بین کے دوشیزہ کے روپ میں اس کے سامنے آئے اور اس سے پیار کی باتیں کرے اور وہ جواب میں اسے کہے۔ ”ملکہ میں تیرا دیوانہ ہوں۔ تیری پوجا کرنے لگا ہوں۔ تمہیں دل سے چاہنے لگا ہوں۔ تیرے حسن پر خود کو بھلانے لگا ہوں۔“

لیکن کوئل نے ایسا کرنے کا سوچا بھی نہ تھا۔ وہ تو ایسے الفاظ صرف اپنے محبوب، اپنے رانجن، اپنے ساجن کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔ وہ جن زادی سے شکوہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ تو خود اسے زاہد کے قریب لائی تھی۔ زاہد کی اداس صورت کو دیکھ کر حسرت بھری نظروں کو دیکھ کر اس نے خود اسے قریب لانے کا سوچ لیا تھا۔ پھر اسے کیا علم تھا کہ جس شہزادی کو وہ اپنے

تھی۔

”کرن دیکھا ہے تم نے کوئل کو، کتنا حسن تھا اس پر اب زرد پیلی ہو گئی۔ نیلی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔ کتنا بے دردی سے ناچی تھی وہ۔ تم نہیں جانتیں، تم نے اس کے اندر کا حال نہیں دیکھا۔ اس کے بکھرے ارمانوں کو نہیں دیکھا۔ میں سب جانتا ہوں۔“ زاہد ساتھ ہی رو پڑا۔

”زاہد جان لگتا ہے آپ کے دل میں ابھی بھی اس کی بہت جگہ ہے۔ اس کی چاہت ہے۔ بھول نہیں پائے اسے۔ مجھ میں کیا کمی ہے۔ میرے پیار میں کیا کمی ہے۔ کیا میں خوبصورت نہیں۔ کیا میں حسن کی دولت سے مالا مال نہیں۔“

”خدا ارکرن بس کریں۔ اب تمہاری دنیا سے باہر نہیں نکلوں گا۔ یہیں رہوں گا۔ تیرے آس پاس تیرے قریب۔ اب مسکرا دو۔“ زاہد نے دل پر پتھر رکھ کر کہا تو زاہد کی اس بات پر کرن مسکرا دی۔

”میری جان..... جب تم کسی اور کی طرف دیکھتے ہو تو نجانے مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دوں جس پر آپ کی نظریں رکتی ہیں۔ دانتوں میں چبا ڈالوں اس کی آنکھیں جو آپ کی طرف دیکھتی ہیں۔ لہو میں بھگو دوں انہیں جنہیں تم دیکھتے ہو۔ اگر میری جان میں نے آپ سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو یہ ناگن کب کی مر گئی ہوتی۔ اس کا سر کاٹ کر سولی پر لٹکا دیتی۔ جسم کو آگ لگا دیتی۔ نیلی آنکھیں نکال کر چبا جاتی۔ تم نے روک رکھے ہیں میرے ہاتھ ورنہ..... ورنہ اس کی کیا جرأت کہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں چھوئے۔ تمہیں ہاتھ لگائے۔ کاٹ کے رکھ دوں اس کے ہاتھ پاؤں۔“

”اچھا چھوڑو یہ باتیں کیوں خود کو جلاتی ہو۔ کیوں پریشان ہوتی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ جس کا چاہو خون چوڑ سکتی ہو۔ گردن مروڑ سکتی ہو۔ چہروں کو بگاڑ سکتی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کسی دن میں بھی آپ کے ہاتھوں میں.....“

اس سے آگے کرن نے زاہد کو بولنے نہ دیا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دل جیسے ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا۔

”زاہد جان آئندہ ایسی بات کبھی بھی دل میں نہ لانا۔ یہ کرن تمہاری پجاری ہے۔ تمہارے پیار کی پیاسی ہے۔ جل کر بکھر تو جائے گی لیکن آپ کے جسم کو خراش تک نہ آنے دے گی۔ دل آپ کے پیار میں اس قدر بکڑا ہوا ہے کہ چاہتی ہوں کہ آپ ہر وقت میرے پاس

جن کی وجہ سے اسے محبوب سے جدائی کی سزا ملی تھی۔

دل کے لاکھوں کروڑوں ٹکڑے ہوئے تھے۔ چمکتی نیلی آنکھوں میں آنسو ملے تھے۔ ان کی طرف بڑھنے لگی کہ بزرگ سے پوچھے کہ اس نے اسے کس جرم کی سزا دی ہے۔ یہی سوچ کر وہ ریگتے ہوئے چلتی رہی۔ آگے بڑھتی رہی۔ قبرستان سے باہر ہی اسے بزرگ کے قریب اپنا بیٹھا ہوا محبوب دکھائی دیا تو اس کی ادا اس آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ دکھوں، اداسیوں کو بھول گئی۔ ناگن سے کوئل بن گئی۔ اپنے پیار کو دیکھتے ہی خوشی اس کے بس سے باہر ہو گئی۔ تو ناچنے لگی۔ خوشی کا اظہار کرنے لگی۔

زاہد نے بھی اسے دیکھ لیا، پہچان لیا۔ اپنے محبوب کے علاوہ بزرگ کو بھی تڑپا کر رکھ دیا۔ ان کو بھی رلا کر رکھ دیا۔ خوشی بھرا یہ رقص خونی رقص بن گیا۔ اجڑی ہوئی کوئل کو دیکھ کر زاہد پاگلوں کی طرح دیوانوں کی طرح اسی کی طرف بھاگا۔ صدموں سے چور کوئل کو جھنجھوڑنے لگا۔

”کوئل خدا کے لئے رک جاؤ۔“ محبوب کی زبانی اپنا سن کر اس کے جذبات اور زیادہ جھل اٹھے۔ یہ میٹھی آواز سننے کے لئے تو اس نے نجانے کیا کیا صدمے جھیلے تھے۔ بجائے اس کہ اس کے قدم رکتے، مزید چاؤ سے اور تیز ناچنا شروع کر دیا۔ زاہد نے اس کے مچلتے ہاتھوں کو پکڑا تو کوئل نیم بے ہوشی کے عالم میں محبوب کی بانہوں میں جھول گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مرجھائی ہوئی نیلی آنکھیں ہزاروں شکوے لئے محبوب کے چہرے پر جم گئیں۔ دل چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالے لیکن زبان پر آنے والے تمام شکوے دل میں ہی دفن ہو کر رہ گئے۔ نہ اس نے اپنے محبوب کا حال پوچھا۔ نہ اپنی اجڑی ویران زخم بھری اداسیوں بھری زندگی سے متعلق بتا پائی۔

جن زادی آئی اور اس سے چھین کر اپنے محبوب کو لے اڑی۔ کوئل آنسو بہاتی رہ گئی۔ تڑپتی رہ گئی۔ ماتم کرتی رہ گئی۔ جن زادی بھی اپنے محبوب کی بانہوں میں کوئل کو جھولتے دیکھ کر جل بھن کر سیاہ ہو گئی تھی۔ غصہ سے لال پیلی ہو گئی تھی۔

”زاہد جان میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں آپ کو اپنی دنیا سے باہر نہیں جانے دوں گی۔ اسی بات کا مجھے ڈر، خوف اور خطرہ تھا کہ میری دنیا سے باہر جاؤ گے تو وہ ناگن آپ کو ضرور ملے گی۔ ضرور آپ کے قریب ہوگی۔ ضرور آپ پر اپنا جال پھینکے گی۔ ضرور.....“

اس سے آگے زاہد نے اسے نہ بولنے دیا۔ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ذہن پر تو اس وقت صرف کوئل سوار تھی جو مرجھائی ہوئی اجڑی ہوئی ٹوٹی ہوئی دکھائی دے رہی

نواب صاحب کے جلنے پکھلنے کا سنا، مجھے کا سنا تو خوشی سے کھل اُٹھی۔ وہ جان گئی کہ اس کا محبوب یہیں کہیں ہے۔ اسے تلاش کرتا ہوا یہاں تک آ گیا تو وہ بل سے نکل کر گاؤں کو بھولے ہوئے ناگن بنے رشتہ کی ہوئی قبرستان کی طرف بڑھنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ”میری جان، میں یہاں ہوں۔ میں آ رہی ہوں آپ کے پاس۔“

بھاگتے لوگوں نے جب یہ منظر دیکھا تو کچھ تو ڈر کر بھاگ نکلے اور کچھ گہری نظروں سے یہ منظر دیکھنے لگے کہ ایک ملازم نے ہاتھ میں پکڑی بندوق کی نالی کا رخ کول پر کر دیا۔ ادھر کول پاگلوں کی طرح گاؤں والوں کی ہوش بھولے اپنے محبوب کی تلاش میں رینگ رہی تھی۔ بھاگ رہی تھی۔ اسے پکار رہی تھی۔ ”میری جان مجھے تلاش نہ کرو، میں آپ کے پاس خود آ رہی ہوں۔“

کہ یکدم ٹھاٹھ ٹھاٹھ کی آوازیں فضا میں گونجیں۔ تین گولیوں میں سے ایک گولی بھاگتی ہوئی کول کو لگی۔ وہ تڑپنے لگی اور خون میں بھیکتی ہوئی جھاڑیوں میں گھس گئی اور نجانے کہاں جا چھپی۔

”پکڑو پکڑو۔ مارو مارو، جانے نہ پائے۔“ اس گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ بھاگتے لوگ جھاڑیوں میں گھس گئے۔ اس کو ڈھونڈنے کی تلاش کرنے کی۔ ہر کسی نے کوشش کی لیکن کول دوبارہ کسی کو نظر نہ آئی۔ ادھر نواب صاحب پکھلتے پکھلتے ہڈیاں بن گئے۔

گاؤں والے ان کے جسم کا ڈھانچہ اٹھائے گاؤں لائے۔ بھائی کے جسم کی جلی ہڈیاں دیکھ کر اتری ہوئی کھال دیکھ کر دونوں بھائیوں کی آنکھیں انگاروں کی مانند سرخ ہونے لگیں۔ انہیں یقین نہ آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو جائے گا۔ اندھیرا پھیلنے سے قبل ہی اسے قبرستان میں دفن دیا گیا۔ گاؤں میں اعلان ہو گیا کہ ”جاگیردار کی موت پر تین دن تک سوگ منایا جائے گا۔ اگر ان تین دنوں میں کسی کے لبوں پر مسکراہٹ بکھری دیکھی گئی تو اس کی زبان کاٹ دی جائے گی۔ جس کسی نے سفید کپڑے پہنے اسے آگ لگا دی جائے گی۔“

اس اعلان نے گاؤں والوں کو ہلا کر رکھ دیا لیکن خاموش اور چپ رہے۔ ایک مرتبہ پھر لوگوں کے چہروں پر ڈر، خوف پھیلنے لگا۔ وہ تو سمجھ بیٹھے تھے کہ مجسمہ زاہد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا ہے۔ ان کی جان بخشی ہو گئی لیکن نواب صاحب کا جلا ہوا پگھلا ہوا جسم دیکھ کر وہ کانپ کر رہ گئے۔

گاؤں میں ایک طوفان برپا تھا۔ جاگیردار حیات جیج رہا تھا کہ ”اس کے بھائی کو

میرے قریب رہا کریں۔ اسی لئے تو دنیا والوں سے چھین کر یہاں لے آئی ہوں۔ یہاں آپ ہیں یا پھر میں۔“

دنیا والوں کا نام سنتے ہی زاہد کو اپنی بہنوں کے سرخ پھند لہراتے دکھائی دیئے تو چیخا۔

”جلا کر رکھ دوں گا سبھی ظالموں کو۔ اجاڑ دوں گا ان حویلیوں کو جنہوں نے میرے گھر کو جلایا ہے۔ قبروں میں پہنچا دوں گا ان کو جنہوں نے میرے گھر والوں کو قبروں میں سلایا ہے۔“

زاہد کی انگارے ابھارتی آنکھیں دیکھ کر کرن سمجھ گئی کہ اسے گھر والے یاد آ گئے ہیں۔ خون میں بھیکے ہوئے اپنوں کے چہرے یاد آ گئے تھے۔ گردن میں بندھے پھندے یاد آ گئے ہیں اور وہ اُن سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ ختم کرنا چاہتا ہے۔ جلا دینا چاہتا ہے۔ پگھلا دینا چاہتا ہے۔ تب وہ اسے اٹھائے جاگیردار کے گاؤں کے قبرستان میں لے آئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں بھی اس کے محبوب کے دُشمن پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں ہی اس کے گھر والوں کو قبروں میں پہنچانے والے بستے ہیں۔

رات کے اندھیرے میں کرن گاؤں گئی اور حویلی میں جاگیردار نواب کو لے کر آ گئی۔ جاگیردار مستی کے عالم میں گاؤں سے نکل کر ایسے قبرستان کی جانب بڑھ رہا تھا جیسے اسے زمانہ بھر کا ہوش نہ ہو۔ ایسے جیسے کوئی اس کا بازو پکڑے۔ لئے جا رہا ہو۔ حالانکہ کرن خود اس کے جسم میں چلتے ہوئے خون کو نچوڑ سکتی تھی۔ ختم کر سکتی تھی۔ قبر میں پہنچا سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہ کیا کیونکہ یہ شکار صرف اس کے محبوب کا تھا۔ اس کے جن کا تھا۔

جب جاگیردار نواب قبرستان پہنچا تو زاہد کو اپنا وقت یاد آ گیا۔ اس شخص کے زہریلے الفاظ یاد آ گئے تو زاہد کی آنکھیں بھڑک اُٹیں۔ اس کی جلتی آنکھوں کی تپش اس کے جسم کو جلائے لگی۔ وہ بنا حرکت کے کھڑا رہا۔

جب زاہد اپنا کام کر چکا تو کرن اسے لئے غائب ہو گئی۔ چند ماہ سے گاؤں میں سکون رہنے کے بعد جب صبح سویرے ہی نواب صاحب کے جلنے کی، پکھلنے کی خبر حویلی پہنچی تو ہر کوئی مجسمے مجسمے کی آوازیں لگاتا ہوا چہروں پہ ڈر اور خوف کے واضح اثرات لئے قبرستان کی جانب بھاگنے لگا۔

کول جو اپنے محبوب کا بدلہ لینے کی غرض سے بل میں چھپی بیٹھی تھی۔ جب اس نے

مل سکے گا تو ترستی رہے گی اس کی صورت کو۔

ماری ماری پھرتی رہے گی لیکن اسے ڈھونڈ نہ سکے گی۔ اگر میں نے زاہد جان سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو تیرے جسم کو جلا کر راکھ کر دیتی۔ تیری رگوں میں دوڑتے خون کو نچوڑ لیتی۔ تیرے جسم میں چلتی سانسوں کو کھینچ لیتی۔“ کرن کی ان باتوں سے ہر طرف سے بھیا تک قہقہے بلند ہونے لگے۔ عجیب و غریب صورتیں ظاہر ہونے لگیں۔

”زاہد کی دیوانی دیکھ تو کون ہے۔ ناگن ہے ناگن۔“ دل چیرنے والی باتیں سن کر زخمی لڑکھاتی کول پھر بھی چپ رہی۔ خاموش رہی۔ لبوں کو سیسے رکھا۔ ہر بات سختی رہی۔

ورنہ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح چلائے کہ ”ہاں ہاں میں ناگن ہوں لیکن تو کون ہے۔ چڑیل، ڈائن، انسانوں کے خون سے پلنے والی۔ انسانوں کے جسموں کو نوچنے والی۔ تم کیسے وفا کر سکتی ہو۔ کیسے انسان سے پیار کر سکتی ہو۔ انسانوں کی تم دشمن ہو۔

زاہد تجھ سے نہیں مجھ سے پیار کرتا ہے۔ تمہیں نہیں مجھے چاہتا ہے۔ یہ جو تیرے ارد گرد بھیا تک شکلوں والیاں گھوم رہی ہیں ناں تو بھی ان کی طرح بد صورت ہے۔ تیرا یہ حسن بناوٹی ہے۔ تو باہر سے بھی کالی ہے، اندر سے بھی کالی ہے۔“ اگر یہ تمام باتیں کول زبان پر لے آتی تو ہو سکتا تھا وہاں ہنگامہ ہو جاتا، جنگ چھڑ جاتی اور یہ ڈائن اس کے زاہد کو جان سے مار دیتی۔ اپنے محبوب کی خاطر وہ کرن کی ہر برداشت کرتی رہی۔ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ کڑھتی رہی۔ جلتی رہی۔ روتی رہی۔ ٹوٹی رہی لیکن زبان سے کچھ نہ بولی۔

کرن قہقہے لگاتے ہوئے کول کو رلاتے ہوئے تڑپاتے ہوئے غائب ہو گئی۔ باقی خوفناک شکلوں والی چڑیلیں بھی غائب ہو گئیں۔ زخمی حالت میں لڑکھراتے ہوئے کول ٹوٹے دل کے ساتھ نیچے زمین پر گر پڑی۔ ایک سوچ اس کے دل میں ابھری۔

”میں تو اپنے ساجن کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر وہ کرن کے ساتھ خوش ہے تو کول تو کیوں اداس ہے۔ تو کیوں روتی ہے۔ تو کیوں تڑپتی ہے۔ اپنے ساجن کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر کیوں جلتی ہے کیوں روتی ہے۔ کیوں چلاتی ہے۔ ذرا سوچ تو سہی تو کیا کر رہی ہے۔ کرن کا اس پر زیادہ حق ہے۔ وہ تجھ سے پہلے اس کی عاشق تھی۔ اس کی پجارتھی۔ تو کیوں ان کی محبت میں رکاوٹ ڈال رہی ہے۔ تو تو خود غرض نکلی ہے۔ اپنی خوشیوں کی خاطر لڑ رہی ہے۔ تو نے اس سے پیار کیا ہے۔ تو تجھے کون کہتا ہے کہ چھوڑ دے اسے۔ ہمیشہ بسائے رکھ اپنے دل میں اپنے محبوب کا پیار۔ تجھے تو بدلہ لینا ہے

جلانے پکھلانے والا زندہ نہیں بچے گا۔ اس کی کھوج لگا لوں گا۔ وہ ایک ایک کر کے ہم سبھی کو ختم کرتا جا رہا ہے لیکن اب زندگی موت کا کھیل ختم۔ وہ مجسمہ، وہ کیمن ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا لوگوں کے دلوں میں خوف و ہراس پھیلا چکا ہے۔ لوگوں کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔ وہ اپنی جانیں بچانے کے فکر میں ہیں۔ ہم لوگ کب تک یوں چپ چاپ یہ اموت دیکھتے رہیں گے۔ حویلیوں کو اجڑتے دیکھتے رہیں گے۔ نمبردار جو آدم چپ کیوں ہو، تم نے کیا سوچا ہے؟“

”بھیا سوچ لیا جتنا سوچنا تھا، اب وہی فیصلہ میرا ہے جو آپ کا ہے لیکن نجانے وہ کجنت کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ حیرانگی والی بات یہ ہے کہ جاگیردار وہاں قبرستان تک پہنچا کیسے؟ اسے وہاں موت کھینچ کر لے گئی ہے یا وہ مجسمہ خود یہاں آگھسا تھا۔“

جاگیردار نواب کا اکیلے قبرستان پہنچنا حویلی والوں کے لئے ایک معمہ بنا ہوا تھا۔ بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ اتنی رات گئے انہیں قبرستان جانے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ کیا ناگن تو یہاں نہیں آگھسی تھی۔ کیا اس نے تو اپنا حسین چہرہ انہیں دیکھا کر ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن ایسا نہ تھا کیونکہ جاگیردار نواب دبدبے والے انسان تھے۔ عورتوں کو اتنی اہمیت نہ دیتے تھے۔

آدھی سے زیادہ رات گزری ہوگی کہ قبرستان سے بہت دور ویرانے میں بے ہوش پڑی کول کو ہوش آیا۔ جسم خون میں بھیگا ہوا تھا۔ ٹانگ کے اندر انگلیاں ٹھونس کر گولی نکالی۔ سرخ دوپٹے کو پھاڑ کر پٹیاں باندھیں اور دوبارہ زخمی حالت میں ادھر ادھر اپنے محبوب کو تلاش کرنے لگی۔ اسے پکارنے لگی۔

”زاہد جان کہاں چھپے بیٹھے ہو۔ میں یہاں ہوں، میرے سامنے کیوں نہیں آ رہے؟ کیوں تڑپا رہے ہو؟ کیوں رلا رہے ہو۔ کیوں ترسا رہے ہو۔ زاہد جان مجھ سے ایسا مذاق نہ کرو۔ سامنے آ جاؤ۔“ وہ زاہد کو تلاش کر رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری تھی۔ لمبی جدائی اسے تڑپا رہی تھی۔ محبوب کی یادیں اسے ستا رہی تھیں۔ ویرانے کے کونے کونے میں اسے تلاش کر رہی تھی کہ اس کے کانوں میں قہقہے گونجے۔

پھر ایک صورت دکھائی دی۔ یہ صورت کرن کی تھی جو کول کی بے بسی اور اپنی کامیابی پر قہقہے لگا رہی تھی۔ ”چھان مارو ان ویرانوں کو لیکن تمہیں زاہد نہیں ملے گا۔ زاہد تجھ سے نہیں مجھ سے پیار کرتا ہے۔ تجھے نہیں مجھے چاہتا ہے۔ اسے تیری نیلی آنکھوں سے نفرت ہے۔ تیرے چٹے چمڑے سے نفرت ہے۔ تو کیا سمجھتی ہے کہ تو اسے پالے گی، ہرگز نہیں۔ وہ کبھی بھی تجھے نہ

میرے ہاتھ سے اب کوئی نہیں بچے گا۔“ جاگیردار اس کی زبان سے دلیرانہ باتیں سن کر عرش کراٹھا۔ اس کے دل میں اس کے لئے اور زیادہ پیار بڑھ گیا۔

اس نے کہا۔ ”اے حسینہ اب تم اکیلی نہیں ہو۔ بہت مضبوط ہاتھوں میں ہو۔“ ساتھ ہی وہاب نے اپنی گردن اکڑالی۔ ”جن لوگوں نے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیئے ہیں، میں ان سب کو زندہ جلا دوں گا۔ جیسی سزا چاہو گی، اسے دوں گا۔ میں دوں گا تیرا ساتھ۔ ہر قدم، ہر موڑ پر۔“

کول کی زبان سے نکلا تیرسیدھا نشانے پر لگا تھا۔ وہ بار بار اپنی نیلی آنکھوں سے وہاب کی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ آج نشانے میں آنے والی یہ بڑھیا ہوگی جس نے انوکھے بیٹوں کو جنم دیا ہے۔ اس کے محبوب کے دشمنوں کو جنم دیا ہے۔

دل تو چاہتا تھا کہ ابھی اس کی گردن دبوچ لے لیکن پھر صبر کیا۔ حوصلے سے کام لیا۔ رات مالکن نے کول کو اپنے کمرے میں ہی سلا یا۔ تقریباً آدھی رات کو کول اپنے بیڈ سے نیچے اتری۔ اپنے لیوں پر زبان پھیرنے لگی۔ نیلی آنکھوں میں وحشت ابھرنے لگی۔ سامنے لیٹی ہوئی مالکن کی گردن پر اپنے زہریلے دانت رکھ دیئے۔ وہ چیخنے لگی تھی کہ اس نے اپنا ہاتھ مالکن کے منہ میں ٹھونس دیا۔ سانسیں رکنے لگیں۔ جسم میں دوڑتا خون کول کی رگوں میں جانے لگا۔ تڑپتے تڑپتے مالکن نے جان دیدی۔

مالکن کو کیا خبر تھی جسے وہ اپنے پاس سلا رہی ہے۔ یہی اس کے لئے موت کا فرشتہ ہوگا۔ وہی اس کو ڈس لے گی۔ وہی اس کا خون نچوڑ لے گی۔ وہی اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے گی۔ کول نے اپنے زہریلے دانت گردن سے باہر نکالے۔ دانتوں اور لیوں پر جمع خون صاف کیا۔ کمرے کا دروازہ کھولا اور ایک چیخ مارنے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے کی آوازیں سن کر دونوں بھائی، بہو بھاگتے ہوئے کمرے تک گئے۔ کول نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ سامنے پڑی ماں کی مردہ لاش کو دیکھ کر وہ تڑپ کر رہ گئے۔

”یہ سب کیسے ہو گیا۔“ سبھی پریشان غموں سے مڑھال سوچوں میں غرق تھے۔ کول روتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔

”میں نے رات کو ایک بد صورت شکل والی چڑیل کو ان پر جھکے ہوئے دیکھا تو چیخ پڑی۔“

چڑیل کا لفظ سننے ہی وہاں کھڑے بیٹوں، ملازموں، نوکرانیوں کے رنگ اڑ گئے۔

اپنے محبوب کے دشمنوں سے۔ اپنے پیار کی خاطر جان کی قربانی دینی ہے۔ محبت کی خاطر مرنا ہے۔ اُس نے اپنے محبوب کے دشمنوں کو۔ نچوڑ لے خون اپنے محبوب کے دشمنوں کا۔“ کول کے ذہن میں گھومنے والی اس سوچ نے ایک نئی لہر پیدا کر ڈالی۔ اس نے آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو صاف کیا اور حسینہ کے روپ میں لڑکھڑاتے ہوئے چل دی۔

چلتے چلتے ڈمگاتے قدموں وہ جاگیردار کے گاؤں کے قریب جا پہنچی۔ گاؤں ایک حسن سے بھری، نیلی آنکھوں والی دوشیزہ کو دیکھتے ہی سب سے چھوٹا بھیا جاگیردار وہاب اس کے حسن پر مر مٹا۔ اب صرف دونوں ہی بھائی تھے۔ نمبردار بھی ان کا ہی بھائی تھا۔

وہ دونوں شادی شدہ تھے جبکہ جاگیردار کے ان دونوں بیٹوں میں ایک کنوارہ تھا۔ بڑے بھائی نمبردار کے گھر بیاہے تھے۔ دو بھائی مجسمے کے ہاتھوں ختم ہو چکے تھے۔ مجسمے کی انتقامی جنگ میں مارے گئے تھے۔ زاہد ایک طوفان بنے، ایک آگ بنے، ایک شعلہ بنے اپنے خاندان کے اجڑنے کا انتقام لئے جا رہا تھا۔ ان بڑے لوگوں کے ہاتھوں ہی اس کا تمام خاندان قبروں میں اترا تھا اور وہ کیسے برداشت کر پاتا کہ اس کے دشمن اس پر گردنیں اکڑا کر چلیں۔

کول ڈمگاتے قدموں جاگیردار کے گاؤں پہنچتے ہی نیچے گر پڑی۔ کرن کی باتیں اس کے دل کو چیر رہی تھیں۔ ریزہ ریزہ کر رہی تھیں۔ وہ پیار میں ناکامی پانے کے بعد دوبارہ ناگن بن گئی تھی اور اب ایک دوشیزہ کے روپ میں ہی ہر کسی کے خون کی پیاسی بن گئی تھی۔

کرن کی زبانی نکلنے والے نشتروں نے اسے ایک مرتبہ پھر آنسوؤں کی دنیا میں پہنچا دیا۔ جاگیردار وہاب اسے دیکھتے ہی اپنے من مندر میں سجانے لگا۔ آنکھوں میں بسانے لگا۔ اسے گری ہوئی کو خود ہی سہارا دے کر حویلی کے ایک بڑے سے کمرے میں بٹھایا اور اس کی زندگی کے بارے میں دریافت شروع ہو گئی۔

جاگیردار حیات اس کی بیگم اور بڑی مالکن اسے زخمی حالت میں دیکھ کر پوچھ گچھ میں مصروف تھے لیکن اسے تو پیار کا روگ تھا۔ ظاہری زخموں کی پروا نہ تھی۔ دل پر چلنے والے برچھوں نے اس کی آنکھوں میں آنسو ظاہر کر دیئے تھے۔ دل میں دبائے ہوئے جذبات کو نہ روک سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

روتے ہوئے صرف ایک ہی بات کہے جا رہی تھی۔ ”تمام زمانے کا خون نچوڑ لوں گی، کسی کو معاف نہیں کروں گی۔ ہر کسی کو ڈس لوں گی۔ ہر کسی کی رگوں میں زہر اٹیلوں گی۔“

”مجھے لگتا ہے کہ اس حسینہ نے ہی ماں جی کو ڈسا ہے۔ ایک ہی رات دونوں اکٹھی سوئی ہیں۔“ جاگیردار حیات نے نجانے کیا سوچ کر دوبارہ بات چھیڑ دی۔

”سنا تو میں نے بھی تھا کہ مجھے کے ساتھ ایک خوبصورت حسینہ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے حسن کو دیکھ کر لوگ دیوانے ہو رہے تھے اور اب پتہ چلا کہ وہ حسینہ یہی تھی۔“

”بھیا چپ رہیں، کہہ دیا ہے ناں کہ ماں کا تین دن کا سوگ رہے گا۔ اس کے بعد فیصلہ ہوگا۔ اگر یہ قاتل ثابت ہوگئی تو اس کے جسم میں زہر پھیلانے والی سب سے پہلی گولی میری ہوگی۔ مجھے سے کیا رشتہ ہے اور ماں کیسے مری، ہر سوال کا جواب اس سے پوچھا جائے گا لیکن ابھی خاموش رہنا ہوگا کیونکہ یہ حویلی کے وقار کی بات ہے اور ہمیں اپنی عزت و ناموس سب سے عزیز ہے۔“

فیصلہ یہ ہوا کہ اسے ایک کمرہ میں بند کر دیا جائے اور تین دن تک اسے بھوکا پیاسا رکھا جائے لیکن وہاب کو یہ فیصلہ پسند نہ آیا کیونکہ بھوکے پیاسے رکھنے والی بات اس کے دل کو نہ لگی تھی لیکن یہ کول کی سزا تھی۔ کول اپنے متعلق ہونے والے فیصلہ کو دلچسپی سے سن رہی تھی۔

جاگیردار وہاب کی ایک نہ چلی۔ کول کو کمرے میں بند کر دیا گیا۔ ماں کی میت کمرے میں پڑی ہوئی تھی لیکن حویلی والوں کی آپس میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ دونوں بھائی الجھ رہے تھے۔ جاگیردار حیات اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا کہ ماں کی میت اس وقت تک نہیں اٹھائی جائے گی جب تک اس حسینہ، اس لڑکی کو ختم نہ کر دیا جائے گا۔ پہلے اس کے جسم کے ٹکڑے قبر میں رکھے جائیں گے۔ پھر ماں کو دفن کیا جائے گا۔

لیکن وہاب کسی صورت بھی حیات بھائی کی یہ بات نہیں مان رہا تھا۔ وہ چلا رہا تھا کہ ”پہلے تحقیقات ہوگی۔ اگر یہ مجرم ہوئی، حویلی والوں کی قاتل ہوئی تو اسے حویلی میں جو بھی مشورہ ہوگا، اس کے مطابق سزا دی جائے گی۔ جتنے چاہیں گے اس کے جسم کے ٹکڑے کریں گے لیکن پہلے ماں کو دفن کر لیں۔“

اس چھڑی جنگ میں ایک طرف وہاب تھا تو دوسری طرف پوری حویلی والے، گاؤں والوں کو گھروں میں بھیج دیا گیا کیونکہ حویلی والوں کا مسئلہ تھا۔ بند کمرے میں بحث چھڑی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے میں ماں کی میت تباہ پڑی تھی۔ میت والا کمرہ بند تھا۔ ایک کمرے میں کول بند دوسرے کمرے میں ماں کی میت بند اور تیسرے کمرے میں چھڑی ہوئی جنگ تھی کہ ماں کی میت کو اس وقت تک دفن نہیں کریں گے جب تک ان کی قبر میں اس چڑیل کا،

خوف سے چہروں پر زردی چھانے لگی کیونکہ مجھے کے ارد گرد گھومنے والی چڑیل کا خیال دل و دماغ پر چھا گیا کہ ماں کی موت اسی نے کی ہے۔ اسی نے انہیں ختم کیا ہے۔

رات کو ہی نمبردار جواد اور نواد آگئے۔ نمبردار جواد کی نظر آتے ہی سامنے بیٹھی روتی ہوئی کول پر پڑی تو اسے خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔ کول بھی اسے پہچان گئی۔ نمبردار نواد کو بھی پہچان گئی۔ جب نمبردار مراد کی آنکھیں نکالی تھیں تو انہوں نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن حویلی کی دہلیز عبور کرنے کے بعد انہیں وہ مل نہ سکی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر کول کی نیلی آنکھوں میں بھی وحشت ٹپکنے لگی۔ دل چاہ رہا تھا کہ ان سب کا کھڑے کھڑے تمام خون نچوڑ لے۔

نمبردار جواد نہ رہ سکا۔ ”حیات صاحب یہ لڑکی یہاں کیسے آگھسی ہے۔ جانتے ہو، یہ لڑکی کون ہے۔“ جواد کی زبانی نکلنے والے یہ الفاظ سن کر سامنے پڑی ہوئی ماں کی میت کو بھول کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”کون ہے یہ؟“

”اس نے بڑے بھائی مراد کی آنکھیں نکالی تھیں۔ اس نے ہی انہیں اندھا کیا تھا۔ اس نے ہی ان کی دنیا اندھیر کی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ وہی ہے۔“ اس سے قبل کہ جاگیردار حیات آگے بڑھتا، وہاب سامنے آ گیا اور بولا۔

”کوئی بھی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گا۔ میں خود کول سے بات کروں گا۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔“

”وجہ کیا ہوگی وہاب صاحب، اسے تو میں نے خود ویرانے میں دیکھا تھا۔ دریا کے بیچ جزیرے میں اسے مجھے کے قریب دیکھا تھا۔ مراد اس کے حسن پر مر مٹا تھا، اسے اپنا نا چاہتا تھا لیکن اس نے اسے دھتکار دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ہر بات کی پوچھ گچھ ہوگی لیکن ابھی نہیں، پہلے ماں کو دفن کر لیں۔“

تب نمبردار جواد کی باتوں سے حویلی میں ایک انتشار پھیلنا ہوا تھا۔ ہر کوئی نیلی آنکھوں والی کول کو خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ صرف وہاب خاموش تھا۔ شاید کول کا جادو وہاب پر چل چکا تھا۔ ویسے بھی اب کول کو اپنی زندگی کی پروا نہ تھی۔ وہ تو جلے نصیبوں والی تھی جسے چاہا تھا، جسے دل میں بسایا تھا، جسے آنکھوں میں سجایا تھا۔ جب وہ ہی نہ ملا تو پھر جینے کا کیا فائدہ تھا۔

تھا اور ہو سکتا ہے کہ کوئل کے روپ میں چڑیل نے ہی بھیا نمبردار مراد کی آنکھیں نکالی ہوں۔ ہر بات کی تحقیقات ضروری چیز ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن کوئل ابھی فیصلہ سے باہر نہیں ہوئی۔ تین دن کمرے میں بند رہے گی اور تین دن کے سوگ کے بعد اسے ہر بات کا جواب دینا ہوگا کہ وہ یہاں تک کیا مقصد لے کر آئی ہے کیوں آئی ہے اور بس.....“

صبح ہوگئی۔ ماں کی میت کو نہلایا گیا۔ غسل دیا گیا اور پھر قبرستان لے جایا گیا۔ وہاں قدم قدم پر خوف تھا کیونکہ جس قدر یہ خوفناک قبرستان تھا، اس سے بڑھ کر چڑیلوں کے نمودار ہونے کا خدشہ تھا کہ جس طرح انہوں نے ماں کی میت کو غائب کر دیا تھا۔ اس طرح وہ اسے قبر سے بھی نکال سکتی ہیں، لہذا اس کی قبر کی حفاظت کرنی چاہئے۔ تین چار ملازموں کی قبرستان ڈیوٹی لگا دی گئی کہ جو چیز بھی سامنے آئے، گولی چلا دی جائے۔ اس کے بعد ماں کو دفن کر دیا گیا۔

گاؤں والوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ چڑیلیں ضرور کچھ نہ کچھ کریں گی جنہوں نے حویلی میں گھس کر لاش کو غائب کر لیا تھا۔ اسی طرح کسی اور انسان کو بھی غائب کر سکتی ہیں۔ خون بہا سکتی ہیں۔ جسوں کو علیحدہ کر سکتی ہیں۔

دن اسی طرح گزر گیا، رات ہوگئی۔ قبرستان سے خبریت کی خبر ملی کہ کوئی بھی چیز ظاہر نہیں ہوئی۔ صبح ہوگئی۔ ہر کوئی کنکاش اور سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہو رہا ہے کیونکہ ماں کو زائد نہیں جلایا تھا۔ اگر ماں مجسمے کا نشانہ بنتی تو ضرور ان کا جسم پگھلتا جھلتا لیکن اسے یا تو چڑیل نے مارا تھا یا پھر کوئل نے لیکن ماں کے مرنے کے بعد ڈاکٹروں کو دکھانے پر یہ بات سامنے آئی تھی کہ اسے کسی زہریلی چیز نے کاٹا ہے۔ سانپ ناگ وغیرہ نے لیکن وہاں کمرے میں نہ تو ناگ تھا اور نہ سانپ۔ ضرور چڑیلوں نے ہی انہیں زہریلی موت دی ہوگی۔

جب تیسرا دن ہوا، کوئل کی زندگی موت کے فیصلے کا دن تو نمبردار دونوں بھائی آگئے۔ وہاب حیات دونوں بھائی بھی بیٹھ گئے لیکن وہاب کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ سوچوں میں گم تھا۔ نجانے کیوں وہ کوئل کو مرنے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نجانے کیوں وہ اس کے خلاف فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دل چاہا کہ کہہ دے بھیا ماں تو مر گئی ہے۔ تم تمام جائیداد سنبھالو اور کوئل کی جان بخشی کر دو تا کہ وہ اسے لے کر دور چلا جائے۔ ایسی جگہ جہاں وہ دونوں ہوں۔ دوسری سوچ اس

اس قاتل کا، اس حسینہ کا خون نہیں داخل کریں گے لیکن بالاخر جاگیردار وہاب نے اپنی بات منوالی کہ ماں کو دفن کرنے کے بعد کوئل کے متعلق فیصلہ ہوگا، لہذا کوئل کا تین دن تک دروازہ نہ کھولنے کا فیصلہ ہو گیا۔ تب ماں کے کمرے کی طرف چلے گئے۔

لیکن وہاں کمرے میں خالی چارپائی دیکھ کر سبھی کے رنگ اڑ گئے۔ ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ رات کے سائے میں چیخ و پکار سے گاؤں والے پھر آگئے۔ جاگیردار حیات چیخ رہا تھا ”ماں کو کس نے غائب کیا ہے۔ کون کمرے میں گھس کر اسے لے گیا ہے؟“

افراتفری دیکھ کر کمرے میں بند کوئل سمجھ گئی کہ کرن ان کی لاش کو غائب کر دیا ہے۔ وہی اسے اٹھا کر لے گئی ہوگی کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسرا یہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ کوئل کا خیال ٹھیک تھا۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ دوسرے اندھیرے کمرے میں مالکن کی میت کو دیکھ کر لوگ ٹھٹک کر رہ گئے۔

اندر حسین و جمیل دو شیرازوں کا قفس ہو رہا تھا۔ مالکن کی میت کے ارد گرد ناچ رہی تھیں۔ کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ جا کر اندر سے مالکن کی لاش لے آئے۔ گاؤں میں یہ بات پوری طرح پھیل چکی تھی کہ مالکن کی لاش چڑیلوں کے قبضہ میں ہے اور وہ اس کے ارد گرد منڈلا رہی ہیں۔

نمبردار جواد، فواد نے ہمت کی اور فائر کھول دیئے۔ ان فائر کی آوازوں کے ساتھ ہی تانچے والی شیرازیاں غائب ہو گئیں۔ تب آگے بڑھے اور مالکن کی لاش کے قریب ہو گئے۔ حویلی میں پھیلنے والی افراتفری سے کوئل خوش ہو رہی تھی کہ جن زادی نے خوف و ہراس برپا کیا ہوا ہے۔ یہ خود تو بندھی ہوئی تھی۔ جکڑی ہوئی تھی۔ موت کے قریب تر تھی۔ چند دن کی مہمان تھی۔ کسی وقت بھی وہ اس کے جسم کے ٹکڑے کر سکتے تھے۔ صرف آنسو بہا کر رہ گئی۔

شہزادی نے سچ ہی کہا تھا کہ وہ کیا چیز ہے صرف ناگن ہے اور ایسی ناگن جو بے بس اور بندھی ہوئی وہ کسی طرح بھی شہزادی کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ کسی طرح بھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور شاید اپنے محبوب کے دل کو نہ جیت سکتی تھی۔ اس کے دل پر بھی اپنا راج نہ کر سکتی تھی۔ اسے موت ہی منظور تھی۔ اب زندگی کی تمنا نہ تھی۔ سو آنسو بہاتی رہ گئی۔

باہر ویسے ہی افراتفری تھی۔ ویسے ہی باتیں گونج رہی تھیں۔ ”دیکھ لیا بھیا، تم کوئل کو قصور وار کہتے تھے۔ اسے قاتل کہتے تھے۔ اب بتائیں آپ جذباتی ہو گئے تھے۔ دیکھ لیا چڑیلوں کو انہوں نے ماں کو مارا ہے۔ کوئل ٹھیک کہہ رہی تھی کہ اس نے ماں پر جھگی ہوئی چڑیل کو دیکھا

”کیسے ہیں میرے دل کے راجہ، کیسے ہیں میرے محبوب۔ کیسے ہیں میرے جسم و جان کے مالک۔“ اپنے محبوب کا نام سنتے ہی کوئل اپنے جذبات پر کنٹرول نہ کر سکی۔

”صرف ایک بار مجھے ان کی ایک جھلک دکھا دو۔ ایک نیکی تم نے میری جان بچا کر کی ہے۔ دوسری نیکی مجھے میرا محبوب دکھا کر کر دو۔“

”بہت بے چین ہو ان سے ملنے کو لیکن وعدہ کرو دوبارہ کبھی ان کا سامنا نہیں کرو گی۔ انہیں صرف میرے لئے چھوڑ دو گی۔“

”ہاں ہاں وعدہ رہا۔ صرف ایک مرتبہ مجھے ان سے ملا دو۔ پھر کبھی بھی تم دونوں کی زندگی میں نہ آؤں گی کبھی بھی۔“

کوئل روئے جا رہی تھی۔ نجانے کیوں کرن کو اس کے آنسو بہاتے چہرے پر ترس آ گیا۔ حالانکہ وہ خود اس کی سب سے بڑی دشمن تھی۔ وہ خود کوئل کو مار دینے، جان لینے کی دھمکیاں دے چکی تھی۔ اسے دیکھتے ہی زاہد کی یاد آ جاتی تھی کہ یہ ناگن بھی اس کے پیار کی حقدار بننا چاہتی ہے۔ اسے اپنا سمجھتی ہے اور کرن یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ کوئی اس کے پیار پر ڈاکہ ڈالے۔

”چلو میرے ساتھ۔“ کرن نے اتنا کہا۔ کوئل کا ہاتھ تھاما اور لمحوں میں ایک خوبصورت کمرے میں لے کر چلی گئی۔ یہاں جنات کا پہرہ تھا۔ کوئل سامنے شیشے کے بند کمرے میں آنکھیں بند کئے بیٹھے اپنے شہزادے کو دیکھ کر چلا اٹھی۔

”زاہد جان زاہد۔“ لیکن کمرے میں کوئی ایسا راستہ نہ تھا جہاں سے اس کی آواز اندر کمرے تک جاتی۔ زاہد ویسے کا ویسا ہی آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا اور کوئل باہر اسے دیکھ کر تڑپتی رہی، چلاتی رہی، پکارتی رہی، آوازیں دیتی رہی۔ آنسو بہاتی رہی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اس دیرانے میں کھڑی تھی جہاں سے کرن اسے لے کر گئی تھی۔

”کوئل میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ اب تم اپنا وعدہ پورا کرو۔ دوبارہ ہم دونوں کے بیچ میں آنے کی کوشش نہ کرنا۔“

کوئل نے ایک حسرت بھری، آنسوؤں سے بھیگی نظر کرن پر ڈالی اور ہارے ہوئے انسان کی مانند واپس چل پڑی۔ کرن اپنے محبوب کے پاس چلی گئی اور کوئل نے تنہا اداس مر جھائے چہرے کے ساتھ ڈمکاتے قدموں سے چلتے ہوئے اسی بزرگ کے قریب جا ڈیرہ جمایا جن کی وجہ سے کرن کو زنجیروں سے رہائی ملی تھی۔

کے دماغ کو بھی ہلا رہی تھی کہ پہلے دن کوئل کی آوازیں کمرے سے آتی رہی تھیں۔ دوسرے دن بھی آتی رہی تھیں لیکن رات سے اس کی آوازیں نہ آئی تھیں۔ کہیں وہ بھوک پیاس سے ہی تو نہیں مر گئی ہوگی۔ کہیں اس نے گلے میں پھندا تو نہیں ڈال لیا ہوگا۔ ادھر حیات بھائی اور نمبرداروں کی آنکھیں شعلے برپا کئے ہوئے تھیں۔

”وہاب کیا سوچ رہے ہو، اٹھو جاؤ کوئل کو کھیت کر یہاں لاؤ۔“

وہاب ٹوٹے قدموں کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھا۔ کانپتے ہاتھوں سے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا اور تین دن سے لاک شدہ دروازہ کھولا تو اندر کا منظر دیکھتے ہی ساکت ہو گیا۔ مجسمہ بن گیا۔

پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی حویلی میں بیٹھے جرگے کو دیکھتا اور کبھی کمرے کو گھورتا۔

”کیا بات ہے وہاب! یوں پھٹی پھٹی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہو۔ کیا وہ ناگن اندر بھوک پیاسی مر گئی ہے؟“

لیکن وہاب نے کوئی جواب نہ دیا اور اندر کمرے میں گھس گیا۔ کبھی چارپائی کے نیچے دیکھتا۔ کبھی دیواروں کو لیکن اندر کمرے میں کوئل کا نام و نشان تک نہ تھا۔

”بھیا کوئل یہاں نہیں ہے۔“ اس ایک لفظ سے حویلی میں افراتفری مچیل گئی۔ ہر کوئی حسرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگا۔ چہروں پر خوف ابھر رہا تھا۔

چڑیلوں، جنات، بھوتوں کے خیالات دلوں میں خوف پیدا کرنے لگے تھے۔ ماں کی موت، بھیا کی موت اور ہر کسی کی موت کا سبب سمجھ میں آ گیا تھا۔ ہر کوئی کمرے میں اسے تلاش کر رہا تھا۔ جیسے وہ یہیں کہیں چھپی بیٹھی ہو لیکن یہ ان کا وہم تھا کیونکہ خالی کمرے سے انہیں کچھ نہ ملا۔

”تو نے ایک بار میری زندگی بچائی تھی۔ آج میں نے تیری زندگی بچا کر تیرا احسان ادا کر دیا ہے۔“

ایک دیرانے میں کرن نے قہقہے لگاتے ہوئے سامنے کھڑی کوئل سے کہا۔ ”جانتی ہو وہ لوگ تیرے جسم کا قہقہہ بنانے کے پروگرام بنا رہے تھے۔ تو نے مجھے زندگی دی تھی اور آج میں نے تجھے بچا لیا ہے۔“ کوئل حسرت بھری نظروں سے کرن کا چہرہ دیکھ کر جا رہی تھی۔ کرن قہقہے لگائے جا رہی تھی۔

”تم نے پوچھا نہیں، زاہد کیسا ہے، کہاں ہے؟“ قہقہے لگاتی کرن بولی۔

نمبردار کی بیوی حویلی سے باہر نکلی تو ایک جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہیں اس کا جسم جلنے لگا۔ وہ پکھلنے لگی۔ نمبردار کے ملازموں نے اس آتش آکھوں والے زاہد پر گولیاں برسائیں لیکن کوئی چیز اسے طوفان کی سی تیزی سے لے اڑی۔“

زاہد کا نام سنتے ہی سیاہ چادر میں خود کو لپیٹے کوئل چوکی۔ اس کے جسم پر جیسے کرنٹ سا لگا ہو۔ دل چاہا کہ بھاگتی ہوئی جا کر اپنے محبوب کا دیدار کرے۔ دیکھے کہ وہ کس حال میں ہے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مایوس ہو کر چپ کی چپ رہی کیونکہ آدمی بتا رہا تھا کہ کوئی طوفان کی طرح آیا اور اسے لے اڑا۔ وہ اب اسے کہاں تلاش کرتی۔ کہاں ڈھونڈتی۔

بزرگ نے ان کی تمام کہانی سنی تو کہا۔ ”میں اس کا کوئی حل تلاش کرتا ہوں۔ ان دونوں کو جکڑ لیتا ہوں اور ایسی سزا دیتا ہوں کہ دوبارہ وہ انسانوں کا قتل عام نہ کریں گے۔“

لوگ پرسکون ہو کر چلے گئے تو سیاہ چادر میں لپٹی کوئل بزرگ کے پاؤں میں گر گئی۔ ہاتھ جوڑے، آنسو بہانے لگی کہ اس کے محبوب کو کچھ نہ کہیں۔

کوئل کی بات سن کر بزرگ حیران و پریشان ہو گئے کہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔

جب کوئل نے اپنے محبوب کی الف سے آخر تک تمام داستان سنائی۔ اس کی بہنوں کا قتل عام، باپ کا قتل ہر چیز سے آگاہ کیا تو بزرگ سوچوں میں ڈوب گئے اور روتی ہوئی منت و ساجت کرتی ہوئی کوئل کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور کہا۔

”مینی تمہارے دل پر کیا کچھ بیت رہی ہے، میں سب جانتا ہوں۔ اگر کہتی ہو تو کرن کو جکڑ کر تمہارے زاہد کو تمہارے قریب کر دیتا ہوں۔“

”نہیں بابا جی، میں ایسا نہیں چاہتی۔ میں نے کرن سے وعدہ کیا ہے کہ میں ان دونوں کے بیچ میں نہ آؤں گی۔ ان کے پیار میں رکاوٹ نہ بنوں گی۔ ان کی خوشیاں نہ چھینوں گی۔“

بابا جی کوئل کی باتیں سن کر خاموش رہے۔ کوئی جواب نہ دیا۔ رات ہو گئی تو کوئل بولی۔

”بابا جی میں اپنے محبوب کو بھول جانا چاہتی ہوں۔“

تو بزرگ زریب مسکرائے اور کہا۔ ”مینی تم یہ بات دل سے کہہ رہی ہو کہ تم بھول جاؤ گی اسے۔ میں ہر روز تمہیں تڑپتا دیکھتا ہوں۔ کسی کی یادوں میں گم مست دیکھتا ہوں۔ کبھی مسکراتے دیکھتا ہوں اور کبھی آنسوؤں میں بھیگی دیکھتا ہوں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

وہاں لوگ آتے جاتے رہتے۔ یہ حسرت بھری نظروں سے ان آتے جاتے لوگوں کو دیکھتی رہتی اور سوچتی رہتی کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔ بار بار دھیان محبوب کی طرف چلا جاتا۔ شیشے کے بند کمرے میں نجانے وہ کن سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔

”کیا وہ میری سوچوں میں تو گم نہ تھا۔ کیا وہ مجھ سے ملنے سے متعلق تو نہ سوچ رہا تھا۔ کرن نے اسے بند کمرے میں کیوں رکھا۔ اسے سونے کے پنجرے میں قید کر کے کیوں رکھا۔ اسے آزادی ملنی چاہئے۔ اپنی زندگی کے اہم فیصلے کرنے کے مواقع دینے چاہئیں“ لیکن ب تو فائدہ ہی نہ تھا۔ اب تو وہ جنگ ہار چکی تھی۔ اپنی چاہتوں، امیدوں، آرزوؤں، خواہشوں کا گلا گھونٹ چکی تھی۔ اس کا محبوب جنات کے قبضہ میں تھا۔ جنات کے پہرے کو وہ خود دیکھ چکی تھی۔ شیشے کے عالی شان کمرے میں دیوار کے ساتھ کھڑے چوکس و چوبند جنات کو دیکھ چکی تھی۔

چند ہفتے گزر گئے۔ کوئل نے بابا جی کا در نہ چھوڑا۔ بابا جی بھی اس کی اندرونی کیفیت بھانپ چکے تھے۔ اس کا اصل روپ دیکھ چکے تھے۔ اسے اس روز اپنے قریب ہی ٹاپتے دیکھ چکے تھے لیکن نجانے انہیں اس کے ٹوٹے دل پر ترس کیوں نہ آ رہا تھا۔ کیوں اسے تڑپتا دیکھ رہے تھے۔ کیوں اسے اس امتحان سے باہر نہ نکال رہے تھے۔

گزرتے دنوں کے ساتھ ہی کوئل کا خوبصورت چہرہ ماند پڑتا جانے لگا۔ آنکھیں رو رو کر گہری ہوتی گئیں۔ سیاہ حلقے آنکھوں کے گرد پڑتے رہے۔ وہ جاتی بھی تو کہاں۔ بابا جی کے پاس آنے جانے والوں کی نظریں اس تنہا بیٹھی ہوئی دوشیزہ پر ضرور پڑتیں۔ یہ نہ تو کسی کو ڈستی اور نہ ہی آنکھیں بھر کر کسی کو دیکھتی۔ اپنی جان کی اسے فکر نہ تھی۔ شاید خود ہی موت کو قریب بلا رہی تھی۔ شاید خود ہی موت کے شیعے میں پھنسا چاہتی تھی۔ شاید خود ہی اپنے وجود کو ظالم دنیا سے ختم کرنا چاہتی تھی۔ ناگن سے انسانی روپ میں اسے کیا ملا تھا۔ صرف آنسو، دکھ، درد، تنہائیاں، ویرانیاں۔ اپنی زندگی کا سوگ منانے کے لئے اس نے خود ہی اپنے آپ کو سیاہ لباس میں لپیٹ لیا۔ اپنا سر منہ جسم سیاہ چادر میں چھپا لیا۔

ایک دن چند مرد بابا جی کے پاس آئے اور آتے ہی بولے۔

”بابا جی ہمارے لئے دعا کریں۔ ہمارا گاؤں جلتا ہے۔ لوگ پکھلتے جلتے ہوئے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ نمبردار اور جاگیردار کے کئے کی سزائیں اب گاؤں والوں کو بھی ملنا شروع ہو گئی ہیں۔ دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی شخص جلتا پکھلتا دکھائی دے رہا ہے۔ کل رات ہی

میں طوفان برپا کر سکتی ہوں۔ صرف منت کر سکتی ہوں۔ اس کے بعد تم دونوں کی زندگی سے نکل جاؤں گی۔ راستے سے ہٹ جاؤں گی۔ خود کو ختم کر لوں گی، جلا ڈالوں گی آگ میں۔ صرف کچھ دیر کے لئے میرا محبوب مجھے دے دو۔“

کول کی بے بسی دیکھ کر کرن قہقہہ لگانے لگی۔

”کول تم مجھے روتی ہوئی، تڑپتی ہوئی، سسکتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔ تمہاری بیگی پلکیں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ تم اپنی بے بسی پر ماتم کرو۔ زاہد تمہارا نہیں، صرف میرا ہے۔ ہم بہت جلد ایک دوسرے کو اپنانے والے ہیں۔ تمہیں بھی بلائیں گے۔ تمہیں بھی دعوت دیں گے۔“

اتنا کہنے کے بعد کرن قہقہہ لگانے لگی۔ اس کی بے بسی کا مذاق اڑانے لگی اور ساتھ ہی غائب ہو گئی۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ کول بھی اس کے پاؤں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے، لہذا یہ تینوں ایک شیشے سے سجے کمرے کے باہر کھڑے تھے۔ وہی جنات کا پہرہ تھا۔

کول دوشیزہ سے ناگن کے روپ میں آگئی اور ریگتے ہوئے باہر کے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ یہ سجا سجاا شیشوں والا کمرہ کوئی زیادہ دور نہ تھا۔

وہی جزیرہ تھا جہاں وہ اور زاہد پیار بھری باتیں کیا کرتے تھے۔ جہاں دونوں قہقہہ لگایا کرتے تھے لیکن یہ زمین کے اندر تھا جہاں سے باہر نکلنے کے چار راستے تھے۔ ان چاروں راستوں پر جنات کھڑے تھے۔ کول یہ جگہ دیکھتے ہی نجانے کیوں دل ہی دل میں خوش ہونے لگی۔ کیوں اسے ایسا لگا کہ وہ اپنے ساجن کے بہت قریب ہے لیکن کرن کی ایک بات اس کا سینہ چیرے جا رہی تھی کہ ”کول ہم دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہونا چاہتے ہیں۔ تمہیں بھی بلائیں گے۔“ دوسری بات اس کے دل میں کلکتی رہی کہ یہ جن زادی مغرور ہو گئی ہے۔ اسے نچا دکھانا چاہتی ہے۔ اپنی طاقت پر فخر کرتی ہے۔ کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ اگر اب بھی اس نے کچھ نہ کیا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زاہد کے پیار سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے دور ہو جائے گی۔ اگر کرن مجھ سے اپنا پیار چھین سکتی ہے تو میں کیوں چپ رہوں۔ میں کیوں بے بس بنوں۔ مجھے بھی اپنا پیار اس سے چھیننا ہے۔ مجھے بھی اپنی محبت کو پانا ہے۔ جیسے وہ مجھے تڑپا رہی ہے۔ ویسے ہی مجھے بھی اسے تڑپانا ہے۔ جس طرح وہ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ مجھے بھی قہقہہ لگانے چاہئیں لیکن کیسے..... اتنی طاقت کہاں سے لاؤں، ناگ سانپ بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔ ان ہواؤں سے ٹکرانے والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

بزرگ کی یہ باتیں سن کر کول پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ بیگی پلکوں، کپکپاتی زبان اور کانپتے لرزتے ہونٹوں کے ساتھ بولی۔ ”بابا جی! کرن زور آور ہے۔ طاقت والی ہے۔ زمانے سے ٹکراتا جاتی ہے۔ طوفان بن کر دشمنوں کو اجاڑنا جانتی ہے۔ میرا محبوب اس کے پاس رہے گا تو محفوظ رہے گا۔ ہر سو پھیلے دشمنوں کے ہاتھوں بچا رہے گا۔ مجھ میں کیا ہے، کیسے اس کا ساتھ دے سکتی ہوں۔ کیسے قدم بہ قدم ان کے ساتھ چل سکتی ہوں۔ مجھے پیار کی یہ قربانی دینی ہے۔ محبوب کو کھو کر محبت کی بازی جیتی ہے۔“

کول کی باتیں سن کر بزرگ کھلکھلا کر ہنسے جیسے کول نے کوئی انہونی بات کہہ ڈالی ہو۔

اتنے میں زاہد، کرن اور پہرہ دیتے ہوئے کئی جن بھی آکھڑے ہوئے۔ کول کو بزرگ کے پہلو میں بیٹھے دیکھتے ہی زاہد چیخا۔

”کول کیسی ہو۔ ٹھیک تو ہونا۔“

اپنے محبوب کو دیکھ کر کول وہ سب باتیں بھی بھول گئی جو چند لمحات پہلے بزرگ سے کہہ رہی تھی کہ میں اپنے محبوب کو بھول جانا چاہتی ہوں۔ اس کی زندگی سے بہت دور چلے جانا چاہتی ہوں۔

لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں ہاں میری جان، میں ٹھیک ہوں۔“

کول کی بیگی نظریں زاہد کے چہرے میں پیوست تھیں۔ پلکیں جھپکتا بھول بیٹھی تھیں۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ لحوں میں ہی اس کا محبوب اس کی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔

”زاہد جان، مجھے تمہاری جدائی نے بے بس کر دیا ہے۔ رلا کے رکھ دیا ہے۔ مہکتے چہرے کو اجاڑ کے رکھ دیا ہے۔“

اس سے قبل کہ زاہد روتی ہوئی، تڑپتی ہوئی، سسکتی ہوئی کول کے قریب ہوتا، اسے دلاسا دیتا، آنسو پونچھتا۔ کرن نے اس کا ہاتھ تھاما اور ہواؤں میں اڑنے ہی والی تھی کہ کول نے کرن کے پاؤں پکڑ لئے۔ منت سماجت کرنے لگی۔

”خدا کے لئے کرن انہیں بے شک لے جانا لیکن مجھے جی بھر کر انہیں دیکھ لینے دو۔ باتیں کر لینے دو۔ آنکھیں ترس گئی ہیں ان کے دیدار کو۔ خدا را میری حالت پر رحم کھاؤ۔ میں مانتی ہوں کہ میں کمزور ہوں، بے بس ہوں۔ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تم طاقت والی ہو۔ لحوں

کول اپنے محبوب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنانے اور کہیں بہت دور لے جانے کے لئے بھاگی۔ ابھی چند قدم ہی آگے گئی تھی کہ سامنے اسی سپرے کو دیکھ کر کانپ گئی جس نے اسے قابو کیا تھا۔ ایک دل چاہا کہ اسے ڈستی ہوئی گزر جائے لیکن اپنا زہر اس میں نہیں پھیلا سکتی تھی۔ اپنی قسمت پر رونا آتیا۔ انہی قدموں واپس لوٹی اور بزرگ کے قدم پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”بابا جی خدا کے لئے جس طرح جن زادی کی طاقت چھینی ہے، اسی طرح واپس کر دیں۔ میں ہار گئی ہوں۔ اپنے محبوب کا پیار میری قسمت میں ہی نہیں ہے۔ خدا کے لئے بابا جی جلدی کریں ورنہ سبھی کچھ تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ زاہد نکھر کر رہ جائے۔ بے سہارا ہو جائے گا۔ دشمنوں کے ہاتھوں مارا جائے گا۔“

کول تڑپ تڑپ کر روئے جا رہی تھی۔ بزرگ حیران و پریشان تھے کہ یہ لڑکی کتنی احمق ہے۔ کبھی کچھ کہتی ہے اور کبھی کچھ۔ وہ کیا چاہتی ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کبھی محبوب کو پا لینے کے لئے روتی ہے اور کبھی ہمیشہ کے لئے دور رہنے کے لئے روتی ہے۔

”بٹی بھاگ جا، تجھے کچھ نہیں ہوگا۔“ کول نے یہ الفاظ سنے تو دوسری طرف بھاگی۔ سپرے کو خبر بھی نہ ہوئی اور کول بہت دور نکل گئی۔ دریا کنارے پہنچتے ہی دریا میں کود پڑی اور سیدی جا کر جزیرے سے لگی۔ وہاں سے بھاگتی ہوئی جب کرن کے مقام تک پہنچی تو وہاں کا منظر دیکھ کر آنسو بہا کر رہ گئی۔

زاہد چلائے جا رہا تھا۔ ”کرن کیا ہو گیا ہے تجھے۔ کیوں یکدم مرجھا گئی ہو۔ کیوں کمزور ہو گئی۔ کیوں حسن کھو دیا ہے۔ کیوں بولتی نہیں ہو۔ میں ہوں زاہد، تیرا زاہد۔ جس کی تم دلہن بننے والی تھیں۔ جس کو اپنانے والی تھیں۔ کیا ہو گیا ہے تم کو۔ ہوش کرو کرن ہوش کرو۔ خود کو سنبھالو، کیوں مجھے اکیلا چھوڑ رہی ہو۔ کیوں مجھے تنہا چھوڑ رہی ہو۔ جلا ڈالوں گا اسے جس نے تم پر وار کیا ہے۔ تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ کرن خدا کے لئے اپنے زاہد کا خیال کرو۔“

زاہد کی زبانی ایسی باتیں سننے کے بعد کول تڑپ کر رہ گئی۔ اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی رہ گئی۔ بغیر کوئی بات کئے ریزہ ریزہ وجود کو لئے ادھوری امیدوں کو لئے ٹوٹے ارمانوں کو لئے بکھری آرزوؤں کو لئے ڈگمگائے قدموں سے واپس پلٹی اور دریا میں کود پڑی۔ آنسوؤں کی برسات میں ریگتے ہوئے بزرگ کے پاس آئی۔ آتے ہی ان کے ہاتھوں کو بوسے دیئے۔ آنکھوں میں تیرے ہوئے آنسو دیکھ کر بزرگ نہ رہ سکے اور پوچھا۔

کول ناگن بنتے بنتے پھر مرجھا سی گئی۔ کچھ حل دکھائی نہ دیا۔ نیچے اتری، شیشے کے گھر کے سامنے گئی تو زاہد کے ارد گرد خوبصورت شہزادیوں کے جھرمٹ کو دیکھ کر اور ساتھ بیٹھی سرخ جوڑے میں دلہن کے روپ میں کرن کو دیکھ کر تڑپ گئی۔ اپنے ہوش بھلا بیٹھی۔ اسے کیا علم تھا کہ کرن اتنی جلدی اس کی ہو جائے گی۔ اتنی جلدی اس کی آغوش میں چلی جائے گی۔

ایک دل چاہا کہ تمام ناگن کو جمع کر کے شیشے تروا دے لیکن اس بات کا یہ حل نہ تھا۔ ایک حل اس کے ذہن میں آیا تو ریگتے ریگتے دریا میں کود پڑی۔ جلد ہی دوسرے کنارے آگئی۔ یہاں سے بھاگتے ہوئے بابا جی کے قدموں سے لپٹ گئی۔

”بابا جی میرا پیار مجھے واپس لوٹا دو۔ وہ مجھ سے میری خوشیاں چھین کر لے جا رہی ہے۔ مجھ سے میری زندگی چھین کر لے جا رہی ہے۔ بابا جی خدا کے لئے کچھ کریں ورنہ میں مر جاؤں گی۔ ٹوٹ جاؤں گی۔ بابا جی وہ میرے زاہد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا لینا چاہتی ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری زندگی سے نکال لینا چاہتی ہے۔ کچھ کریں بابا جی۔“

بابا جی کو کول کی حالت پر رحم آگیا۔ ”بٹی تم ان دونوں کی زندگی سے نکل جانا چاہتی تھیں۔“

”نہیں بابا جی نہیں، مجھے میرا پیار چاہئے۔ مجھے میری خوشیاں چاہئیں۔ مجھے میری زندگی چاہئے۔ بابا جی زاہد نے مجھے دلہن بنانے کا وعدہ کیا ہے، اس سے نہیں وہ زبردستی کر رہی ہے۔ مجھے بچا دکھانا چاہتی ہے۔ مجھے تڑپانا چاہتی ہے۔ مجھے جلا نا چاہتی ہے۔ مجھے مارنا چاہتی ہے۔ بابا جی مجھے اس کا دلہن والا روپ برداشت نہیں ہو پا رہا ہے۔ خدا را کچھ کریں۔“

بابا جی کو کول کے گرتے آنسوؤں پر ترس آگیا۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور ایسے تڑپے جیسے بجلی کا کرنٹ انہیں لگ گیا ہو۔ کافی دیر بعد ان کی حالت درست ہوئی تو بولے۔

”جا بٹی اپنا لے اپنے پیار کو اسے لے کر دور چلی جا۔ اس کی بستی سے نکل جا۔ یہ ساری اس کی بستی ہے۔ یہاں اس کا راج ہے۔ مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ میں اسے جلا سکوں۔ صرف اسے جکڑا ہے لیکن خونی زنجیروں سے نہیں، صرف طاقت ختم کی ہے۔ ہواؤں سے نکرانے والی طاقت چھینی ہے۔ اگر اب تم اسے ڈسنا بھی چاہو تو ڈس سکتی ہو لیکن تم ایسا نہیں کرو گی کیونکہ اس نے بھی تم سے زندگی نہیں چھینی تھی۔ بھاگ چلو یہاں سے۔ میں نے اپنی طاقت آزمائی ہے۔ جو میرے پاس تھا، وہ پڑھ کر پھونک دیا ہے۔“

”بیٹا کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں بابا جی۔ صرف ایک التجا کرنی ہے۔“

”ہاں، بولو بیٹی۔ کیا بات ہے۔“

”بابا جی کرن کو آزاد کر دیں۔ اس کی طاقت بحال کر دیں۔ اس کے ماند پڑتے

حسن میں دوبارہ مہک بھر دیں۔“

کول کی باتیں سن کر بزرگ کچھ نہ سمجھا۔ تب یہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”بابا جی جلدی کریں ورنہ میرا محبوب رو رو کر نڈھال ہو جائے گا۔ ٹوٹ کر بکھر

جائے گا۔ بابا جی کرن کے بغیر نہیں جی پائے گا وہ، مر جائے گا اس کے بغیر۔ ایک لمحہ بھی وہ اس

سے دور نہیں ہونا چاہتا۔ ایک لمحہ بھی اسے نظروں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتا۔ میرے بغیر جی سکتا

ہے لیکن اس کے بغیر نہیں جی پائے گا۔ بابا جی یہ جو زندگی ہے ناں، اس میں بہت زخم ہیں۔

بہت اذیتیں ہیں۔ کیا ملا مجھے ناگن سے انسان بن کر، کچھ بھی نہیں، اکیلی ہی جلتی رہی ہوں

پیار کی آگ میں۔ اکیلی ہی تڑپتی رہی ہوں کسی کی جدائی میں۔ اب کبھی ان ویرانوں میں نہ

آؤں گی۔ اب کبھی پیار کی تمنا نہ کروں گی۔ اب کبھی کسی کی آرزو نہ کروں گی۔ اب کسی چیز کی

خواہش نہیں ہے۔ خدا کے لئے بابا جی کرن کی اصل طاقت، اصلی حسن واپس لوٹا دیں۔ میں

آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔“

وہ کیا منظر دیکھ کر آئی تھی، بزرگ انجان تھے۔ انہوں نے ویسے ہی آنکھیں بند

کیں۔ ویسے ہی لرزے۔ ویسے ہی پسینے میں جھیکے۔ اس سے قبل کہ بزرگ کول کو کوئی خبر نہ سنا،

دور سے وہی بین کی آواز کول کے کانوں سے ٹکرائی تو یہ ہر بات بھول کر ناگن بنے بابا جی کا

جواب سنے بغیر ریگنے لگی۔ سپرے کے قریب جانے لگی۔ خود کو سپرے کے قبضہ میں دینے کے

لئے آگے بڑھنے لگی۔ مستی میں جمونے لگی۔ پھر وہی اصل روپ اپنایا، چمکتا چہرہ اپنایا، بے انتہا

حسن اپنایا تو ناپنے لگی۔ سپرے اسے نپاتا رہا اور یہ ناچتی رہی، وہ مدہوش کرتا رہا اور یہ مدہوش

ہوتی رہی۔ سپرے کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی شہزادی اسے دوبارہ بھی مل جائے

گی۔ وہ دوبارہ اس پر قبضہ جمالے گا۔ اب تو وہ اسے کسی صورت بھی آزادی نہیں دے گا اور

شاید کول بھی اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سپرے کے گمہ بند سلاخوں کے پیچھے زندگی گزارنا چاہتی

تھی۔ آزادی میں اسے آنسوؤں کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔ شاید قیدہ رکسوں نصیب ہو جائے۔ یہ

مدہوشی کے عالم میں ناپے جا رہی تھی کہ یکدم بین کی آواز بند ہو گئی۔ سپرے کے ہاتھ سے بین

زمین پر گر پڑی اور آنکھیں پھاڑے مدہوشی کے عالم میں ایک طرف چلنے لگا۔

یہ سب کیا ہو گیا تھا، کسی کو خبر نہ تھی۔ نیم بے ہوش پڑی کول بھی کچھ نہ دیکھ پا رہی

تھی۔ سپرے نے اپنی لے کیوں بند کی، اسے مست کرتے کرتے کہاں کھو گیا۔ کچھ سمجھ نہ آ رہا

تھا۔ سپرے مسلسل ایک طرف بڑھے جا رہا تھا۔ اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔ ایک جگہ جا کر کھڑا ہو گیا۔

ایک مجسمہ بن گیا۔ نہ ہلتا، نہ سانس لیتا۔ مستی کے عالم میں کھڑا رہا۔ لحوں میں ہی وہاں کا تمام

نقشہ بدل گیا۔ ہر کام الٹ ہو گیا۔ غڑھال کول ہوش میں آ گئی۔ سپرے بالکل ساکت کھڑا کھیلنے

لگا۔ جسم ہڈیاں بننے لگا۔ کول ہوش میں آتے ہی دور کھڑے اپنے محبوب کی جلتی آنکھوں کو دیکھ

کر حیران و پریشان رہ گئی۔ ایک خیال آیا کہ ناگن بن کر ان جھاڑیوں میں جا چھپے۔ ان

جھاڑیوں میں غائب ہو جائے لیکن ایسا بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ یہ سب

کیا تھا۔ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

زاہد اپنا کام دکھانے کے بعد کول کے پاس آ گیا۔ آج پہلی مرتبہ زاہد نے کول کے

ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ آنکھیں چمک پڑیں۔ کول کو یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

صرف سکتے کے عالم میں کھڑی یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔

زاہد کول کا بازو پکڑے بابا کے پاس آنے لگا۔ کول ابھی تک سمجھ نہ پائی تھی کہ یہ کیا

ہو رہا ہے۔ نہ پوچھ رہی تھی، نہ ہونٹ حرکت میں آرہے تھے اور نہ ہی اسے ان سب چیزوں کا

یقین آ رہا تھا۔

”بابا جی میں کول سے شادی کرنا چاہتا ہوں ابھی اور اسی وقت اور آپ کو گواہ بنانا

چاہتی ہوں۔“ یہ لفظ سنتے ہی کول سے سکتہ ٹوٹا۔ چہرے پر رونق ابھری، پتھرائی آنکھوں میں

نکشش آئی۔ نیلی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں کو بھگونے لگے۔

”زاہد جان۔“

”ہاں کول۔ میں سچ کہتا ہوں۔“

یہ الفاظ سن کر کول پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ جو اسے خواب دکھائی دے رہا تھا،

حقیقت کے روپ میں سامنے آ گیا۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ اپنے محبوب کو ہمیشہ ہمیشہ کے

لئے اپنا لے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے قریب ہو جائے گی۔

”کرن نے ایسا کرنے کی کیسے اجازت دے ڈالی؟“ بمشکل کول نے یہ الفاظ

زبان سے ادا کئے۔

رہتی تھیں۔

جب اس مقام تک گئے جہاں کرن دلہن کے روپ میں اس کے محبوب کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہاں کا منظر دیکھ کر کوئل کانپ کر رہ گئی۔ کرن کو پہچان بھی نہ سکی۔ پیلا زرد رنگ، نکھرے بال اور حالت ایسے جیسے اسے بری طرح سے زد و کوب کیا گیا ہو۔ جیسے صدیوں سے پیار ہو۔

ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر کرن پھکی سی مسکراہٹ لبوں پر نکھیرے ان دونوں کے قریب ہوئی۔

”آپ دونوں کو ہمیشہ کا ملاپ مبارک ہو۔ میں بہت خوش ہوں۔ کوئل مجھے معاف کرنا، میں نے تمہیں بہت صدمے دیئے ہیں۔ بہت دکھ دیئے ہیں۔ بہت تکلیفیں دی ہیں۔ تمہاری بے بسی پر مسکرایا کرتی تھی۔ تمہیں روتے تڑپتے دیکھ کر تھمتھ گیا کرتی تھی۔ یہ سب بھول بیٹھی تھی کہ میں بھی کسی کے شکنجے میں آسکتی ہوں۔ میں بھی کسی کی پکڑ میں آسکتی ہوں۔ جس حسن پر غرور کیا کرتی تھی، وہ ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئل کسی نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔ مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ مجھے بے بس کر کے مڑھال کرنے والا رنگ دروہ کو بدلنے والا کسی وقت جلا کر ہواؤں میں اڑا سکتا ہے۔“

کوئل نے کرن کی کسی بھی بات کا جواب نہ دیا۔ صرف آنکھوں میں آنسو بھرے روئے جا رہی تھی۔ پھر انہی اٹے قدموں واپس بھاگی۔ دریا میں کود پڑی اور جلد ہی دوسرے کنارے جا گئی۔ وہاں پہنچنے کے بعد ایسے بھاگنے لگی جیسے اس کے پیچھے دشمنوں کے لشکر بڑھتے آرہے ہوں۔

اس کا رخ بزرگ کے ڈیرے کی طرف تھا۔ بزرگ کے پاس پہنچتے ہی ان کے قدموں میں جاگری۔ ہاتھ باندھے رونے لگی۔

”باباجی خدا کے واسطے اسے آزاد کر دیں۔ خدا کے لئے اس کی طاقتیں واپس لوٹا دیں۔ حسن واپس لوٹا دیں۔ میری مراد پوری ہو گئی ہے۔ میں نے اپنے پیار کو پالیا ہے۔ اب یہ خواہش بھی پوری کر دیں۔“ کوئل ہاتھ باندھے روئے جا رہی تھی۔

باباجی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کچھ پڑھنے کے بعد پھونک مارنے کے بعد اُلے۔ ”بہنی تیری یہ خواہش بھی پوری کر دی ہے۔ خدا تیری جھولی مسکرائیوں، مسرتوں، پاتھوں، محبت سے بھری رکھے۔“

”آپ تو اس سے شادی کرنے والے تھے۔ اسے دلہن کے روپ میں آپ کے پہلو میں بیٹھی میں نے خود دیکھا تھا۔“

کوئل کی اس بات پر زاہد بولا۔
”اس بات کا بھی آپ کو علم ہو جائے گا۔ تم شادی کے لئے ہاں کر دو۔ میں تمہیں ابھی اپنا چاہتا ہوں۔ ابھی تم سب کچھ جان جاؤ گی۔ بس تم ہاں کر دو۔“

”زاہد جان کرن کہاں ہے؟“ کوئل نے پوچھا۔

”اس سے بھی ملواتا ہوں۔ وہ تمہارا ہی انتظار کر رہی ہے لیکن تم ہاں تو کرو۔“

”ہاں ہاں ہاں۔“

باباجی یہ تمام منظر دیکھ رہے تھے۔ وہاں چند ایک مرد بھی آگئے تھے جو ان دونوں کو شکل سے نہ پہچانتے تھے۔ البتہ اس خطے میں پھیلے ہوئے خوف و ہراس سے غمزدہ تھے۔ ان سب کی موجودگی میں ہی بزرگ نے ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا۔ یہ نکحڑے ساتھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو گئے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سچے بندھن میں بندھ گئے۔

کوئل آج بہت خوش تھی۔ بار بار اوپر آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ وہ تو تنہا مرنے کے لئے تیار تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کی جدائی کو دل میں لئے مرجانا چاہتی تھی۔ دلدار کی جدائی میں تڑپتے، سسکتے، روتے جل جانا چاہتی تھی لیکن اسے دلہن بننے کے بعد بھی یہ سب خواب دکھائی دے رہا تھا۔ یہ سب ایک سپنا نظر آ رہا تھا۔ سپیرا جلتے جلتے پکھلتے پکھلتے ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کھڑا تھا۔ ایسے جیسے برسوں پرانا ڈھانچہ یہاں کھڑا کیا ہو۔

”کوئل جلدی سے جزیرے کی طرف بھاگو۔ وہاں کرن ہم دونوں کا انتظار کر رہی ہے۔ ہم دونوں کی راہیں دیکھ رہی ہے۔ ہم دونوں کی منتظر ہے۔ بھاگو کوئل بھاگو۔“

یہ دو پرانے چاہنے والے ایک نئے جوڑے کی صورت میں انہی دیرانوں میں بھاگتے ہوئے دریا کنارے آئے اور ایک عرصہ بعد کوئل کا سہارا لے کر زاہد نے دریا کو عبور کرنے کے بعد جزیرے میں اپنا قدم رکھا تو ہر طرف سے خوشبوؤں اور مہکتے نظاروں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ گلاب کی پگھڑیاں اڑا کر ان کے جسموں پر پھیل رہی تھیں۔ رقص ہو رہا تھا۔ گھنگھروں کی جھنکار کے ساتھ خوشنک سناٹے والا یہ جزیرہ ایسے نظر آ رہا تھا جیسے یہ دیرانہ نہ ہو۔ حسین خوابگاہ ہو، حسین سیرگاہ ہو، گھنگھروں کی آوازیں ان دونوں کو مست کرتی جا رہی تھیں۔ ان دونوں کے دلوں کو معطر کرتی جا رہی تھیں۔ ان دونوں کے چہروں پر چمک اور روشنی بھرتی جا

پاتی تھی لیکن اب.....“

اتنا کہنے کے بعد کرن بھیگی آنکھوں کے ساتھ قہقہے لگانے لگی۔ کتنے مر جھائے ہوئے تھے یہ گونجنے والے قہقہے۔ کتنا دکھ تھا ان قہقہوں میں۔ کتنی تڑپ تھی ان قہقہوں میں۔ ایسے جیسے نشتروں سے بھیکے ہوں۔

کرن قہقہے لگاتی جا رہی تھی۔ کوئل اسے دیکھ رہی تھی۔ پھیکے قہقہوں میں کرن کے ان آنسوؤں کو دیکھ رہی تھی جن میں جدائی کی تڑپ تھی۔ پچھڑ جانے کی کک تھی اور کوئل خود غرض نہ تھی۔ اس نے محبوب سے جدائی کا منظر دیکھ لیا تھا اور کرن کو ایسے منظر، ایسے حالات سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی قسمت میں جدائی نہیں بھرنا چاہتی تھی۔

تب آگے بڑھ کر کوئل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دیرانے میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ قہقہے دم توڑ گئے۔

”کرن تم نے اپنا پیار میرے حوالے کر کے مجھ پر بہت بڑی نیکی کی ہے۔ ایک نیکی اور کردو، صرف ایک نیکی۔“

”ہاں کوئل بولو، میں آج سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ جو مانگو گی مل جائے گا۔ جو چاہو گی، پالو گی۔ جو خواہش، تمنا، آرزو کرو گی، پوری ہو گی۔“

کرن کی اس بات پر کوئل کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ اپنے محبوب کا ہاتھ پکڑ کر بوسہ دیا اور کرن کا ہاتھ زاہد کے ہاتھ میں دے کر اپنا ہاتھ دونوں کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

”کرن ہم تینوں ایک ساتھ، ہنا چاہتے ہیں۔ وعدہ کرو کہ تم بھی زاہد کو اپنا لو گی۔ اپنے پیار کو اپنا لو گی۔“

یہ الفاظ سنتے ہی کرن چونک گئی۔ ”ہاں کرن خدا کے لئے انکار نہ کرنا۔ ہم ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ جدائیوں کے زخم اب جھیلے نہیں جاتے۔“

زاہد خود حیران تھا کہ کوئل کیا کہہ رہی ہے۔ کرن کو خود بھی یقین نہ آ رہا تھا۔ خود کرن بھی اپنے محبوب سے جدا نہیں رہنا چاہتی تھی۔ ہمیشہ اس کے قریب رہنا چاہتی تھی۔ اس کے پہلو میں بندھی رہنا چاہتی تھی۔

کوئل کی بات پر مسکرائی۔ تینوں نے ایک ساتھ رہنے کی حامی بھر لی اور یوں خاموش سناٹے میں ایک مرتبہ پھر مہک ابھرنے لگی۔ گھنگھروں کی آوازوں سے فضا میں گونجنے لگیں۔ ہر چیز قفس میں ڈوبی دکھائی دینے لگی۔ رات بھر جشن کا یہ سہانا منظر دیرانے میں چھایا رہا۔

اتنا کہتا ہی تھا کہ بزرگ کے ارد گرد وہی رقص شروع ہو گیا۔ میٹھے میٹھے قہقہے فضاؤں میں بکھرنے لگے۔ گھنگھروں کی جھنکار سے دیرانے میں ایسا ماحول دکھائی دے رہا تھا جیسے ہر طرف رونقیں ہی رونقیں ہوں۔

زاہد اور کرن ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کوئل کے معصوم چہرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کوئل بھی یہ منظر دیکھنے کے بعد چپک رہی تھی۔ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ گھنگھروں کی جھنکار ایسی مسرور کن تھی کہ دل چاہا وہ بھی ناچے، خوشیوں کے رقص میں کھو جائے۔ مستی میں جھومتی رہے لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔

بھاگتی ہوئی اپنے شہزادے کے پاس گئی۔ اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ ایک نظر کرن کی طرف دیکھا جس پر پوری طرح حسن بکھرا ہوا تھا۔ لبوں پر مسکراہٹ تھی لیکن پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کے خوبصورت گالوں کو بھگوتے ہوئے زمین پر گر رہے تھے۔ کرن کی آنکھوں سے گرنے والے یہ آنسو کوئل کے دل میں ہزاروں سوالات چھوڑ گئے۔

”کرن کہتی ہو تو میں ابھی بھی تم دونوں کے درمیان سے ہٹ جاتی ہوں۔ مجھے جدائی کے صدمے جھیلنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ انتظار کی عادت پڑ گئی ہے۔ تڑپنا، سسکنا، رونا ان سب چیزوں سے واقف ہو گئی ہوں۔ تم کیوں اپنے خوبصورت چہرے کو بگاڑتی ہو، تم کیوں اپنے آپ کو ٹھہرا کر کرتی ہو۔“

کوئل کی اس بات پر کرن نے کوئل کے گال تھپتھپائے۔

”پاگلی اگر میں خوش نہ ہوتی تو یہ محفلیں کیوں جتتیں، یہ ناچ گانا کیوں ہوتا۔ یہ رقص میں مست فضا کیوں ہوتیں۔ یہ دیرانہ معطر کیوں ہوتا۔ تم قسمت والی ہو کہ اپنے محبوب کے قریب ہو گئی اور میں کتنی بد نصیب ہوں کہ اپنے محبوب کے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہوں۔“

کوئل تم تو پیار کا مطلب اچھی طرح جانتی ہو۔ یہ پیار عجیب چیز ہے۔ کبھی کچھ لوٹ لیتا ہے۔ سوچوں، خیالوں پر بھی قبضہ جما لیتا ہے۔ انسان کے دل، دماغ اور جسم کے ایک ایک انگ کو جکڑ لیتا ہے۔ ہر طرف اپنے ہی ساجن کو تلاش کرتا رہتا ہے۔ ہر وقت ہی محبوب سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ کبھی مسکراتا ہے اور کبھی آنسو بہاتا ہے۔ تیری طرح میں نے بھی اسے شدت سے چاہا ہے۔ دل کے ہر کونے میں اسے بسایا ہے۔ ایک لمحہ بھی جدائی برداشت نہیں کر

ساتھ ہی بھیا نک قہقہہ بلند ہونے لگے۔ آگ کے شعلے ابھرنے لگے۔ سیاہ رنگت والے بزرگ نے اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ ہلکی زبان کو روکا اور کہا۔ ”تم جاؤ۔“ اس بات کے ساتھ ہی ایک زلزلہ آیا۔ زمین پھٹی اور وہ بلا اس میں گھس گئی۔

”جے ہو کالی دیوی کی جے ہو۔“

سیاہ رنگت والے بزرگ کے قریب کھڑے ایک اس جیسی شکل والے کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

”نمبردار صاحب آپ سے کہا تھا ناں کہ میرے گرو بابا کے پاس بہت بڑی بڑی طاقتیں ہیں۔ وہ آپ کی رانی میں گھسے ہوئے جنات کو لکھوں میں نکال دیں گے۔ مجھے اور بڑی بڑی بلاؤں پر قابو پالیں گے۔ دیکھ لیا گرو کی طاقت کو۔“

گرو بابا کا چپلا جاگیرداروں اور نمبرداروں کے سامنے گرو بابا کی تعریفوں کے پل باندھے جا رہا تھا۔ یہ وہی گرو بابا تھا جن کو لینے کے لئے یہ چپلا کافی عرصہ پہلے گیا تھا اور آج ہی واپس آیا تھا۔ نمبردار نے تمام کہانی انہیں سنا دی۔

ان چاروں کی نظریں ان تینوں کے چہروں پر جمی ہوئی تھیں۔ آنکھیں انگارے برسا رہی تھیں۔ ان تینوں کی وجہ سے گاؤں میں انسان کھٹکتے رہے ہیں۔ قبریں بنتی رہی ہیں۔ بندوقیں پاس نہ تھیں۔ ویسے ہی گرو بابا کے ساتھ چلے آئے تھے کہ یہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح ناکام واپس جائے گا۔

”گرو بابا پہچان لیا ہے ان تینوں حرام زادوں کو۔“

جاگیردار حیات نے آگے بڑھ کر زاہد کے بالوں کو نوچتے ہوئے کہا۔

”ایک ایک مرنے والے کا بدلہ لوں گا ان سے۔“ اتنا کہتے ہی اس نے زاہد پر گھونسو، لاتوں کی بارش کر دی۔ کرن تو بے بس تھی۔ علم والے کے سامنے ہمت نہیں کر سکتی تھی۔

”گرو بابا ان تینوں کو باندھ دو۔ ان کو گولیوں سے ختم نہیں کرنا۔ چھری چاقو سے ان کے جسموں کو کاٹنا ہے۔ بوٹی بوٹی کر کے کتوں کے آگے ڈالنی ہے۔ گاؤں میں ڈھنڈورا پھر وادو کہ گاؤں والوں کو، حویلی والوں کو جلانے والا، پگھلانے والا مجسمہ قابو آ گیا ہے اور صبح ہر کسی کے سامنے اس کے جسم کی یوٹیاں کرنی ہیں۔ ہر گھر میں اس کے جسم کی ایک ایک بوٹی بھینچنی ہے۔“

قریب کھڑے ملازم حکم سنتے ہی گاؤں آ گئے۔ اعلان کرنے لگے۔ ڈھنڈورے پیٹنے

کرن، کول اور زاہد کے ملاپ پر خوب جی بھرناچی۔ جن زادیوں کے تاج نے اس دیرانے کو ایسا دلکش اور پرفریب مہکتا بنا دیا کہ کول کی آنکھیں پھٹک پڑیں۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اس کے ملاپ پر کرن اتنا خوش ہوگی۔ وہ تو خود کو جلے نصیبوں والا سمجھتی تھی لیکن اب وہ اپنے محبوب کے پہلو میں بیٹھی سامنے خوبصورت دو شیرازوں کے رقص سے محظوظ ہو رہی تھی۔ بھنگی آنکھوں کے ساتھ لبوں پر میٹھی میٹھی مسکراہٹ بھی تھی۔

زاہد کبھی ناجتنی ہوئی کرن کو دیکھتا اور کبھی پاس بیٹھی کول کو، لہذا دوسرے دن کرن بھی زاہد کی بن گئی اور دونوں کو لے اڑی۔ اس جزیرے میں قدم رکھا لیکن یہاں جزیرے میں آتے ہی ان سب کو ایک ایسے طوفان نے جکڑ لیا جس کے سامنے تینوں ہی بے بس ہو گئے۔ تینوں کے ہی ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ تینوں کے جسم ہی پسینے میں بھینگنے لگے۔ تینوں کی آنکھیں ہی خوف و ڈر سے پھرا گئیں۔

نہ زاہد کی جلتی آنکھیں اپنا جادو جگا سکیں، نہ طاقتور طوفانوں سے ٹکرانے والی، زمانے سے ٹکرانے والی، تابیاں بچانے والی، ہواؤں میں اڑنے والی کرن میں مقابلہ کرنے کی ہمت رہی اور نہ ہی دریاؤں کے پانیوں کو چیرنے والی، موجوں سے کھیلنے والی، انسانوں کو ڈسنے والی، جسموں سے خون نچوڑنے والی کول اپنے اندر کے زہر کو اگل سکی۔

یہ تینوں ہی بے بس، سہمے ہوئے، مرجھائے ہوئے، ڈرے ہوئے، خوفزدہ آنکھوں میں ڈر لئے کھڑے تھے اور موت جیسے ان تینوں کے سروں پر رقص کر رہی تھی۔ تینوں ہی بے بسی کے عالم میں خود کو موت کے شکنجے میں پھنسا دیکھنے لگے۔ سامنے جزیرے میں سیاہ رنگت والی، الجھے بالوں والی، لمبے لمبے دانتوں والی، آنکھوں سے شعلے ابھارتی ہوئی، زمینوں کو دانتوں سے اکھیرتی ہوئی چڑیل دکھائی دی۔ منہ کھلتی تو آگ کے شعلے جزیرے میں پھیل جاتے۔ قہقہے لگاتی تو دھرتی کانپ جاتی، دل ڈوب جاتے۔ کانوں کے پردے پھٹ جاتے۔

جب وہ کھڑی ہوئی تو اس قدر دراز قد تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کے سامنے یہ چیونٹیاں ہوں، کیڑے مکوڑے ہوں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی بھیا نک بلا دیکھی تھی۔ ایک ہاتھ پر ہی ان تینوں کو اٹھایا اور دریا میں چلنے لگی۔ گہرے دریا کا پانی اس چڑیل کے گھٹنوں تک بھی نہ پہنچ پایا۔ قہقہے لگاتی ہوئی رات کے سیاہ سائے میں گاؤں کے قبرستان میں ان تینوں کو لا پھینکا۔

”آقا یہ غلام حاضر ہے اور جنہیں آپ نے طلب کیا ہے، آپ کے سامنے پڑے

گے۔ گاؤں میں جشن منائے جانے لگے۔ دھال، بھنگڑے ڈالے جانے لگے۔

”بہت ترپایا ہے تو نے گاؤں والوں کو، بہت چلایا ہے تو نے گاؤں والوں کو، بہت رلایا ہے تو نے گاؤں والوں اور شہزادی اس کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے جسم کو بھی داغدار کر دیں گے اور یہ حسینہ۔ یہ وہی حسینہ ہے نا جو اس حرام زادے کے مجسے کے ارد گرد رقص کیا کرتی تھی۔ اپنے آپ پر حسن لادے قہقہے لگاتی تھی۔ اس کی حفاظت کیا کرتی تھی۔ اس کے بالوں کو سنوارا کرتی تھی۔ اس کا بناؤ سنگھار کیا کرتی تھی۔ عاشق بنی ہوئی تھی اس کی صبح سب کی عاشقی معوشی نکال دوں گا۔ تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ ترسا ترسا کر ماروں گا۔“

پھر زاہد کے بالوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔

”حرام زادے تو مجھ سے موت مانگے لگا لیکن تجھے موت نہیں ملے گی۔ زندگی مانگے گا لیکن تجھے زندگی نہیں ملے گی۔ زندگی موت کے سچ تجھے لٹکا کر رکھ دوں گا۔ تیری یہ جلتی آنکھیں اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ جائیں گی۔ تیری ان آنکھوں کو آگ لگا دوں گا۔“ ساتھ ہی قہقہے گونجنے لگے۔ ملازم آنکھوں میں خوشی کی چمک لئے سامنے کھڑے مجرموں کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔

”وہاں تجھے یہ حسینہ اچھی لگتی تھی ناں، تیرا اس پر دل آ گیا تھا ناں۔ لے جاؤ اسے کسی دیرانے میں لے جاؤ اور ایسا سلوک کرو کہ اس کی آنے والی حسیں بھی یاد رکھیں۔ مجھے تو اس کی کمین زاہد سے حساب لینا ہے۔ جس طرح اس کی بہنوں کو مارا ہے، اس کی ماں کو مارا ہے۔ اس کے باپ کو مارا ہے۔ اسی طرح اسے بھی ترسا ترسا کر مارنا ہے۔“

”ذلیل کمینو، اپنی زندگی کی گھڑیاں لمحات اپنی انگلیوں پر گنتا شروع کر دو۔ خدا کے سامنے روؤ کہ رات لمبی ہو جائے۔ کبھی ختم نہ ہو کیونکہ رات ختم ہوگئی تو یقینی بات ہے کہ صبح ہوگی اور جب صبح ہوگی تو پھر تم نہ ہو گے۔“

جاگیردار حیات کی اس بات پر قبرستان میں قہقہے گونجنے لگے۔

”علم دین تم کیوں خاموش کھڑے ہو۔ تم کیوں چپ ہو۔ تم بھی اپنا کمال دکھاؤ۔ دیکھو نا گرو بابا نے ان حرامیوں کو قابو کیا ہے۔ شہزادی کو جکڑا ہے۔ اس کے چیلے نے اس حرام زادے کو باندھا ہے۔ تم کیا کہتے ہو، تمہارا علم کیا کہتا ہے۔“

علم دین حیات صاحب کی بات سنتے ہی بین بجانے لگا تو قریب کھڑی کوئل تڑپنے لگی۔ اس کا خوبصورت جسم تھرکنے لگا۔ ناچنے لگی۔ کبھی ناگن بنتی اور کبھی دو شیرہ۔

”علم دین رکو رکو۔“

ایک عجیب منظر دیکھ کر سبھی چونک گئے۔ علم دین نے بین بجانا بند کر دی۔ ”واہ بھی واہ۔ کمال کر دیا تیری اس بین نے۔ مان گیا ہوں تمہیں۔“ حیات صاحب کوئل کے قریب ہوئے۔ اس کے بالوں کو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”اچھا تو تو یہ چیز ہے۔ کتنا بھیانک ہے تیرے حسن کے پیچھے چھپا ہوا یہ روپ۔ تو نے تو حیران کر دیا ہمیں۔“ ساتھ ہی جاگیردار گرجا۔ ”بول تو نے نکالی تھیں ناں مراد صاحب کی آنکھیں۔ تو نے جھینٹی تھی ناں اس کی آنکھوں کی روشنی۔ تو نے کیا تھا ناں اسے اندھا۔ تو نے مارا تھا ناں مالک کو۔ بتا کس کس کو ڈسا ہے تو نے ناگن بن کر۔ ناگوں، سانپوں کی فوجیں تو ہی لے کر آتی تھی نا گاؤں میں خوف و ہراس تو نے ہی پھیلایا تھا۔ اب دیکھ تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔ تو رات کو خود سوچ لینا کہ کون سی موت مرنا چاہتی ہے۔ کٹ کر مرنا چاہتی ہے، جل کر مرنا چاہتی ہے یا لٹک کر مرنا چاہتی ہے۔“

ساتھ ہی جاگیردار قہقہے لگانے لگا۔ وہاں موجود تمام لوگ قہقہے لگانے لگے لیکن ایک گرج دار آواز کے فضا میں گونجنے سے دیرانے میں ابھرنے والے تمام قہقہے دم توڑ گئے۔ کوئل چیخ رہی تھی۔

”جاگیردار اچھا کیا کہ تو نے ہمیں پہچان لیا ہے۔ جس طرح تیرے خاندان کو ڈسا ہے، اسی طرح اب سب سے پہلا تو میرا شکار ہوگا۔ بہت چیخ لیا ہے تو نے۔ بہت بول لیا ہے تو نے۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ ہم موت سے ڈرتے ہیں۔ یہ تیری بھول ہے۔ ہم تو اپنی موت ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ اپنے محبوب کی خاطر ایک بار تو کیا ہزار بار مرنے کو تیار ہیں۔ تو اپنی زندگی کے لمحے گن، اگر ہم گئے تو پھر تم لوگ نہیں بچو گے۔“

حسینہ کوئل کی گرجدار آواز میں دھمکیاں سن کر وہاں موجود تمام گاؤں والے کانپ کر رہ گئے۔ جاگیردار حیات کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اتنے بڑے مجمع میں اسے لٹکا کر گیا تھا۔ اس کی عزت و ناموس خاک میں ملائی گئی تھی۔ آنکھوں میں شعلے لئے وہ کوئل کی طرف بڑھا اور اس کے حسین چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی جس سے زاہد تڑپ کر رہ گیا۔ کرن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”کاٹ دوں گا تیری زبان جس زبان سے تو نے ہم حویلی والوں کو لٹکا رہا ہے۔ زندہ

محبوب دیکھے گا۔ ہم دیکھیں گے۔ علم دین دکھاؤ اپنی اس چھوٹی سی بین کا کمال۔ آج ہم اس کے تھرکتے جسم کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ جاؤ گاؤں سے جا کر گھنگھرو لاؤ۔ آج یہ ہمارے سامنے ناچے گی اور گردو بابا تم بھی اس شہزادی کو نچاؤ۔ یہ بھی حسینہ ہے۔ یہ بھی تو خوصورتی سے لدی ہوئی ہے۔ آج یہاں ہی جشن ہوں گے۔ یہاں محفل جے گی۔ ان کو اتنا نچاؤ کہ یہ ٹڈال ہو جائیں۔ ان کے خون سے زمین سرخ ہونے لگے کیونکہ صبح ان جسموں کا قیمہ بنانا ہے۔

گھر گھر میں ان کے جسموں کی بوٹیاں بھیجی ہیں اور یہ کی کمین، ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے حرام زادے کی چھری سے آنکھیں نکال کر ان کو آگ لگانی ہے۔“

اتنے میں مٹھائیاں آگئیں، گھنگھرو آگئے۔ چھریاں، کلہاڑیاں آگئیں۔ جاگیردار وہاب چھری پکڑے زاہد کی طرف بڑھا کہ ابھی اس کی دونوں آنکھیں نکال دے لیکن حیات نے اسے روکا کہ نہیں اسے ابھی قص دیکھنے دو۔ اسے بھی اپنی محبوباؤں کا ناچ دیکھنے دو۔ باندھ دو ان کے پاؤں میں گھنگھرو اور علم دین بجائو بین، نچاؤ ناگن کو، گھنگھرو ان دونوں شہزادیوں کے پاؤں میں باندھ جانے لگے۔ سپیرا بین پکڑے کھڑا ہو گیا۔ اس مجمع میں سبھی کے قہقہے گونجنے لگے۔

☆.....☆.....☆

بچے کی تو گاؤں والوں تک پہنچے گی اور یہ تیرا محبوب ہے۔ جانتی ہو کون ہے، کمی کمین ہے۔ ہمارے ٹکڑوں پر ہی پلا ہے۔ اب دیکھ تیرے سامنے ہی تیرے محبوب کی آنکھیں نکالتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ بندھے ہوئے، رسیوں میں جکڑے ہوئے زاہد پر چھٹا اور اپنی انگلیوں کے ناخن اس کی آنکھوں میں دھسنے لگا۔

”کھول ذلیل انسان، آنکھیں کھول۔“ لیکن زاہد نے اپنی آنکھیں نہ کھولیں۔ جاگیردار کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ سپیرے کے قریب پڑا ہوا ڈنڈا اٹھایا اور وحشیوں کی طرح زاہد پر برس پڑا۔ چیخوں کی آوازیں اس قبرستان میں گونجنے لگیں۔

”کھول ذلیل انسان آنکھیں کھول۔“

حیات کے ساتھ ساتھ وہاب، جواد بھی مل گئے۔ اس کا چہرہ فوج ڈالا۔ چہرے سے خون بہنے لگا لیکن اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ یہ منظر دیکھتے ہی کرن چیخی۔ ایک طرف کول زخمی تھی تو دوسری طرف اس کا محبوب۔ اس کا چہرہ فوجا جا رہا تھا۔ آنکھیں نکالنے کی کوشش کی جا رہی تھی اور یہ کیسے برداشت کر سکتی کہ۔

”بس کرو ظالمو۔ بس کرو۔ اپنے اس گرو سے کہو کہ صرف چند لمحوں کے لئے مجھے اپنے علم سے آزاد کر دے۔ طوفان بن جاؤں گی۔ مٹا دوں گی تمہارے گاؤں کا نام و نشان۔ چیر پھاڑ کے رکھ دوں گی تمہارے جسموں کو۔ چباؤ والوں کی تمہاری لمبی لمبی زبانوں کو۔ صرف ایک بار مجھے آزاد کر دو۔“ کرن کی اس بات پر اس ویرانے میں قہقہے گونجنے لگے۔

”صرف چند لمحوں کے لئے چھوڑ دوں، واہ کیا خوب بات کہی ہے۔ ارے تیری پیاری پیاری صورت کو بڑی مشکل سے قابو کیا ہے اور تو کہتی ہے، چھوڑ دوں۔ واہ گردو بابا واہ۔ جی چاہتا ہے تیرے ہاتھوں کو چوم لوں۔ ان کو تڑپتے دیکھ کر دل خوشی سے اچھل رہا ہے۔ جی چاہتا ہے جشن مناؤں، دیکھیں چڑھاؤں۔“

جشن کا نام سنتے ہی نبرداری جواد بولا۔ ”بھائی حیات آج جشن یہاں ہی مناتے ہیں۔ دیکھا نہیں آپ نے یہ ناگن کتنا پیارا ناچتی ہے۔ دلوں کو جکڑ لیتی ہے۔ روجوں کو تسکین پہنچاتی ہے۔“ جواد کی اس بات پر قہقہے ابھرے۔

”واہ وہاب صاحب واہ، تیری بات سیدھی دل پہ لگی ہے۔ آج رات یہیں اس قبرستان میں، اسی ویرانے میں جشن مناتے ہیں۔ ان دونوں حسین شہزادیوں کو نچاتے ہیں کیونکہ صبح ان کا حسن مٹی میں مل جانا ہے، ہواؤں میں بکھر جانا ہے۔ یہ ناچیں گی اور ان کا یہ ذلیل

سے آزاد کرتا ہوں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔ میری جان بخشی کر دو۔ گرد بابا منت سماجت کرتا رہا۔ جسم موت کے ڈر سے کانپ رہا تھا۔ پسینہ سے بھیگ رہا تھا لیکن زاہد کی آتش آنکھوں کی لپیٹ سے بچ نہ سکا، بھاگ نہ سکا، مدہوش ہوئے بے بسی کی حالت میں چلتا ہوا زاہد کی نظروں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

کرن بھی آزاد ہو گئی تھی۔ گرد بابا نے جنات کو اپنے علم سے سبھی کو آزاد کر دیا تھا۔ زنجیروں میں جکڑی کرن آزادی پاتے ہی طوفان بن گئی۔ لحوں میں ہی ہر طرف آندھیاں چلنے لگیں۔ گرد بابا کا چیلہ یہ دیکھ کر ایک درخت کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کھڑا ہو گیا۔ رحم کرو، رحم کرو مجھے نہ مارو مجھے نہ مارو۔

کول کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے ہونٹوں پر اپنی زبان پھیرتے ہوئے دیکھ کر چیلہ کانپتے اور بھیگتے جسم کے ساتھ ساتھ جوڑے کھڑا تھا اور کرن ایک طوفان کی شکل میں گاؤں میں پھیلی ہوئی تھی۔ گاؤں میں چیخ و پکار ایسے تھی جیسے قیامت کا سماں ہو، جیسے گاؤں کی گلیاں انسانی خون سے سرخ ہو رہی ہوں۔

گرتے مکانوں کی آوازیں دور دراز تک سنائی دے رہی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے یہاں کے تمام جنات نے گاؤں پر حملہ کر دیا ہو۔ اپنے سردار کے جکڑنے کا بدلہ لے رہے ہوں۔ اس چلتے ہوئے طوفان میں میٹھے میٹھے تھپتھپے گونجنے لگے۔ گھنگھروں کی جھکار فضاؤں میں بکھرنے لگی۔ اپنی معصوم صورت کے ساتھ کرن کول کے قریب آ گئی اور کول جو ابھی تک بھری ہوئی تھی بار بار وہ منظر نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا جب اس کے محبوب پر پتھروں کی بارش ہو رہی تھی ڈنڈوں سے پیٹا جا رہا تھا، چہرے کو نوچا جا رہا تھا، آنکھوں کو نکالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ اپنے محبوب پر ایسے لمحات کیسے برداشت کر سکتی تھی اور یہ سب اس چپلے کی وجہ سے ہوا تھا جو گرد بابا کو لے کر یہاں آیا تھا۔ کول نے جھپٹنے کے سے انداز میں اپنے زہریلے دانت چپلے کی گردن میں ٹھونس دیئے۔ وہ تڑپا لیکن چیخ نہ سکا زاہد بھی گرد بابا کو اپنی نظروں کا نشانہ بنانے کے بعد ان کے پاس آ گیا۔ مار کٹائی سے اس کا چہرہ خون سے سرخ تھا۔ سر پینسا ہوا تھا۔ چہرے پر ناخنوں کی خراش کے نشان نمایاں تھے۔ تینوں ہی انتقام بنے ہوئے تھے۔ کول اس کی گردن پر زہریلے دانت چبھوئے کھڑی تھی۔ کرن زندہ سلامت انسان کے جسم سے گوشت اتارنے میں مصروف تھی اور زاہد جلتی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ تڑپے جا رہا تھا۔ جب اس کا جسم جھلنے لگا، پکھلنے لگا تو کول نے اپنے زہریلے دانت باہر نکال لئے۔ اپنے محبوب کی

علم دین دکھاؤ اپنا کمال، نچاؤ اسے، پائل کی جھنکار کی آواز کے ساتھ اس کا ناچ بہت سرور دے گا لیکن علم دین اسے کیسے نچاتا اس کے پاؤں میں بندھے کنکھروں کو کیسے چھنکاتا وہ تو خود زاہد کی آتش آنکھوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ چمکتی آنکھوں نے اسے مدہوش کر دیا تھا۔ آنکھیں پتھرا چکی تھیں اور چلتے چلتے زاہد کی نظروں کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

زاہد خود زخمی تھا، خون میں بھیگا ہوا تھا، سر پینسا ہوا تھا، کپڑے خون سے تر تھے لیکن اتنے شدید درد کے باوجود بھی زاہد نے خود کو مدہوش میں رکھا اور اپنے وجود کو اپنی گرفت میں رکھا اور اپنی آنکھوں کا جادو چلا دیا تھا۔

یہ منظر دیکھتے ہی سبھی لوگ چوک گئے۔ جاگیردار اپنی بندوق پر ہاتھ رکھنے ہی والا تھا کہ کول چیخیں۔ اس کے چیخنے ہی جھاڑیوں، قبرستانوں میں چھپے سانپوں، ناگوں نے اس بھرے مجمع پر حملہ کر دیا۔ ہر طرف سانپ ہی سانپ دکھائی دینے لگے۔ لحوں میں ہی یہ سہانی محفل ختم ہو گئی۔ خوف و ہراس پھیل گیا، افراتفری برپا ہو گئی، چیخ و پکار کی آوازیں رات کے سناٹے میں گونجنے لگیں، بھگدڑ مچ گئی۔ ہر کسی کا چہرہ خوف میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر کوئی اپنی جان بچانے کی غرض سے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔

کول پھنکارنے لگی۔ سپرے کو جلانے کے بعد، پکھلانے کے بعد زاہد کی آتش آنکھیں گرد بابا پر پڑ گئیں۔ اس منظر سے گرد بابا بھی کانپ کر رہ گیا تھا۔ اس نے شاید زاہد کو معمولی انسان سمجھ رکھا تھا، شاید عام لڑکا سمجھ رکھا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس کی تپتی اور جلتی آنکھیں جسموں کو جلا پکھلا دے گی۔ جلتی آنکھوں کی لپیٹ میں آتے ہی گرد بابا کی بھی ہلتی ہوئی زبان لڑکھڑانے لگی۔ اسے بھی سر پر ریگتی ہوئی موت دکھائی دی۔ اس لمحے اسے بھی خدا یاد آ گیا۔ شیطانوں کو بھول کر خدا تعالیٰ کے واسطے دینے لگا۔ خدا کیلئے مجھے نہ مارو، میرا سارا علم لے لو لیکن مجھے چھوڑ دو۔ دیکھو میں تمہارے سامنے ہی تمام جنات، چڑیلوں، مردوں کو اپنے علم

بھی کتے بے حس ہو گئے ہیں۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر بھی خاموش ہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ اسے ہسپتال لے چلیں۔ چلو نو جوان اٹھو گاڑی میں بیٹھو تجھے ہسپتال پہنچا دیں تمہارا علاج کرائیں، مرہم پٹی کرائیں اور پھر لیوں پر شیطانی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے شہزادیوں سے مخاطب ہوا چلو آپ بھی بیٹھیں۔ غصہ نہ کرنا یہ شہر والے خود غرض ہیں لا پرواہ ہیں دکھ درد سے ناواقف ہیں۔

حسین شہزادیوں کو دیکھنے کے باوجود بھی یہ نہیں سوچا کہ آدھی سے زیادہ رات گزر گئی ہے۔ پیچاری لاوارثوں کی طرح سڑک کنارے بیٹھی ہیں۔ کسی نے بھی مدد نہیں کی اور یہ دونوں شہزادیاں اپنے محبوب کے جسم پر چوٹوں کے نشان دیکھ کر آنسو بہا رہی تھیں۔ کوئل کا تو جی چاہتا تھا ابھی گاؤں جا کر جاگیردار حیات کی آنکھیں نکال دے، جسم قیمہ قیمہ بنا دے جس نے اس کے محبوب کو اتنی اذیت دی ہے۔ انہیں اپنی فکر نہ تھی اپنے شہزادے کی فکر تھی اپنے محبوب کی فکر تھی۔

زاہد اس شخص کی باتوں میں آ گیا۔ ان لوگوں کو اپنا ہمدرد سمجھ بیٹھا۔ تبھی تو اپنی شہزادیوں کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کوئل نے اپنے محبوب کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور چلتے لگیں تو پاؤں میں باندھے گھنگھروں کی آوازیں ایسی گونجیں جیسے اس سڑک کنارے دلفریب نظارے ہوں، مست کر دینے والی جھکنا ہو۔ ان کے ہر قدم پر گھنگھرو چھلکتے جو ان شیطانوں کے دلوں میں جا لگتے۔ ان کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیلتی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی گاڑی روشنیوں کے شہر میں گھومنے لگی۔ بار بار ان کی نظریں ان دونوں حسیناؤں پر پڑتیں۔ ان کے چہروں کو گھورتے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ان کے حسن کے پیچھے کتنا بھیاںک روپ پوشیدہ ہے؟ وہ کون ہیں؟ کس مخلوق سے تعلق رکھتی ہیں؟

اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ طوفان برپا کرنے والی زہرا لگنے والی حسینا کیں ہیں تو شاید ان کے مسکراتے ہونٹ کانپتے، لرزتے، کپکپی طاری ہو جاتی۔ وہ تو مست تھے۔ دلوں میں پرورش پانے والے شیطانی خیالات کو عملی جامہ پہناتا چاہتے تھے۔ عام لڑکیوں کی طرح ان کے جسموں کو بھی داغ دینا چاہتے تھے۔ چلتے چلتے گاڑی ایک کونھی کے سامنے جا رکی۔ ہارن دینے پر گیٹ کھلا اور سیدھا لان میں جا کر رکی۔ گاڑی سے باہر نکلتے ہی ایک مونچھوں والا بولا جاؤ جلدی سے ڈاکٹروں کو بلا کر لاڈیہاں آرام سے اس کی مرہم پٹی کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ زاہد کو عزت سے لے کر ایک کمرے میں گئے اور بیڈ پر لٹاتے ہی باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ باہر

طرف دیکھا خون سے سرخ چہرہ دیکھ کر کانپ کر رہ گئی۔ یہ سب جاگیردار حیات نے کیا تھا اور جاگیردار حیات اب کوئل کے ہاتھوں سے کیسے بچ سکتا تھا۔ ابھی اسے ختم کرنے کے لئے چلتے ہی والی تھی کہ کرن نے اسے پکڑا، اپنے محبوب کو پکڑا اور لے اڑی۔ لمحوں میں ہی یہ تینوں ایک باروق شہر میں تھے۔ سڑک کنارے بیٹھے تھے۔ شدید درد کے باوجود بھی زاہد شہر کی جلتی ہوئی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ کیا یہ اس کے نانا کا شہر تو نہیں ہے اور کوئل اور کرن اس کے جسم پر لگے ہوئے زخموں سے رسنے والے خون کو اپنے اپنے دوپٹوں سے صاف کرنے میں مصروف تھیں۔

دو شہزادیوں کے درمیان، دو حسیناؤں کے درمیان، دو پریوں کے درمیان، دو مدد جبینوں کے درمیان بیٹھا ہوا زاہد فخر محسوس کر رہا تھا۔ شہریوں کے سڑک پر چلتے چلتے قدم خود بخود رک رہے تھے۔ نگاہیں ان شہزادیوں کے لاجواب حسن پر بار بار پڑتی تھیں۔ لوگ شہری لڑکیوں کے حسن کو بھول کر ان کے حسن میں محو رہے تھے۔

شہری لڑکیوں کے حسن ان کے سامنے بالکل پھیکے اور ماند دکھائی دیتے تھے۔ خود شہری لڑکیاں بھی ان کے حسن کو دیکھ کر اپنی نظریں آسمانوں کی طرف اٹھا رہی تھیں کہ بنانے والے نے کمال کر دکھایا ہے۔ فرصت کے لمحات میں انہیں بتایا ہے۔

شہر کی حسینائیں کچھ کٹے بالوں والی کچھ لمبے بالوں والی اور کچھ براؤن بالوں والی خوبصورت سیاہ آنکھوں والی اور بھوری آنکھوں والی سمارت دیکھنے والی سیاہ اور سفید عینکوں والی بھی سڑک کنارے ان دونوں پریوں کو دیکھ کر مست ہو رہی تھیں۔ ان کے حسن کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھیں۔ ان کے سامنے خود کو عام لڑکیاں سمجھ رہی تھیں۔ اپنے حسوں کو معمولی سمجھ رہی تھیں۔ وہ قدرت کی تخلیق کر عیش کر رہی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد ہی ایک سفید لمبی سی گاڑی کے بریک چرچرائے۔ چند گز آگے جا کر رکنے والی یہ گاڑی بیک ہوتے ہوئے دوبارہ ان حسین شہزادیوں کے سامنے رک گئی۔ تین لمبی لمبی مونچھوں والے چوڑے چوڑے چہروں والوں کی موٹی موٹی شیطانی آنکھیں انہیں گھورنے لگیں۔ ایسا حسن انہوں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ تینوں ہی آپس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو کچھ کہے جا رہے تھے۔ یہ ان کے حسن کو روند ڈالنے کے پروگرام بنا رہے تھے۔ تبھی تو ایک شخص گاڑی سے باہر نکلا۔ ان کے قریب آتے ہی بولا۔

”توبہ توبہ یہ لڑکا تو بری طرح زخمی ہے۔ لگتا ہے ایکسڈنٹ ہوا ہے۔ یہ شہر کے لوگ

اس کے محبوب کو بری نظر سے دیکھے۔ وہ تو اس کے محبوب کی آنکھیں نوح لینا چاہتے تھے۔ جسم کا قیہ بنا دینا چاہتے تھے۔ سر کاٹ کر تمام گاؤں والوں کو دکھانا چاہتے تھے۔ جاگیردار حیات تو سر نہیں کاٹے گا میں تیرا سر کاٹوں گی۔ تو میرے محبوب کی آنکھیں نہیں نکالے گا میں تیری آنکھیں نکالوں گی تو میرے محبوب کے جسم کا قیہ نہیں بنائے گا میں تیرے جسم کا قیہ بناؤں گی تیرے زندہ سلامت جسم کا قیہ بناؤں گی۔ تجھے عبرت بناؤں گی لوگ تیری موت سے خوفزدہ ہوں گے۔ جنہوں نے میرے محبوب کی آنکھوں میں آنسو دیئے ہیں میں ان سب کی آنکھیں نکال دوں گی۔

کول ایک کونے میں بیٹھی انتقام کی آگ میں جل رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔ محبوب کے چہرے پر زخموں کے نشان اس کے انتقام کو مزید بھڑکا رہے تھے۔ وہ انھی اپنے لیے ہوئے محبوب کے پاس آئی وہ آنکھیں بند کیے شاید سو رہا تھا کول نے پہلے اپنے محبوب اپنے سرتاج کے پاؤں کو چوما چاٹا پھر چہرے کے قریب آئی روتے ہوئے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی اور زیر لب بولتی رہی۔ میرے محبوب، میری جان، میرے سرتاج میں جاری ہوں۔ ان ظالموں کی بستی میں جنہوں نے آپ کے خوبصورت جسم کو داغ دار بنایا ہے، جنہوں نے آپ کو باندھ کر مارا بیٹھا ہے۔ میری جان آپ کا بدلہ لینے جا رہی ہوں۔ جب تک انہیں ختم نہ کر لوں جین سے نہیں بیٹھوں گی اور پھر آنکھیں بند کیے ایک کونے میں بیٹھی کرن کے قریب گئی اور اسے بھی زیر لب کہا کرن میرے محبوب کا خیال رکھنا۔ پریشان نہ ہونے دینا۔ ایک لمحہ بھی تکلیف میں مبتلا نہ ہونے دینا۔ ظالم دنیا سے بچائے رکھنا۔ میں جلد آ جاؤں گی۔ ان ظالموں کی آنکھیں نکال کر اپنے محبوب کے قدموں میں رکھ دوں گی۔ اور نجانے کیوں اس کے آنسو تھمتے نہ تھے۔ کیوں بار بار اپنے لیے ہوئے محبوب کو دیکھے جا رہی تھی کہ بھاگتی ہوئی کھنڈرات سے باہر آگئی اور پھر بھاگتے ہوئے شہر سے دور نکل گئی۔ جب تک رات کا اندھیرا پھیلا رہا یہ بھاگتی رہی۔ جب صبح ہوئی تو ناگن بنے ریگتے لگی۔ بیس پچیس میل کا سفر معمولی سفر نہ تھا چھپتی چھپاتی دن بھر ریگتی رہی۔ انتقامی آگ سے اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ محبوب کے حسین چہرے پر لگے ہوئے خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔

جب بھی محبوب کا چہرہ نظروں کے سامنے آتا اور تیز ریگتی۔ نہ اسے بھوک پیاس کی فکر تھی نہ تھکاؤ کی۔ بس دماغ پر انتقام سوار تھا۔ حیات کے جسم کے ٹکڑوں کو حویلی میں بکیرنا تھا، آنکھیں نکالنی تھی، سر کاٹنا تھا۔

قیہے گونجے لگے۔ آہ کتنا حسن چمکتا ہے تمہارے حسین چہروں سے۔ چلتی ہو تو چھن چھن چھن کی آواز ایسے گونجتی ہے جیسے تمام دنیا کو مست کر دوگی۔ ان لفاظ کے ساتھ ہی پھر شیطانی قیہے گونجے، کرن، کول ان کے دلوں میں اٹھنے والی شیطانی فعل کو بھانپ گئیں لیکن وہ نہ تو کمزور تھیں اور نہ ہی ان درندوں سے مات کھانے والی تھیں۔ ان کو ہنستا دیکھ کر کرن بھی قیہے لگانے لگی۔ اس کے منہ سے گونجے والے یہ قیہے بھیا نک ہوتے گئے۔ ڈر خوف پیدا کرنے لگے۔ چند لمحے پہلے دلوں میں شیطانی خیالات کو ہوا دینے والے تینوں بد معاشوں کے چہرے خوف و ڈر سے لٹک گئے۔ جسم کا پتے لگے۔ کیونکہ ان کے سامنے دو شہزادیاں، یہ حسینائیں اور پریاں نہ تھیں بلکہ ایک سیاہ ناگن تھی اور ایک دوسری بھیا نک چہرے والی لمبے دانتوں والی، بگڑی شکل والی، بکھرے بالوں والی، لمبے ناخنوں والی جس نے دونوں بد معاشوں کو ہاتھ میں لٹکا رکھا تھا جبکہ تیسرا بھاگنے والا تھا کہ کول نے چھلانگ لگا کر اس کی گردن بھی دبوچ لی تھی۔ اپنے زہریلے دانت گردن میں پیوست کر دیئے تھے۔

کرن نے زور سے انہیں دروازے پر پٹا تو دروازہ ٹوٹ گیا۔ لیٹے ہوئے زاہد نے اٹھ کر اس شخص کو بالوں سے پکڑا اس کا چہرہ اپنی آنکھوں کی طرف کیا اور گھورنے لگا۔ کرن زندہ سلامت آدمی کی کھال کھینچنے لگی۔ دوسرا زاہد کی آنکھوں کی لپٹ میں آ گیا۔ چیخوں سے کونھی لرز رہی تھی لیکن کوئی بھی ان کی مدد نہ آیا۔ چونکدرا گھر کا نوکر یہ منظر دیکھ کر اپنے کمرے میں گھسا اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ لمحوں میں ہی وہاں کا ماحول بدل گیا۔ ایک کے منہ سے پیلی جھاگ بہنے لگی۔ دوسرا ادھڑے ہوئے جسم کے ساتھ تڑپ تڑپ کر مر گیا اور تیسرے کا جسم جلنے لگا، پھٹنے لگا۔

انہیں ختم کرتے ہی زاہد بولا کرن یہاں سے نکل چلو۔ ان کے منہ سے نکلنے والی چیخوں کی آوازیں دوسری کٹھیوں والوں نے سن لی ہیں۔ کرن زاہد کی بات سمجھ گئی اور کول اور زاہد کو لے اڑی۔

شہر کے ایک طرف بنے ہوئے بڑے سے کھنڈرات میں جا ڈیرہ لگایا۔ یہاں کے تمام کمرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایسے لگا جیسے یہاں شہری لوگ آتے جاتے نہ ہوں۔ لیکن کول کو یہاں بھی سکون نہ ملا جاگیردار حیات والا واقعہ نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ اس کے محبوب کے حسین چہرے کو اس ظالم نے ہی تراشا تھا، خون خوار کیا تھا، سر پھوڑا تھا۔ مار کٹائی کی تھی۔ وہ بھلا یہ منظر کیسے بھول سکتی تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے کس کی ہمت تھی کہ

تلاش کر رہا تھا، آوازیں دے رہا تھا۔ کوئل کیوں چھوڑ گئی ہو؟ مجھے کیوں جدائی دے گئی ہو؟ کہاں چھپی بیٹھی ہو؟ سامنے آؤ دیکھو تیرے زاہد کا کیا حال ہو گیا ہے؟ تم میری آنکھوں میں آنسو بھی نہ دیکھتی تھیں دیکھو کیسی برس رہی ہیں، کیسے بہہ رہی ہیں؟ کوئل کی یاد میں زاہد ٹانگوں میں سر دیے روئے جا رہا تھا۔ ادھر کرن ایک ہوا کا بھنور بنی ہوئی ویرانوں میں گھوم رہی تھی اور اپنی مخلوق کو بھی کوئل کی تلاش میں ساتھ ملا لیا تھا۔ نجانے کتنے ہی بھنور ویرانوں میں گاؤں کے ارد گرد بکھرے ہوئے چکر لگا رہے تھے۔ ان اڑتے بھنوروں کو دیکھ کر گاؤں والے خوفزدہ ہو رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان بھنوروں میں آسبی مخلوق ہوتی ہے جو ہر چیز اٹھائے لے اڑتی ہے۔ درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیتی ہے سبھی زندگیاں بچانے کی غرض سے گھروں میں بچے بیٹھے رہے۔ لیکن کوئل جاگیردار حیات کو ختم کرنے کی غرض سے گاؤں کے قریب چھپی ہوئی تھی۔ رات دن چلنے سے تھکاوٹ کی وجہ سے آرام کر رہی تھی۔ ہر طرف سے ناکام ہو کر کرن واپس کھنڈرات آئی اور زاہد کو بتایا کہ اس کا کہیں لم نہیں۔ ہر طرف تلاش کر آئی ہوں، جگہ جگہ اسے ڈھونڈ کر آئی ہوں۔ کہیں سے بھی نہیں ملی۔ نجانے کہاں چھپی بیٹھی ہے۔ سمجھ نہیں آرہی وہ کھنڈرات سے غائب کیسے ہوئی۔ ہم دونوں کو کیوں چھوڑ گئی؟ حالانکہ وہ تو ہم دونوں کے درمیان رہنا چاہتی تھی۔ ایک ساتھ جینا مرنا چاہتی تھی۔ پھر کہاں چلی گئی۔

کرن وہ کہاں جاسکتی ہے۔ وہ تو کہتی تھی زاہد جان میں تمہارے بنا اکیلی نہیں رہ سکتی۔ اب کیوں چھوڑ گئی ہے؟ مجھے اب کیوں جدائی دے گئی ہے؟ اب کیوں نظروں کو انتظار دے گئی ہے؟ کرن تم دونوں ہی میری زندگیاں ہو۔ ایک جسم ہے تو دوسری روح، ایک گلاب ہے تو دوسری مہک، ایک روشنی ہے تو دوسری کرن، ایک گلشن ہے تو دوسری بہار۔ خدا کے لئے اسے کہو کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے واپس آ جائے ورنہ یہ زاہد بکھر جائے گا، ٹوٹ جائے گا، ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

زاہد کی باتیں سن کر کرن بھی رودی۔ اس کی آنکھیں بھی بھگ گئیں۔ کوئل کا معصوم چہرہ اسکے سامنے آ گیا۔ اس کی جدائی سے وہ بھی آدھی رہ گئی تھی کیونکہ ان تینوں نے ایک ساتھ جینے مرنے کی تمہیں کھائی تھیں۔ کبھی جدا نہ ہونے کے وعدے کئے تھے۔ تبھی یہ دونوں کھنڈرات میں اسے تلاش کرنے لگے ایک ایک کوئلے میں اسے دیکھنے لگے۔ کوئل کیوں چھپی بیٹھی ہو؟ کیوں ہماری تڑپ سے لطف اندوز ہو رہی ہو؟ کیوں ہماری بے بسی کا تماشا دیکھ رہی ہو؟ سامنے آ جاؤ نہ تڑپاؤ ہمیں۔

”کرن! کوئل کہاں ہے۔“ زاہد نے صبح سویرے ہی آنکھیں کھولتے ہوئے اپنے قریب کوئل کو نہ پا کر کہا۔

جان ادھر کہیں چھپی بیٹھی رو رہی ہوگی۔ میری طرح آپ کے چہرے پر لگے زخموں کو وہ بھی برداشت نہیں کر پائی ہے۔ یہ لفظ سنتے ہی زاہد کی آنکھیں بھی بھگ گئیں کیونکہ وہ ان دونوں کی وفاداریاں دیکھ کر سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ قسمت اس پر اس قدر مہربان ہو جائے گی۔ ایک طرف کرن جورات بھر زاہد محبوب کے سرہانے بیٹھی رہی تھی محبوب کی سوچوں میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے خبر ہی نہ ہوئی تھی کہ کوئل کہاں ہے؟ کھنڈرات میں بھی موجود ہے یا نہیں؟ کرن بلاؤ اسے میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کس حال میں ہے؟ سوئی بھی ہے یا روتی ہی رہی ہے۔

کرن انھی اور کھنڈرات کا کوئل چھان مارا لیکن کوئل نہ ملی۔ سرتاج ایک ایک کوئل چھان مارا ہے کوئل دکھائی نہیں دی۔ نجانے کہاں چھپی بیٹھی ہے۔

کرن خدا کے لئے اسے تلاش کر دو ڈھونڈو اسے کہاں چلی گئی ہے ہمیں چھوڑ کر۔ اس کوٹھی میں جا کر دیکھو ہو سکتا ہے وہیں گئی ہو۔ کرن کوٹھی میں گئی اور وہاں کا منظر دیکھنے کے بعد واپس آئی۔

سرتاج وہاں بھی نہیں ہے لیکن وہاں ہر طرف لوگ ہی لوگ ہیں۔ سیاہ وردیوں والے ہیں جنہیں مارا ہے ان کی لاشوں کو دیکھ رہے ہیں۔ شہری لوگوں کی رنگت واقعی اڑی ہوئی تھی۔ جو بھی ان تینوں لاشوں کو دیکھتا خوف و ڈر سے بھاگ پڑتا۔ ان کا یہ حال کس نے کیا تھا کسی کو معلوم نہ تھا۔ ملازم پر سکتہ سوار تھا۔ زبان بند تھی۔ اگر اس کی زبان بند نہ ہوتی تو قاتلوں کا پیہ چل سکتا تھا۔ ان تینوں قتلوں کی خبر پھیلنے پھیلنے شہر کے ہر گلی کوئلے میں جا پہنچی۔

کوئی اسے دشمنی کہہ رہا تھا، کوئی خودکشی، کوئی کہہ رہا تھا کہ خود ہی اپنے آپ کو آگ لگا کر جلایا ہے۔ جسوں سے چڑا اتارا ہے لیکن حقیقت سے سبھی ناواقف تھے کیونکہ ایک کے منہ سے زہریلی جھاگ بہہ رہی تھی، دوسرا ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا تھا، گوشت پگھل کر زمین پر پھیلا ہوا تھا اور تیسرے کے جسم سے جگہ جگہ سے گوشت اتر رہا تھا۔ جیسے چھریوں سے اس کے جسم کا گوشت کاٹا گیا ہو۔ یہ شہر والوں کے لئے ایک معرہ تھا۔ تینوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال میں جمع تھیں۔

ادھر زاہد کوئل کی جدائی میں روئے جا رہا تھا۔ کھنڈرات کے کوئلے کوئلے میں اسے

کر رہ گیا، لرز کر رہ گیا، خوفزدہ چہرہ اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا۔

”انسپکٹر سن رہے ہو ان قہقہوں کی آوازیں۔“

”کیسے قہقہے کیسی آوازیں۔ وہاب ہوش میں تو ہو“

انسپکٹر نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ تم قاتلوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ بتاؤ کہاں چھپے ہیں وہ قاتل۔

لیکن وہاب اس کی بات کا کیسے جواب دیتا کمرے کے ایک کونے میں کھڑی کرن کو موت کے فرشتے کے روپ میں دیکھ کر کیسے وہ بول پاتا۔

کرن مسلسل قہقہہ لگائے جا رہی تھی۔ ”انسپکٹر وہ دیکھو وہ سامنے بیٹھی ہے قہقہے لگا رہی ہے۔“

انسپکٹر اکبر جان وہاب کی بہکی بہکی باتیں سن کر خود بھی پریشان ہو گیا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے شربت کے گلاس کا تمام شربت اس کے منہ پر پھینک دیا۔

”وہاب صاحب ہوش کرو۔ بتاؤ کہاں ہیں قاتل؟ کس نے کیا ہے ان تینوں کو قتل؟ کس نے جلایا ہے اسے؟ کس نے جسم کا گوشت اتارا ہے اس کا؟ کس نے اس کی رگوں میں زہر انڈیا ہے؟“

لیکن وہاب اس کونے کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھے جا رہا تھا جہاں کرن کھڑی قہقہے لگانے میں مصروف تھی۔

”بولو جاگیردار صاحب یہ انسپکٹر تم سے قاتلوں کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔“
ساتھ ہی کرن نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور گرجی اگر تم نے اپنی زبان کھولی، کچھ بتانے کی ہمت کی تو کاٹ دوں گی تیری زبان، چاڈالوں گی تیرا جسم نکال دوں گی تیری دونوں آنکھیں۔

جاگیردار وہاب جانتا تھا کہ یہ صرف دھمکی نہیں ہے ایسا ہو سکتا ہے۔ کرن یہ سب کچھ کر سکتی ہے۔

تم لوگوں نے میرے محبوب کا گلشن اجاڑا ہے ایک ایک کو ختم کر دوں گی۔ ایسا انتقام لوں گی کہ یاد رکھو گے۔ تم خود کو جاگیردار سمجھتے ہو غلط سمجھتے ہو۔ یہ جاگیر تیری نہیں ہے اس تمام جاگیر کا صرف ایک مالک ہے۔ ایک ہی خالق ہے۔ صرف اوپر والا آسمانوں کی بلندیوں پر بیٹھا فیصلے کرنے والا خدا۔ تم اپنی زندگی کے دن گنو کیسے مرنا ہے یہ فیصلہ بھی تم خود کر لو جل کر مرنے ہے

زہد تلاش کرتے کرتے بولے جا رہا تھا کہ کھنڈرات سے باہر سڑک پر گاڑی کے بریک چینے۔ اس میں بیٹھا ہوا جاگیردار وہاب کھنڈرات میں انہیں گھورنے لگا۔ شہر میں قتل کے جہڑے تو وہ سن ہی چکا تھا اور جان گیا تھا کہ یہ قتل ان تینوں نے ہی کئے ہیں کیونکہ ان کی موت پر ان کی نشانیاں ظاہر تھیں۔ کئی اموات ایسی گاؤں میں دیکھ چکا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس کا خون کھولنے لگا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ابھی ہاتھ بندوق تک پہنچا بھی نہ تھا کہ کرن نے اسے دیکھ لیا، پہچان لیا۔ وہ گاڑی بھگاتے دوڑ نکل گیا۔ سیدھا اپنے دوست اکبر جان کے پاس چلا گیا جو وردی پہنے تھانے کے لان میں چکر لگا رہا تھا۔ اپنے دوست جاگیردار وہاب کو دیکھتے ہی وہ اس سے چپٹ گیا لیکن جاگیردار وہاب کا چہرہ خوف کے پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ جسم سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ بار بار تھانے کے ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ سر پر موت سوار تھی۔ اسے ایسے لگتا تھا جیسے کرن اس کی گردن میں اپنے نوکیلے ناخن ٹھونس دے گی۔ ابھی اس کی گردن تن سے جدا کر دے گی۔ اس کی زندگی جھین لے گی لیکن جب کچھ دکھائی نہ دیا تو خود کو سنبھالا۔

انسپکٹر اکبر جان اسے لے کر کمرے میں آیا۔ ”وہاب کیا ہوا ہے تمہیں۔ تمہارا چہرہ بتاتا ہے کہ تم خوفزدہ ہو، ڈرے ڈرے ہو، کوئی دشمن تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے؟“
”ہاں ہاں انسپکٹر اکبر جان تم ٹھیک کہتے ہو میری جان خطرے میں ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے ابھی کوئی میری گردن اڑا دے گا۔ ابھی ختم کر دے گا۔“

”وہاب صاحب حوصلہ رکھو یہاں چڑیا پر نہیں مار سکتی تم دشمن کی بات کرتے ہو۔“
”انسپکٹر تم نے سنا ہے شہر میں تین قتل ہوئے ہیں۔ ایک جل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے، دوسرے کے منہ سے زہر ملی جھاگ بہہ رہی ہے اور تیسرے کے جسم کا گوشت جگہ جگہ سے کٹا ہوا ہے۔“ وہاب نے ڈرتے ڈرتے لہجے میں کہا۔

وہاب صاحب صرف سنا ہی نہیں دیکھا بھی ہے۔ ان تینوں کی لاشوں کو ہسپتال چھوڑ کر آیا ہوں۔ ان کے ملازم کو بٹھایا ہوا ہے۔ اس پر سکتہ طاری ہے، ہوش میں آتا ہے تو قاتلوں کا پتہ معلوم ہو جائے گا۔

”انسپکٹر میں جانتا ہوں ان کے قاتلوں کو۔“

ابھی وہاب نے اتنے الفاظ ہی کہے تھے کہ اسے کمرے سے قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کمرے میں گونجنے والے ان قہقہوں کی آوازیں سن کر جاگیردار وہاب کانپ

بولا اور شام ہوتے ہی کھنڈرات کے ارد گرد گاڑیاں جمع ہونے لگیں۔ سائرن بجنے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر زاہد کے چہرے پر ابھی خوف پھیلا ہی تھا کہ کرن اسے لے کر غائب ہو گئی۔ ان لوگوں نے کھنڈرات کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن وہاں سے کچھ نہ ملا۔

رات گہری سے گہری ہو رہی تھی کوئل چھپی ہوئی باہر نکلی اور گاؤں میں چھائے ہوئے سائے کو دیکھ کر گاؤں میں داخل ہو گئی اور حویلی میں جا گھسی۔ تمام کمروں میں جا گیر دار کو تلاش کرتی رہی لیکن کہیں بھی اسے جا گیر دار نظر نہ آیا۔ بالآخر ایک کمرے میں کھلی ہوئی کھڑکی میں کوئل نے حیات صاحب کو بیڈ پر سوتے دیکھ لیا۔ اسے دیکھتے ہی کوئل کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ محبوب کے چہرے پر لگے ہوئے زخموں کے نشان دکھائی دینے لگے تو انتقام بن گئی۔ ناگن بنے کھڑکی کے ذریعے کمرے میں گھسی۔ دوبارہ انسانی روپ اختیار کیا۔ اندر سے دروازے کو کھڈی لگائی اور بیڈ پر لیٹے ہوئے جا گیر دار کے قریب ہوئی اس کے سر ہانے پڑی ہوئی بندوق ہاتھ میں پکڑی جو شاید اس نے اپنی حفاظت کے لئے رکھی تھی۔ اسے پکڑتے ہی کوئل قہقہے لگانے لگی۔ کمرے میں گونجنے والے قہقہوں کی آوازیں سننے ہی جا گیر دار حیات ہڑبوا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے کھڑی کوئل کو دیکھ کر ابھی چیخنے کے لئے اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ کوئل نے بندوق کی نالی اس کے منہ میں دھنسا دی اور گر جی کیوں جا گیر دار تجھے کہا تھا ناں کہ اگر ہم بچ گئے تو پھر تو نہیں بچے گا۔ کوئی بھی نہیں بچے گا تو میرے محبوب کے جسم کا قیمہ بنانا چاہتا تھا ناں۔ تو میرے محبوب کی آنکھیں نکالنا چاہتا تھا ناں۔ تو اس کا سر کاٹنا چاہتا تھا ناں لیکن یہ سب تو نہ کر سکا اب یہ میں کروں گی۔ تیرے جسم کے ٹکڑے میں کروں گی۔ تیرا سر میں کائوں گی، تیری آنکھیں میں نکالوں گی۔

جا گیر دار اب تو اپنی انگلیوں پر زندگی کی گھڑیاں گنتی شروع کر دے۔ کوئل بولے جا رہی تھی اور حیات صاحب کا پنے جا رہے تھے۔ موت سے پہلے مر رہے تھے۔ کوئل نے ایک قہقہہ لگایا اور ساتھ ہی اس کے کھلے ہوئے منہ میں گولی چلا دی۔ گولی کے چلتے ہی وہ تڑپا ایسی کئی گولیاں اس کے منہ میں چلیں۔ وہ تڑپنے لگا لیکن یہ تو وحشی ہو گئی دروازہ کھولا اس کی آنکھیں نکالیں اور چل دی۔ رات کی تنہائی میں جس قدر ہو سکتا تھا وہ تیز تیز بھاگتی رہی۔ گاؤں سے دور سے دور تک ہوتی رہی۔ وہ یہ خوشخبری اپنے محبوب کو سنانا چاہتی تھی۔ اس کی موت کی خبر اپنے محبوب کو پہنچانا چاہتی تھی۔ لمبا سفر تھا ایک رات میں طے نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ مسلسل بھاگ رہی تھی۔ کافی دور جا کر وہ جھاڑیوں میں چھپ گئی۔

کٹ کر مرنا ہے یا لٹ کر مرنا ہے۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی، کسی کو معاف نہیں کروں گی۔ ایسا بھی ایک انتقام لوں گی کہ دنیا دیکھے گی۔ کرن دھمکیاں دیتی رہی، قہقہے لگاتی رہی اور ساتھ ہی کرن غائب ہو گئی۔

وہ ابھی تک لرز رہا تھا، کانپ رہا تھا، کرن کی باتیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

”جا گیر دار وہاں کیا ہوا؟“ انسپکٹر نے اسے جھنجھوڑا۔

”انسپکٹر مجھے جا گیر دار نہ کہنا۔ وہاں نے کانپتے ہوئے اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ

کہا۔“

”اچھا اچھا وہاں صاحب کون ہیں قاتل بتاؤ؟“

لیکن وہاں کچھ نہ بولا۔ جب انسپکٹر اکبر جان نے اسے دلا سہ دیا، حوصلہ دیا تو وہاں

بولا۔

”انسپکٹر شہر میں دو شہزادیاں اور ایک لڑکا نیا آیا ہے۔ وہی قاتل ہیں۔“ یہ الفاظ کہنے

تھے کہ ملازم کی زبان پر لگا ہوا قفل کھل گیا۔ زبان چلنے لگی۔

”ہاں ہاں انسپکٹر صاحب یہ صاحب سچ کہتے ہیں۔ دو شہزادیاں کونھی میں آئی تھیں

ان کے چہروں پر لا جواب حسن تھا ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ تینوں نے ان حسناؤں

سے چھیڑ خانی شروع کی ہی تھی کہ انہوں نے اپنی شکلیں بدل ڈالیں۔ ایک بلا بن گئی اور دوسری

ناگن اور وہ لڑکا انسپکٹر صاحب اس کی آنکھوں میں ایسی کشش تھی کہ مجھے بھی خوف آنے لگا۔

میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک شخص کو جلا ڈالا اس کے جسم کا چڑھ ہڈیوں سے علیحدہ ہو کر

زمین پر گرنے لگا۔ ناگن نے دوسرے کے جسم میں اپنا زہر پھیلا دیا اور اس بلا نے تیسرے شخص

کو نوچ ڈالا۔ اس کے جسم کا گوشت کھینچنے لگی۔

انسپکٹر یہ کہانی سن کر حیران و پریشان ہو گیا۔

”وہاں بتاؤ کہاں ہیں یہ تینوں بھی ایک صورتوں والے قاتل۔ دیکھنا کیسے نوجوا ہوں

میں ان کی گردنوں کو؟ کیسے قابو کرتا ہوں ان تینوں کو؟ ایک ایک قتل کی سزا دوں گا ایک ایک

آدمی کا بدلہ لوں گا۔ صرف مجھے جگہ بتا دو۔“ انسپکٹر جذباتی ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر

آیا۔

”انسپکٹر وہ کھنڈرات میں ہیں۔ میں انہیں وہاں دیکھ کر آیا ہوں۔“ جا گیر دار وہاں

آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر خون اتر آیا۔ بندھے ہوئے عاشق پر ڈھائے جانے والے ظلم نظروں میں گھومنے لگے۔ دل چاہا کہ ایک دم چھلانگ لگا کر اس کی گردن دبوچ کر اسے بھی جاگیردار حیات کی طرح ڈس لے، اس کی بھی آنکھیں نکال کر اپنے محبوب کے قدموں میں رکھ دے لیکن ایسا نہ ہوا وہ ابھی سوچوں میں ہی گم تھی، اس پر حملہ کرنے کا پلان بنا رہی تھی کہ ناگن کی غصہ سے بھری پھنکار وہیل تبدیل کرتے ہوئے آدمی نے سن لی۔

یکدم چیخا۔ ”سانپ ناگ۔“

اتنا سننا تھا کہ جاگیردار وہاب چیخا۔ ”پکڑو پکڑو مارو مارو گولی چلاؤ جانے نہ پائے ناگن ہے قاتل ہے، حویلی والوں کی قاتل، گاؤں والوں کی قاتل، ختم کر دو اسے۔“

کول یہ سنتے ہی ایک طرف جھاڑیوں میں دیرانے میں تیزی سے ریگتے لگی۔ گولیاں چلنے لگیں لیکن کوئی گولی نشانے پر نہ لگی۔ کول مسلسل ریگتے ہوئے بھاگے جا رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ان کے قابو میں ہے کیونکہ گاڑی کی چمکتی ہوئی لائٹوں کی روشنی اسی طرف تھی، جس طرف وہ بھاگ رہی تھی۔ گاڑی پیچھے بھاگی آرہی تھی۔ سامنے کیا تھا کچھ خبر نہیں۔ تیزی سے ریگتے ریگتے کول رات کے اندھیرے میں کچھ نہ دیکھ پائی اور ایک گہرے کنویں میں جاگری۔ کافی دور گاڑی بھی رک چکی تھی شاید کسی گڑھے میں پھنس چکی تھی تبھی تو گاڑی کے چیننے کی آوازیں کنویں کے پانی میں تڑپتی ہوئی کول کے کانوں کو چیر رہی تھی۔ وہ بار بار اوپر دیکھتی کہ کہیں اس کے دشمن سر پر تو نہیں آچینے۔ وہ پانی میں چکر کاٹتے ہوئے چھپنے کی غرض سے بل تلاش کرتی رہی۔ ادھر گاڑی کے شور کی مسلسل آوازیں آرہی تھی۔ یہ بات تو وہ سمجھ چکی تھی کہ گاڑی پھنسی ہوئی ہے اور وہ اسے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تلاش کرتے کرتے کول کو ایک جگہ سے اکھڑی ہوئی اینٹ دکھائی دی لہذا اس میں گھس گئی۔ یہ خالی اکھڑی اینٹ نہ تھی بلکہ ایسی جگہ تھی جہاں وہ باسانی بیٹھ سکتی تھی۔ شاید کسی بڑے ناگ نے یہ جگہ اپنے لئے بنائی تھی۔ وہیں رات بیت گئی۔ پھنسی ہوئی گاڑی کو انہوں نے نکال لیا تھا اور گاؤں کی طرف چل پڑے تھے۔

اکبر جان دیکھ لیا تم نے یہ وہی ناگن ہے جو سانپوں ناگوں کی فوج کے ساتھ کئی بار گاؤں پر حملہ آور ہو چکی ہے۔ کئی انسانوں کو ڈس چکی ہے۔

یہ اپنا روپ بدلتی ہے تو خوبصورت حسینہ بن جاتی ہے۔ اور جب ناگن بنتی ہے تو ہر کسی کو ڈس لیتی ہے، ختم کر دیتی ہے اپنا تمام زہر اس کی رگوں میں اتار دیتی ہے۔ نہ وہ چیخ سکتا

کرن آج پھر کول کی تلاش میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور شاید کول کا محبوب اسے دیکھنے کو بے تاب تھا۔ کول بھی آج بہت خوش تھی وہ کسی نہ کسی طرح کھنڈرات تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اپنے محبوب کے سامنے دشمن کی آنکھوں کا نذرانہ رکھنا چاہتی تھی اور بتا دینا چاہتی تھی کہ جان جن لوگوں نے آپ کو زخمی کیا تھا انہیں ختم کر دیا ہے۔ کسی کی مجال ہے کہ کول کے ہوتے ہوئے اس کے محبوب پر کوئی ہاتھ ڈالے۔ آنکھیں سامنے رکھے۔ نجانے کیا کیا سوچتی رہی، کن کن خیالوں میں کھوئی رہی۔

کرن تم نے کھنڈرات چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ جانتی ہو کول وہیں کہیں ہے۔ اب وہ ہمیں کیسے تلاش کرے گی؟ کیسے ڈھونڈ پائے گی ہمیں؟ مجھے اس کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ وہ ضرور کھنڈرات جائے گی، ضرور ہمیں تلاش کرے گی لیکن ہمیں وہاں نہ دیکھ کر مر جانا جائے گی، ٹوٹ جائے گی، بکھر جائے گی۔

زاہد ایک دیرانے میں چھپا بیٹھا کرن سے کول کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ اس کی نظروں میں کول کا معصوم چہرہ گھومے جا رہا تھا۔ کبھی اسے ٹکڑوں میں بنا ہوا دیکھتا اور کبھی زندہ سلامت۔

جان، جان آپ کی جان کو خطرہ تھا۔ جاگیردار وہاب نے پولیس والوں کو وہ جگہ بتا دی تھی اور دیکھا نہیں تھا کہ وہاں ہر طرف پولیس والوں کی گاڑیاں چیخ رہی تھیں۔ اب پورا کھنڈر پولیس والوں کے قبضہ میں ہے۔ وہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔ کول کو تلاش کر لیں گے۔ اگر وہ زندہ ہوئی تو مل جائے گی۔ میں نے اپنی مخلوق کو بھیجا ہوا ہے۔

ادھر کول رات کا اندھیرا پھیلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اگر انسانی روپ اختیار کرتی ہے تو تب بھی ماری جاتی ہے کیونکہ جہاں چھپی بیٹھی تھی یہاں سے کچھ دور ہی راہ گزرتی تھی۔ چلتے پھرتے لوگ دکھائی دے رہے تھے لہذا جھپی بیٹھی رہی۔ جب شام ہوئی رات کا اندھیرا پھیلا تو کول ناگن سے شہزادی بن گئی اور چلنے لگی۔ ابھی تھوڑا ہی چلی ہوگی کہ اسے ایک جگہ کھڑی گاڑی دکھائی دی تو وہ دوبارہ ناگن بن گئی۔ گاڑی کی دونوں لائٹیں جل رہی تھیں اور تین چار آدمی گاڑی کے قریب ہی کھڑے تھے۔

کول نے غور کیا تو ان لوگوں میں اسے جاگیردار وہاب دکھائی دیا جس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ دیرانے سے ڈر رہا تھا۔ ساتھ ہی ایک خستہ حال انسان کھڑا تھا اور ایک آدمی گاڑی کا پچھلا وہیل تبدیل کرنے میں مصروف تھا۔ اپنے محبوب کے دشمن کو دیکھتے ہی کول کی

ہے جلا ڈالتا ہے، پکھلا ڈالتا ہے۔ ابا حضور اور چچا کو بھی اس نے ہی جلایا پکھلایا ہے اور قبرستان میں جتنی نئی قبریں بنی ہوئی ہیں سبھی ان تینوں کی وجہ سے ہیں۔ لوگ اتنا موت سے نہیں ڈرتے جتنا ان کے ناموں سے ڈرتے ہیں۔

اکبر جان پکڑو انہیں، پھانسی کے تختے پر لٹکا دو۔ ٹکڑے کر دو ان کے، نچوڑ ڈالو ان کے جسموں کے خون کو بھی، قیہ بنا ڈالو ان کے جسموں کو بھی۔ جلا ڈالو انہیں بھی، جلتی بھٹی میں پھینک ڈالو۔

اتنے میں وہی اڑتے ہوئے بگولے بھنور دکھائی دیئے۔ دیکھو اکبر جان ان بھنوروں کو دیکھو یہ سبھی جنات ہیں جو اپنے شکار تلاش کر رہے ہیں۔ یہ سبھی گاؤں والوں کے دشمن ہیں۔ یہ سنتے ہی قریب کھڑے بابا سائیں کی آنکھیں آگ اگلنے لگیں، زبان چلنے لگی، پھونکیں مارنے لگا اور اس کی پھونکوں سے اڑتے ہوئے بھنوروں سے آگ نکلتی اور دھوئیں میں بکھرتے جاتے۔

یہ منظر دیکھتے ہی جاگیردار وہاب کے ساتھ ساتھ سبھی کی توجہ بابا سائیں کے چہرے پر مرکوز ہو گئی۔ جلا دوں گا، جسم کر دوں گا، دھواں بنا دوں گا۔ نجانے کتنے ہی بھنور آگ بننے کے بعد دھوئیں میں بکھرتے رہے۔

چلو قبرستان سائیں بابا نے گھورتے ہوئے کہا۔ ایک ایک کو جکڑ لوں گا۔ ایک ایک کو جلا دوں گا۔ بستیوں کی بستیوں کو آگ لگا دوں گا۔ نسل در نسل ختم کر دوں گا۔ یہ جاتی مخلوق میرے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ بے بس ہیں، جب چاہوں انہیں پکڑ سکتا ہوں، جکڑ سکتا ہوں، ختم کر سکتا ہوں، جسم کے ٹکڑے کر سکتا ہوں۔ اب کوئی میرے ہاتھ سے نہیں بچے گا۔ کوئی دہشت نہیں پھیلا سکے گا۔ کوئی گاؤں والوں پر حملہ نہیں کر سکے گا۔ صرف میرے منتر کا ایک لفظ ہی ان کو جلانے کیلئے کافی ہے۔

بابا سائیں لوگوں کے ہجوم میں گرج رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں ایسے جیسے وہ بھی ایک بہت بڑا بھوت ہو۔

جلد ہی جاگیردار حیات خان کی لاش کو لے کر قبرستان چلنے لگے۔ انہیں جا کر دفن کیا گیا اور اسی قبر کے پاس بابا سائیں بیٹھ گیا۔ بھیا تک شکلوں والے جنات چڑیلیں آتے رہے آگ لگنے کے بعد دھوئیں میں اڑتے رہے۔

بابا سائیں اس شہزادی کو قابو کرو۔ اس حسینہ کو قابو کرو جو قتل و غارت برپا کئے ہوئے ہے لیکن جلنے والوں میں دھواں بننے والوں میں کرن نہ تھی۔ وہ نجانے کتنی دور جا رہی تھی؟ کتنی

ہے نہ وہ چلا سکتا ہے۔ انسان کو بے بس کر دیتی ہے۔ جانے کتنے لوگوں کی رگوں میں زہر انڈیل چکی ہے کتنے لوگوں کی زندگی سے کھیل چکی ہے کتنے لوگوں کو نشانہ بنا چکی ہے۔

جاگیردار یہ تمہارا وہم ہے۔ ہزاروں سانپ ناگنیں ان ویرانوں میں گھسے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ضروری نہیں یہ وہی ناگن ہو کوئی اور سانپ بھی تو ہو سکتا ہے۔ تمہارے دماغ پر ناگن کا بھوت سوار ہے اور کچھ نہیں۔ راستے بھر وہ اسے سمجھاتا رہا تھا۔

جب گاؤں جا کر گاڑی رکی تو ہر کسی کو پریشانی میں مبتلا پایا۔ مایوس کن اور اجڑے چہرے دکھائی دیئے۔ لوگوں کی حالت دیکھ کر جاگیردار وہاب سمجھ گیا ضرور کچھ گڑبڑ ہے ضرور کوئی واقعہ ہوا ہے؟

”کیا ہوا ہے تم لوگوں کو کیوں ڈراؤنی شکلوں کے ساتھ چپ چاپ خاموش خاموش کھڑے ہو؟“

”جاگیردار صاحب وہ بڑے جاگیردار۔“

اتنا سننا تھا کہ جاگیردار وہاب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ تیز تیز چلتے ہوئے حویلی پہنچا وہاں لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ نمبردار نواد اور جواد کو خوف زدہ چہروں کے ساتھ پایا تو لوگوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے تینوں آگے بڑھتے گئے۔ قریب پہنچ کر جب بڑے بھائی کی لاش کو خون میں لت پت، نکلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ، پھٹے سر کے ساتھ دیکھا تو وہ چیخ اٹھا۔

”کس نے مارا ہے میرے بھائی کو؟ کس نے خون میں بھگویا ہے؟ کس نے نکالی ہیں اس کی آنکھیں؟“

وہاب صاحب ناگن نے کیا ہے یہ سب کچھ۔ کل رات سے مرا پڑا ہے۔ کل رات ناگن اس حویلی میں آنکھی اور بری طرح نوچا ہے اسے۔ نمبردار نے چند لمحوں میں تمام کہانی سے آگاہ کر دیا۔

دیکھ لیا انسپٹر آپ نہیں مانتے تھے میری باتوں کو اب خود دیکھ لیں۔ شہر میں ہونے والے قتل اور یہ قتل ایک جیسا ہے۔ وہ شہزادیاں نہیں ہیں ان کے پیچھے بھیا تک روپ ہے۔ قاتل ہیں انسانوں کی۔

اکبر جان خون میں لت پت حیات کی لاش کو بغور دیکھنے کے بعد تمام کہانی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اکبر جان اکیلی ناگن نہیں تین قاتل ہیں۔ ایک زاہد ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والا کی کمین نجانے اس خبیث نے اپنی آنکھوں میں کیسے ایسی تیزابیت پیدا کر لی ہے کہ جسے دیکھتا

لیکن زاہد کو اب صرف یہ تسلی والی باتیں لگیں۔ اس کے دماغ میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ گئی کہ کوئل اسے کبھی دوبارہ نہیں ملے گی، کبھی نہیں مسکرائے گی کیونکہ اب وہ زندہ نہیں ہے۔ اس نے پیار میں قربانی دے ڈالی ہے۔

ادھر کوئل کنویں میں گرمی بل میں کھسی اپنی محبوب کی یادوں میں گم تھی کہ اس کا محبوب اس کی طرح جدائیوں سے نڈھال ہو گا، غزدہ ہو گا اسے تلاش کرتا پھرتا ہو گا، شہر کا کونا کونا چھان مارا ہو گا۔ جب مجھے دیکھے گا تو اس کا چہرہ کھل اٹھے گا، لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے کہے گا کہ کوئل کہاں چلی گئی تھی مجھے چھوڑ کر۔ کیوں اتنی لمبی جدائی دے گئی تھی؟ کیوں تڑپنے کے لئے چھوڑ گئی تھی؟ یہ خیال آتے ہی وہ خود بھی رو پڑی؟ خود بھی تڑپ کر رہ گئی؟ بار بار کنویں کے اوپر کنارے کو دیکھتی کہ اس کا محبوب آئے اور اسے نکال کر لے جائے لیکن کئی دن گزر گئے کوئی بھی اس کنویں کے پاس نہ آیا۔ کوئی بھی اسے نکالنے نہ آیا۔ کوئی بھی اسے لینے نہ آیا۔ ہر روز کرن کا اور اپنے محبوب کا انتظار کرتی رہتی خود بھی کوشش کرتی کہ اس گہرے کنویں سے باہر نکل آئے لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ بے بسی سے آنکھیں اوپر کنارے پر لگائے بیٹھی رہتی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری رہتیں۔ محبوب کی جدائی میں آدھی رہ گئی تھی۔ جدائی کا ایک ایک لمحہ برسوں برابر دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ اذیت بنا ہوا تھا۔ یہ کنواں اس کیلئے موت کا کنواں تھا۔ جدائیوں کا کنواں تھا۔ اگر وہ یہاں نہ گرتی تو ہو سکتا تھا کہ اپنے محبوب کی بانہوں میں ہوتی، اس کے پہلو میں ہوتی، اس کی حسین نظروں کے سامنے ہوتی۔ اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنتی لیکن وہ تو خود بے بس تھی۔ باہر نکلنے کا راستہ نہ تھا۔ آنکھوں سے اپنے محبوب کو پکارتی میری جان کہاں گم ہو گئے ہو؟ کیوں میرے پاس نہیں آتے ہو؟ کیوں میری خبر نہیں لیتے ہو؟ کیوں مجھے اس مصیبت سے نکالتے نہیں ہو؟ دیکھو تمہاری یہ کوئل کتنی بے بس ہے؟ کتنی مجبور ہے؟ تمہیں ملنے کو ترس رہی ہے؟ کہاں کھو گئے ہو تم؟ آ جاؤ میری جان آ جاؤ۔ اپنی کوئل کے نازک دل سے نہ کھیلاؤ اسے نہ تڑپاؤ اسے جدائی کی موت نہ مارو۔ تمہارے بچنے کے لئے اسے آدھا کر دیا ہے۔ چہرے کی رونق چھین لی ہے۔ محبوب کو آوازیں دیتی اور روتی رہی۔

کئی دن اسے کنویں میں گرے گزر گئے۔ ایک دن اس نے کنویں کے اوپر دیکھا تو گردن لٹکاتے ایک سانپ دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی کوئل کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اسے پکارا۔ آواز دی باہر نکالنے کو کہا۔ لحوں میں ہی ناگ کنویں کے کنارے جمع ہونے لگے۔ ایک دوسرے سے گرہ باندھنے لگے، نیچے کنویں میں اترنے لگے، کوئل تک پہنچنے لگے۔ لحوں میں ہی

دور اپنے شہزادے کو لئے چھپی بیٹھی تھی؟
کرن کوئل آج پھر نہیں ملی۔ زاہد نے ایک خوبصورت کمرے میں بیٹھے ہوئے کرن سے کہا۔

جان ہر بل ہر لمحہ اسے تلاش کرتی رہی ہوں لیکن وہ نجانے کہاں چلی گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ انہوں نے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ خون میں نہلا دیا ہے۔ زمین میں دبا دیا ہے۔ موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور زاہد نے یکدم کرن کے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

”نہیں کرن وہ مرنے نہیں سکتی۔ میرا دل کہتا ہے وہ زندہ ہے۔ نجانے کہاں پھنسی ہوئی ہے؟ کہاں تڑپ رہی ہے؟ رات ہوتی ہے ناں مجھے ساتھ لے کر چلنا اسے تلاش کرتے ہیں۔ کرن جانتی ہو اس نے میرے لئے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی۔“

”ہاں زاہد جان سب جانتی ہوں اس کی کمی شدت سے محسوس کر رہی ہوں۔ پلگی کہتی تھی ہم تینوں ایک ساتھ رہیں گے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ ایک دوسرے کی نظروں کے سامنے رہیں گے۔ نہیں گے مسکرائیں گے لیکن اب خود ہی ساتھ چھوڑ گئی ہے۔“

زاہد نے بیٹگی ہوئی پلگوں کے ساتھ کھوئے ہوئے خیالات میں کہا تو کرن بھی رو دی۔ چیچی، جنات کو جمع کیا اور کہا جاؤ اسے ڈھونڈ کر لاؤ جہاں کہیں چھپی بیٹھی ہے نکال کر لاؤ۔ شہنشاہ کہاں جائیں ہر طرف سے ہماری مخلوق گھیرے میں ہے جو بھی گاؤں کا رخ کرتا ہے جکڑا جاتا ہے، جل مرتا ہے، دھوئیں میں بکھر جاتا ہے۔

یہ سنتے ہی کرن اور زاہد دونوں گھبرا گئے۔ ضرور جاگیر دار نے عالموں کو بلایا ہو گا اور لگتا ہے انہوں نے کوئل کو ختم کر دیا ہو گا۔ اب ہمیں مارنا چاہتے ہیں، ہمیں جانا چاہتے ہیں۔ کرن مجھے اپنی موت کا دکھ نہیں ہے۔ کوئل کے مرنے کا دکھ ہے۔ نجانے خالوں نے کتنی بے دردی سے اسے مارا ہو گا؟ کتنی اذیت ناک سزا دی ہو گی؟ کہتے تھے ہم نے سب کے جسم کا ایک ایک حصہ کاٹا ہے۔ قیہ بنا کر گاؤں والوں میں بانٹا ہے۔ لگتا ہے ان خالوں نے کوئل کے جسم کو بھی ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہو گا۔ گاؤں والوں میں تقسیم کر دیا ہو گا۔ کرن تم سچ کہتی ہو۔ اتنا کہتے ہی زاہد رو دیا، تڑپ کر رہ گیا۔

جان آپ فکر مند نہ ہوں وہ اگر زندہ ہوئی تو ضرور ملے گی، ضرور ہم لوگوں میں آئے گی، ہنسے گی، مسکرائے گی، آپ دل چھوٹا نہ کریں۔

کول اپنے ساتھی ناگوں کی مدد سے گہرے کنویں سے نکل کر کھلی فضا میں آ گئی۔ قید سے نکل کر آزاد ماحول میں آ گئی۔ سبھی کا شکریہ ادا کیا اور ریختے ہوئے اس طرف بڑھنے لگی جہاں جاگیردار حیات کی آنکھیں گری تھیں۔ انہیں ویرانوں میں جھاڑیوں میں اسے ایک جگہ پڑی ہوئی دونوں آنکھیں مل گئیں۔ اسی جگہ اس نے ان آنکھوں کو زمین میں دبا دیا کیونکہ جاگیردار وہاب اس کی نظروں میں کھٹکنے لگا تھا۔ اس رات اندھیرے میں اس کے ساتھ خستہ حال بابا مشکوک دکھائی دیا تھا کیونکہ ایسے ہی بابے نے ان تینوں کو باندھا تھا، جکڑا تھا اور وہ موت کے شکنجے میں بندھے تھے۔ کہیں ان لوگوں نے اس کے محبوب کو دوبارہ تو نہیں باندھ لیا تھا۔ کہیں اس کے محبوب کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے تو نہیں کر دیئے، کہیں انہیں جان سے تو نہیں مار دیا، کہیں ان کی جان تو نہیں لے لی لیکن اس کے محبوب کا گاؤں میں کیا کام وہ تو شہر میں ہے۔ کھنڈرات میں ہے۔

کھنڈرات کا خیال آتے ہی وہ شہر کی طرف ریختے لگی۔ بہت لمبا سفر تھا جو مسلسل طے کئے جا رہی تھی۔ شام ہونے سے قبل ہی وہ شہر سے باہر ایک جگہ ناگن سے حسینہ کا روپ اپنانے کے بعد شہر کی رونقوں میں گھس گئی۔ اسے وہاں سڑکوں پر چلتے پھرتے انسانوں سے کوئی غرض نہ تھی ان کی کوئی اہمیت نہ تھی وہ تو اپنے محبوب کے پاس جا رہی تھی۔ اس کو دیکھنے جا رہی تھی۔ چلتے چلتے ویران سنان کھنڈرات میں گھس گئی۔ جگہ جگہ اپنے محبوب کو تلاش کرنے لگی۔ لوگوں نے ایک حسینہ کو کھنڈرات میں گھستے دیکھ لیا تھا اور انہیں علم ہو چکا تھا وہ حسینہ ہے جس کی پولیس والوں کو تلاش تھی لہذا جلد ہی فونوں کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ عام آدمیوں نے کھنڈرات کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا کہ یہ حسینہ باہر نہ نکلنے پائے۔ پولیس کی گاڑیاں گھومنے لگیں۔ یہ منظر دیکھتے ہی کول ہر بات سمجھ گئی کہ اس کا محبوب اور کرن یہاں سے کیوں غائب ہیں؟ کیوں یہاں نظر نہیں آرہے۔ شاید ان لوگوں کے ڈر سے کرن اس کے محبوب کو لے گئی ہوگی۔ اس سے قبل کہ لوگ کول تک پہنچتے وہ ناگن کا روپ اپنائے وہیں غائب ہو گئی۔

کھنڈرات سے باہر پہرہ لگا دیا گیا کہ جو سانپ ناگ کھنڈرات سے باہر نکلتا دکھائی دے گولی چلا دی جائے۔ اسے ختم کر دیا جائے۔ ہر کسی کی نظریں سانپوں ناگوں پر تھیں لیکن کسی کو بھی رینگتا ہوا سانپ یا ناگ دکھائی نہ دیا۔ جب بوجھل آنکھوں میں نیند بھرنے لگی، جسموں میں کمزوری ظاہر ہونے لگی تو کھنڈرات کے کنارے چھپی بیٹھی ناگن چھلانگ لگا کر کھنڈرات سے باہر نکل گئی اور آس پاس ہی کہیں غائب ہو گئی اور ریختے ریختے شہر سے باہر تک آ پہنچی اور

واپس انہی راہوں پر چلتے لگی۔ راستہ کو کھلی نظروں سے دیکھ کر چلتے لگی۔ کنویں میں گرنے کا منظر اسے اچھی طرح یاد تھا۔ رات بھر چلتی رہی۔ جاگیردار کے گاؤں پہنچ گئی۔ وہاں گاؤں سے باہر کھڑی گاڑی دیکھ کر پہچان گئی کہ وہی گاڑی ہے جس میں اس کے محبوب کا دشمن سوار تھا، جس نے اس کا پیچھا کیا تھا، جس کے خوف سے وہ کنویں میں گری تھی۔ چپکے سے گاڑی پر چڑھ گئی اور شیئرنگ سیٹ کے نیچے بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں اپنے محبوب کی صورت گھومنے لگی۔ ان کے بارے میں سوچنے لگی کہاں جا سکتے ہیں وہ؟ اسے کیوں ساتھ لے کر نہیں گئے؟ اس کا انتظار کیوں نہیں کیا؟ لیکن ساتھ ہی دوسرا خیال آیا اچھا ہوا انہوں نے کھنڈرات کو چھوڑ دیا ورنہ گولیوں کا نشانہ بن جاتے۔ ان ظالموں کے ہاتھوں مر جاتے، گولیوں سے جسم چھلنی چھلنی ہو جاتے۔ کھنڈرات چھوڑ کر انہوں نے بہت اچھا کیا۔ نجانے وہاں سیٹ کے نیچے بیٹھی کیا کیا سوچتی رہی۔ دن نکل آیا، سورج ابھر آیا، روشنی پھیل گئی۔ چلتے پھرتے لوگ دکھائی دینے لگے پھر یکدم گاڑی کے قریب سے اسے جاگیردار وہاب کی آوازیں آئیں۔

اکبر جان اب حالات پر سکون ہیں۔ چڑیلوں سے جنات سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ نجانے وہ زاہد کا بچہ کہاں جا چھپا ہے؟ ڈر تا ہے مرنے سے۔ یہ سائیں بابا اب ہمارا پکا مہمان ہے اس وقت تک گاؤں میں رہے گا جب تک وہ شہزادی چڑیل اور کجنت زاہد قابو نہیں آ جاتے۔ ناگن تو مر مٹی ہوگی۔ شہر والوں نے اسے مار دیا ہوگا۔ اتنے میں اکبر جان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی وائرلیس چیٹی۔ تمام باتیں سننے کے بعد وائرلیس بند کی اور بولا جاگیردار ناگن مری نہیں ہے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ کھنڈرات میں گھسی ہوئی ہے۔ میں نے کھنڈرات میں آگ لگانے کو کہہ دیا ہے۔ جل مرے گی وہ بھی۔ تم لوگ دریا کنارے پہنچو میں شام تک آ جاؤں گا۔ اس ناگن کا مردہ جسم ساتھ لے آؤں گا۔ گاڑی چلتے لگی۔

بابا جی مجھے پورا یقین ہے کہ وہ چڑیل وہیں چھپی ہوگی کیونکہ وہی ان کا اصل مقام ہے۔ وہیں انہیں کٹی بار دیکھا گیا ہے۔ دریا کے بچ بہت بڑا جزیرہ ہے بس آپ نے اس چڑیل کو جکڑنا ہے اور یقیناً وہ آپ کے قابو میں آ جائے گی۔

یہ باتیں سنتے ہی کول جان تو گئی تھی کہ گاڑی دریا کنارے جا رہی ہے لیکن کرن کو قابو کرنے والی باتیں اس کے دماغ کو ہلانے لگی تھیں۔ ایک خیال آیا کہ ابھی وہ بابا سائیں کو ڈس لے تاکہ وہ کرن کو جکڑ نہ سکے لیکن اپنی جگہ چھوڑتی ہے بابا سائیں کے قریب ہوتی ہے تو ان لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے اور کرن کے ساتھ ساتھ ان کی گرفت میں آ جائے گی۔ محبوب سے

ملنے کی خوشی بھی دل میں تھی اور کرن کے جکڑنے کا خوف بھی تھا۔

گاڑی مسلسل آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پچھلی سیٹوں پر ملازم بندوقیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ فرنٹ پر سائیں بابا تھا جو اپنی زندگی کے واقعات سنائے جا رہا تھا۔ اپنے علم کی داستانیں سنائے جا رہا تھا لیکن کوئل سوچوں میں گم تھی۔ کرن کی موت نظروں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ اگر سٹیرنگ سیٹ پر سائیں بابا بیٹھا ہوتا تو وہ کب کا اسے ڈس چکی ہوتی۔ اس کی اپنی زندگی کو بھی خطرہ تھا۔ گاڑی تیزی سے دریا کنارے پہنچنے کے لئے بڑھ رہی تھی اور پھر یکدم گاڑی کے بریک چینی ملازم نیچے اترے اور دریا کنارے کھڑے ہو کر جزیرے میں زاہد اور کرن کو دیکھنے لگے۔

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بابا سائیں کی زبان ہلنے لگی چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔ کئی ڈراؤنی صورتیں سامنے آئیں اور جل کر راکھ ہو گئیں لیکن اصل مقصد کرن کو جکڑنا تھا۔ جنات کی سردار کو جکڑنا تھا۔

قریب بیٹھے جاگیردار صاحب نے آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”بابا تمہارا مقرر خوب کام دکھا رہا ہے۔ دل خوش ہو رہا ہے جنات کو جلتے دیکھ کر آنکھوں میں خوشی کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔“ لیکن بابا اس شہزادی کو جکڑو اس چڑیل کو جکڑو جو زائدہ کی کمین کو اٹھائے پھرتی ہے۔ اس کے جسم کو جلاؤ اس کو میری نظروں کے سامنے آگ لگاؤ تاکہ وہ سمجھ جائے کہ جاگیرداروں سے ٹکر لینے کا کتنا بھیانک نتیجہ ملتا ہے۔ ہم اسے تانا چاہتے ہیں کہ ہم کتنے رعب اور دبدبے والے ہیں عام انسان نہیں ہیں۔ بابا اس چڑیل کو قابو کرو۔“

باتیں کرتا کرتا جاگیردار وہاب گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ اس کے نیچے اترنے کی دیر تھی کہ کوئل پھری شیرنی کی طرح سٹیرنگ سیٹ سے نکل کر بابا سائیں پر چھٹی اور اس کی ٹانگ پر اپنے زہریلے دانت چھو دیے۔ بابا سائیں تڑپنے لگا، چیخنے لگا، دریا کنارے کھڑے ملازم بابا سائیں کی چیخنے کی آوازیں سنتے ہی گاڑی کی طرف بھاگے تو کوئل اپنا تمام زہر اس کے جسم میں پھیلانے کے بعد چھلانگ لگا کر قریبی جھاڑیوں میں جا گھسی۔ گاڑی سے چھلانگ لگاتے ناگن کو کبھی نے دیکھ لیا۔ فائر بھی کھول دیئے لیکن جھاڑیوں میں نجانے کہاں جا چھپی تھی۔ کئی سانپ سامنے آئے اور گولیوں کا نشانہ بنتے گئے۔ انہیں اپنی جان کا بھی خطرہ تھا۔ کسی وقت بھی سانپوں کی فوج انہیں اپنی لپیٹ میں لے سکتی تھی۔ ڈس سکتی تھی ختم کر سکتی تھی۔ جاگیردار وہاب سمیت کبھی گاڑی میں سوار تھے۔ یہ خیال آتے ہی انہوں نے گاڑی بھگا دی۔

سائیں بابا کے منہ سے زہریلی جھاگ بہنے لگی۔ آنکھیں پتھر اگی تھیں۔ کوئل کو جب پوری تسلی ہو گئی کہ وہ لوگ جا چکے ہیں تو تیزی سے رنگتی ہوئی دریا کی اچھلتی موجوں میں جا گھسی اور تیرتے ہوئے جزیرے تک گئی۔ اگر وہ سائیں بابا کو نہ ڈستی اپنا زہر نہ اٹھاتی تو اس نے کرن کو جکڑ لینا تھا اور دوسرے جنات کے ساتھ اسے بھی آگ میں جلا دینا تھا، دھوئیں میں اڑا دینا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے بابا سائیں کیسے اسے جلا سکتا تھا؟ کیسے دھوئیں میں بکھیر سکتا تھا؟ اس کے جکڑے جانے کا منظر وہ ایک مرتبہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔

گہری کھائی کا منظر اسے یاد تھا بے ہوشی کی حالت میں خاردار جھاڑیوں میں بندھی ہوئی کرن کا منظر نظروں کے سامنے تھا۔ جزیرے پہنچتے ہی کوئل نے اپنا روپ بدلا اور اپنے رانچھن کو اپنے محبوب کو اپنی جان کو پکارنے لگی، آوازیں دینے لگی لیکن کسی طرف سے بھی اسے اس کا محبوب دکھائی نہ دیا۔ دیوانوں کی طرح جزیرے میں بھاگنے لگی۔ جگہ جگہ اسے تلاش کرنے لگی۔ لمبی جدائی کی تڑپ نے اس کے دل کو چھلنی کر دیا تھا۔ محبوب کے حسین چہرے کو دیکھنے کو تڑپ گئی تھی۔ کتنا بھاگی تھی وہ اپنے محبوب کے پیچھے۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ یہی حال اب بھی تھا نہ جھاڑیاں دیکھ رہی تھی نہ پاؤں میں چھینے والے کانٹوں کی درد محسوس کر رہی تھی صرف پکارے جا رہی تھی۔ ادھر ادھر بھاگے جا رہی تھی۔ پورا جزیرہ چھان مارا لیکن اپنے محبوب کو نہ ڈھونڈ پائی۔ آنکھوں میں آنسو لئے ایک جگہ تھک کر بیٹھ گئی اور بیٹھے بیٹھے چیخی آ جاؤ میری جان کہاں کھو گئے ہو؟ کیوں اپنی کوئل کو تڑپا رہے ہو؟ کیوں جدائیوں کے زخموں سے چھلنی کر رہے ہو؟ کیوں پیاسی نظروں سے اوجھل ہو؟ کیوں میرے تڑپنے کا تماشا دیکھ رہے ہو؟ کیوں میری بے بسی دیکھ کر بھی قریب نہیں آ رہے ہو؟ دیکھو جان تمہاری جدائی میں تمہاری یہ کوئل آدھی رہ گئی۔ تمہاری تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے پاؤں میں چھالے ڈال لئے ہیں۔ تمہیں دیکھنے کے لئے دیدار کے لئے تڑپ رہی ہے۔ مر رہی ہے۔ جان کیوں تجھے میری پرواہ نہیں ہے؟ کیوں مجھے بھلائے بیٹھے ہو؟ کیوں میرے پاس نہیں آتے ہو؟ لیکن اسے کسی بھی بات کا جواب نہ ملا۔ کسی بھی سوال کا جواب نہ ملا۔ رو کر رہ گئی، آنسو بہا کر رہ گئی۔ اب جدائی اس کی سوچ سے باہر ہو گئی تھی۔ وہ تو جاگیردار حیات کا خاتمہ کرنے گھر سے نکلی تھی اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا یہ اقدام اسے رسوا کر دے گا۔ جدائیوں کی دنیا میں لے جائے گا تڑپنے کے لئے چھوڑ دے گا۔

زاہد جان صرف ایک بار اپنی صورت دکھا جاؤ صرف ایک بار۔ تاکہ دل کو تسلی ہو سکے سکون چھین آ سکے لیکن وہاں کوئی ہوتا تو اسے جواب ملتا۔ اب وہ کہاں جاتی؟ کہاں اسے تلاش

یہاں آئے ہیں؟ کہیں کوئی راستہ تو بھول کر یہاں نہیں آیا ہے۔ کیا کسی کو انواء کر کے تو یہاں نہیں لایا گیا؟ ابھی انہی سوچوں میں گم تھی کہ اسے دور سے قہقہوں کی آوازیں سنائی دی۔ ویرانے میں، سناٹے میں، فضا میں گونجنے والے ان قہقہوں کی آوازیں کوئل نے پہچان لیں۔ یہ اس کے محبوب کے قہقہے تھے۔ کرن کے قہقہے تھے۔ خوشی سے پھولے نہ سار ہی تھی۔ ایک دل چاہا کہ سیٹ کے نیچے سے نکل کر شہزادی بنے سیٹ پر بیٹھ جائے اور اس کا محبوب اسے دیکھتے ہی چونک جائے۔ کئی لمحات تک اپنی گہری اور خوبصورت آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھے اور کہے کہ کوئل تم کہاں غائب ہو گئی تھیں؟ کہاں کھو گئی تھیں؟ تجھے تلاش کرتے کرتے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں اور وہ اپنے محبوب کے منہ سے میٹھی میٹھی باتیں سن کر مسکرائے جائے۔ اپنے غموں، دکھوں، تکلیفوں کو بھول جائے۔ کتنی بڑی خوشی کا مقام تھا کوئل کے لئے۔ خود کو کوئل کی کہ اگر تو جزیرے میں بیٹھی رہتی تو کیسے اپنے محبوب کو پا سکتی تھی؟ کیسے اس کی میٹھی میٹھی باتیں سن سکتی تھی؟ کیسے اس کی مسکراہٹ سن سکتی تھی؟ اچھا ہوا تو جزیرے سے نکل کر یہاں تک آگئی ہے۔ تو بڑے نصیبوں والی ہے جسے تلاش کیا ڈھونڈ لیا۔ جسے چاہا پایا ہے۔ جس کے خواب دیکھے تو اس کی بانہوں میں چلی آئی ہے۔ کتنی قسمت والی ہے تو۔ قہقہوں کی آوازیں سننے ہی کوئل خوشی سے حسین یادوں میں کھوئی ہوئی تھی پھر خیال آیا۔

کوئل تو ابھی یہاں ہی چھپی رہ۔ ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنتی رہ پھر یکدم سامنے آ جانا اور اپنا آپ دکھا کر اسے دیوانہ بنا لینا۔ کوئل کی تمام توجہ گونجنے والے قہقہوں پر تھی جو مسلسل گاڑی کے قریب آتے جا رہے تھے۔ آتے ہی دونوں گاڑی میں بیٹھے۔ کرن نے سیزنگ پکڑا اور گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

کرن سوچ رہا ہوں اگر تم میری زندگی میں نہ آتی تو ہو سکتا تھا کہ میں تنہا کا تنہا رہتا۔ تم نے تو اپنا حسن دکھا کر مجھے اپنا دیوانہ بنا لیا ہے۔ جکڑ لیا ہے مجھے۔ زمانے بھر کا ہوش بھلا دیا ہے۔ زاہد کی زبان سے یہ الفاظ سن کر کرن قہقہے لگانے لگی۔

”سچ کہتے ہو جان میرا بھی یہی حال ہے۔“ جب گرد بابا کے پاس پہلے دن آئے تھے اسی دن میں آپ پر عاشق ہو گئی تھی، مرثی تھی۔ تم پر ایک سارے کی مانند ساتھ رہتی تھی۔ تم ہماری مخلوق کو جکڑنے کا ورد کرتے رہے اور میں آپ کا ساتھ دیتی رہی۔ میں تو خود چاہتی تھی کہ آپ کے قبضہ میں آ جاؤں اور آپ کی داسی بن کر زندگی بسر کروں لیکن جب آپ نے گرد بابا کو قتل کر دیا تو ہم سب آزاد ہو گئے تھے۔ لیکن اس نے آپ کو جکڑ لیا انسان سے مجسمہ بنا

کرتی؟ کہاں ڈھونڈتی؟ مرجھائی ہوئی، رنوں سے مڑھا، تھکی ہوئی، پہلی رنگت کے ساتھ درخت کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی روتی رہی۔ کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ محبوب کی تلاش میں کس سمت جائے۔ نجانے کرن لے کر اسے کہاں چلی گئی تھی۔ کس دنیا میں آباد ہو گئی تھی؟ بار بار ان جگہوں کو دیکھتی جہاں بیٹھ کر وہ دونوں آپس میں بیٹھ کر پیار بھری باتیں کیا کرتے تھے۔ کبھی جدا نہ ہونے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اسے اپنے محبوب کی تمام باتیں یاد آنے لگیں کہ کوئل تم میری زندگی ہو۔ میری جان ہو۔ تمہارے بنا میں ادھر وہ ہوں، تنہا ہوں، نامکمل ہوں لیکن آج یہ تمام باتیں اسے آنسوؤں میں بھگو رہی تھیں۔

یکدم اسے خیال آیا کہ کوئل اگر تو یہاں بیٹھی رہی تو کیسے اپنے پیار کو پاس کوگی۔ چل اٹھ تلاش کرا سے، ڈھونڈ اسے۔ ہو سکتا ہے وہ بھی تیری راہیں دیکھ رہا ہو۔ تیری طرح وہ بھی اندر سے ٹوٹا ہوا ہو اور تیری تلاش میں راہوں میں بھٹکتا پھر رہا ہو۔ چل اٹھ کوئل تو جانتی نہیں ہر سو تیرے محبوب کے دشمن پھیلے ہوئے ہیں تجھے تلاش کرتے ہوئے وہ کسی کی گولی کا نشانہ نہ بن جائے۔ خون میں لت پت ترپتا نہ رہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ اپنی تھکاوٹ بھول گئی۔ پاؤں کے چھالوں کو بھول گئی۔ تیزی سے بھاگتے ہوئے دریا میں کود پڑی اور تیرے ہوئے دوسرے کنارے آ گئی۔ یہاں سے ناگن کا روپ اپنانے کے بعد ویرانوں میں ریگنے لگی۔ محبوب کو تلاش کرنے لگی۔ نجانے محبوب کی تلاش میں کہاں کہاں بھٹکتی رہی۔ رات ہو گئی، اندھیرا پھیل گیا لیکن وہ چلتی رہی، محبوب کو تلاش کرتی رہی۔ آخر ایک جگہ تھک ہار کر آنکھوں میں آنسو لئے بیٹھ گئی۔ کچھ دور اسے ایک جگہ سے گاڑی کی جلتی لائیں دکھائی دیں۔ ویرانے میں کھڑی گاڑی دیکھ کر اس کے دل میں دشمنوں کا خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ گاڑی دشمنوں کی ہو جو اس کے محبوب کو پکڑنے کی غرض سے یہاں آئے ہوں۔ اسے مارنے کیلئے، ختم کرنے کیلئے، جسم کا قیہ بنانے کیلئے یہاں آئے ہوں۔ یہ خیال آتے ہی بھاگتے ہوئے ریگتے ہوئے گاڑی کے قریب آئی۔ گاڑی بالکل خالی تھی کوئی آدمی اس میں بیٹھا دکھائی نہ دیا۔ کوئل ہو سکتا ہے کہ تیرے محبوب کے دشمن ادھر ادھر چھپے بیٹھے ہوں اور اس تاک میں ہوں کہ وہ آئے اور گولیوں سے اسے چھلنی کر دیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ چاروں طرف دیکھتی ہوئی چپکے سے گاڑی میں گھس گئی اور پچھلی سیٹ کے نیچے چھپ کر بیٹھ گئی کہ اگر اس کے محبوب کو انہوں نے گولیوں سے چھلنی کیا تو وہ بھی انتقامی آگ میں بھڑک اٹھے گی اور ڈس لے گی سبھی کو۔ کافی لمحات ایسے ہی بیت گئے۔ یہ عالی شان قسم کی نیو گاڑی حویلی والوں کی لگتی بھی نہ تھی اور تھا بھی ایسا ہی۔ یہ کون لوگ ہیں جو

ڈھونڈتے ڈھونڈتے اپنے محبوب کو تلاش کرتے کرتے پاؤں پر زخم لئے لڑکھڑانے کے سے انداز میں گاڑی سے نیچے گری اور سوچنے لگی کہ کیا کرے؟ بھاگ جائے یا مر جائے۔ خود کو ختم کر لے یا زندہ رہے۔ اس زندگی سے موت بہتر تھی جس کے لئے وہ ناگن سے انسان بنی تھی جس کی محبت پانے کی غرض سے نازنخے دکھاتی تھی، مسکراتی ہنستی تھی، نیلی آنکھوں سے دلفریب نظروں سے پیار بھرے انداز میں دیکھتی تھی۔ جب وہ ہی اس کا نہ رہا تو پھر زندہ رہنے کا کیا مقصد جیسے تو کس کے لئے۔ مر جانا منظور تھا۔ یہ سوچ آتے ہی بالکل سیدھی گاڑی کے دونوں ٹائروں کے سامنے لیٹ گئی کہ اس کا محبوب خود اسے کچلتے ہوئے روندتے ہوئے زندگی کا چراغ گل کرتے ہوئے امیدوں، خواہشوں، تمنائوں، محبتوں چاہتوں کا گلا دبائے ہوئے مسکراتی دنیا میں چلا جائے روشن دنیا میں چلا جائے۔ کرن تو بڑے نصیب والی ہے جسے چاہا یا لیا، جسے دل میں بسایا اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قریب کر لیا، تیرا میرا کیا مقابلہ۔ تو حسن کی دیوی ہے اور میں سیاہ ناگن۔ تیرے نصیب تیری طرح چمکدار ہیں اور میرے نصیب میری طرح سیاہ ہیں۔ تو حقیقت ہے میں سپنا ہوں، تو چاہت ہے میں بھول ہوں، تو اس کے دل کی رانی ہے اور میں خاردار کاٹنا۔ جا کر ن تھے تیرا محبوب مبارک ہو۔ ساتھ ہی رودی پھر دوسرے خیالوں نے اس کے دماغ کو جھنجھوڑا۔

کول تو تو بڑی خود غرض نکلی ہے اپنی محبت کو نہ پا کر مر رہی ہے۔ اگر تیرا محبوب تجھ سے محبت نہیں کرتا تو تو اس سے محبت کرتی ہے۔ تو تو اسے چاہتی ہے۔ چل اٹھ یہاں سے اپنے محبوب کے دشمنوں کو ختم کر۔ کہیں وہ تیرے محبوب کے خوبصورت جسم کو چھلنی نہ کر دیں۔ کہیں وہ تیرے محبوب کی پیاری سی خوبصورت سی صورت کو بگاڑ نہ دیں، کہیں وہ تیرے محبوب کے لبوں سے مسکراہٹ نہ چھین لیں، پچالے اپنے محبوب کو ڈس لے اس کے دشمنوں کو۔ اس خیال نے کول کی ہیکلی پلکوں پر چمک پیدا کر دی۔ گاڑی کے ٹائروں سے باہر نکلی اور قریبی جھاڑی میں گھس گئی کہ آخری مرتبہ اپنے محبوب کا دیدار کر لے آخری بار اسے دیکھ لے۔

ابھی وہاں بیٹھے اسے چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے اسے کرن اور زاہد دکھائی دیئے۔ دونوں کے لبوں پر مسکراہٹیں تھیں انہیں مسکراتا دیکھ کر یہ بھی چھکی سی مسکرائی اور کافی دیر تک دیدار محبوب سے معطر ہوتی رہی۔ وہ اس کی نظروں کے سامنے ہی گاڑی میں بیٹھے اور اسے جدائیوں کی دنیا میں پھینک کر دور بہت دور چلے گئے۔ سڑک پر آ کر کئی لمحات تک وہ چلتی گاڑی کو دیکھتی رہی تو محبوب کے وہ فقرے یاد آ گئے۔

دیا۔ آپ مجھے مجسمے کی صورت میں بھی اچھے لگے تھے۔ میں آپ کے بال سنوارا کرتی آپ کو سامنے پا کر خوشی سے ناچا کرتی۔ میں جانتی تھی کہ ایک دن آپ ضرور اصل حالت میں آئیں گے۔ ایک دن ضرور مجھے اپنا لیں گے۔

”ارے پگلی تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ زاہد جیسے اچھل ہی پڑا۔

”کیسے بتاتی درمیان میں کول آگئی تھی؟“

کول کا لفظ زبان پر آتے ہی کرن افسردہ ہونے لگی تو زاہد یکدم بولا۔ ”کرن اب کول کبھی ہمارے درمیان نہیں آئے گی وہ ایک خواب تھی ایک سپنا تھی اور جانتی ہو سپنے وجود میں نہیں ہوتے، آنکھ کھلتے ہی بکھر جاتے ہیں۔“

یہ سننا تھا کہ سیٹ کے نیچے بیٹھی کول تڑپی۔ ایسے جیسے اس پر آسمان گر پڑا ہو۔ زلزلہ کی مانند اس کا جسم لرزنے لگا۔ بار بار ضبط کے باوجود بھی اس کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ دل چاہا کہ چلتی گاڑی سے نیچے کود جائے۔ ختم کر لے خود کو۔

کرن میرے لئے تم ہی سب کچھ ہو۔ میری زندگی، میری محبت، میری چاہت، تم ہی تو ہو ایک پل تمہارے بنا نہیں رہ سکتا اور جو کوئی ہماری محبت کے درمیان آنے کی ہمت کرے گا جلا کر رکھ دوں گا اسے۔

زاہد کی باتوں کے نشتر مسلسل کول کے جگر کو زخمی کئے جا رہے تھے، چھلنی کئے جا رہے تھے۔ خون کے آنسوؤں سے خود کو بھگور رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا زاہد اس کا محبوب اتنا بدل سکتا ہے، لمحوں منٹوں میں اس سے نفرت کرنے لگے گا۔ بھلا دے گا اسے اپنی زندگی سے نکال دے گا، دل سے نکال دے گا، آنکھوں کے سامنے انا گوارا نہ کرے گا۔

کول سیٹ کے نیچے اپنی بے بسی پر اپنی قسمت پر آنسو بہائے جا رہی تھی۔ وہ دونوں قہقہے لگاتے جا رہے تھے۔ ویرانوں، فضاؤں کو معطر کئے جا رہے تھے اور یہ بیچاری جلی ہوئی مری ہوئی، زخمی دل لئے، ٹوٹے جسم کے ساتھ روئے جا رہی تھی۔ ان قہقہے لگانے والوں کو کیا خبر کہ ان کے منہ سے بلند ہونے والے یہ قہقہے کسی کے سینے کو چاک کر رہے ہیں، کسی کے ارامانوں پر شعلے برسائے جا رہے ہیں، کسی کی چاہت کو ریزہ ریزہ کر رہے ہیں، کسی کی امنگوں کو طوفانوں میں مٹائے جا رہے ہیں۔ وہ تو پیار بھری باتوں میں گن تھے۔ چلتے چلتے گاڑی ایک جگہ جا کر رکی دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نیچے اترے اور ایک خوبصورت عالی شان ہوٹل میں گھس گئے اور یہ کئی دنوں سے بھوکی پیاسی جدائی کی ماری، محبتوں کی ماری، چاہتوں کی ماری اپنے پیار کو

میں اسے بتایا تھا کہ کوئل بھاگ جایہ لوگ تجھے پکڑنے کو بے چین ہیں۔ صبح کی روشنی پھوٹ گئی صبح صبح ہی گاؤں والوں کے چہروں پر خوف دکھائی دینے لگا۔ لمحوں میں خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ وفادار کا کتا سر حویلی کے باہر پڑا ہے۔ نمبردار جواد کی لاش لان میں پڑی ہے۔ بھائی کی لاش دیکھ کر اپنے وفادار کا کتا سر دیکھ کر نمبردار سکتے کی حالت میں کھڑا تھا۔ جاگیردار وہاں بھی وہاں آ گیا بالکل وہی حال نمبردار جواد کا ہوا تھا جو جاگیردار حیات کا ہوا تھا۔ اسی طرح آنکھیں ٹپکتی ہوئی تھیں۔ چہرے کو مانتوں سے چھپا گیا تھا۔ یہ دیکھ کر جاگیردار وہاں گر جا کہ دشمن اسی گاؤں میں چھپا بیٹھا ہے۔ دشمن نہیں آگ کہو آگ۔

نمبردار جینا دشمن معمولی لوگ ہوتے ہیں مارے جاتے ہیں یہ طوفان ہے آگ ہے۔ جب چاہتی ہے تباہی مچاتی ہے جسے چاہتی ہے جلا کر چلی جاتی ہے۔ سنوان کے جسم کے ٹکڑوں کو دفنانا نہیں ہے اور بڑے بھائی جواد صاحب کی میت کو قبر میں نہیں رکھنا ہے کیونکہ ابھی ان تینوں کے ٹکڑے کرنے ہیں۔ جب تک میں ان تینوں کے جسموں کو کاٹ کر اسی طرح ٹکڑے نہیں بنالیتا جین سے نہیں بیٹھوں گا۔ وہ ابھی ادھر کہیں ہے بھاگ نہیں سکتے۔ ویرانوں قبرستانوں میں کھڑی اونچی اونچی گھاس جھاڑیوں کو آگ لگا دو۔ جہاں بھی ہوئے سانسے آ جائیں گے۔ اب زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ان سے گن گن کر بدلے لینے ہیں۔ ایک ایک جلتے والے کا بدلہ ایک ایک جھلنے اور پھٹنے والے کا بدلہ لیتا ہے۔

لمحوں میں ہی ویرانوں قبرستانوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ جہاں بھی جھاڑیاں دکھائی دیتیں آگ لگا دی جاتی۔ اب راتوں کو کوئی نہیں سوئے گا کیونکہ وہ ہم تک پہنچیں گے۔ ہمارے سروں کو بھی کاٹیں گے لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب اس کمی کمین کے جسم کے ٹکڑوں کو آگ لگانے کا جلانے کا وقت آ گیا ہے۔ زندہ جلانا ہیں انہیں۔

نمبردار جواد گرجے جا رہا تھا چیخے جا رہا تھا۔ تلاش شروع تھی دن گزر رہا کوئل ہر بات جان گئی تھی۔ سب کچھ سن لیا تھا۔ اس لئے اندھیرا پھیلنے ہی وہ بل سے نکلے اور رینگتی ہوئی دور سے دور چلی گئی۔

وہ جانتی تھی کہ اب اس کی زندگی محفوظ نہیں ہے۔ اسے اپنی زندگی کی فکر نہ تھی بلکہ اپنے محبوب کی زندگی کی فکر تھی۔ نجانے کیوں اتنے صدے اٹھانے کے بعد بھی محبوب کا چہرہ آنکھوں میں سجائے ہوئے تھی۔ اس کا پیار دل میں بسائے ہوئے تھی اور شاید اسی انتظار میں تھی کہ اس کا محبوب اسے ایک دن ضرور اپنا لے گا۔ حالانکہ اس کا دل محبوب کی باتوں سے جھلنی

”کرن کوئل ایک سپنا تھی جو بکھر گئی۔“ اسی الفاظ نے اس کی دوبارہ آنکھیں بھر دیں اور وہ ویرانوں میں رینگتی رہی۔ آوازیں اس کے کانوں سے نکراتی رہیں کوئل تو ایک سپنا ہے جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا تو ایک سپنا ہے جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ آوازیں اس کا دل چیرتی رہیں۔ دل پر تیر برساتی رہیں۔ زخمی کرتی رہیں اور وہ بھیگی آنکھوں سے روتے ہوئے تیز تیز رینگتی رہی۔ وحشی ہو گئی ہزاروں نکھرے ارمان دل میں لئے بھاگتی رہی اور نمبردار کے گاؤں جا پہنچی۔ وہاں پہنچتے ہی چھلانگ لگا کر حویلی میں گھس گئی۔ ایک کمرے میں لینے ہوئے نمبردار کے ملازم کو دیکھ کر وہ خون خوار ہو گئی۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انتہائی آگ میں جلتے لگی۔ اندر گھسی انسانی روپ بدلا اور کچھ نہ دیکھا قریب پڑی کلباڑی پکڑ کر سیدھی گردن میں دے ماری۔ ایک ہی وار میں سر کٹ کر جدا ہو گیا۔ وحشیوں کی طرح تڑپتے جسم پر کلباڑیاں چلانے لگی۔ ایک انسان کے جسم کا قیمہ بنانے لگی۔ پورے جسم کے ٹکڑوں کو اندر کمرے میں نکھیر دیا اور پھر کلباڑی ایک طرف پھینک کر آنکھوں میں آنسو لئے بیٹھ گئی۔ آج اسے اپنے مرنے کا کوئی ڈر نہ تھا۔ آج وہ بھاگنا نہیں چاہتی تھی۔ آج وہ حویلی والوں سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔ سرخ زمین پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کتا ہوا سر اٹھایا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ اگر وہ گردن نہ کاٹتی، سر کو تن سے جدا نہ کرتی تو جس بے دردی سے اس کے جسم پر کلباڑیاں چلا رہی تھی ہوسکتا تھا چیخوں سے پورا گاؤں حویلی میں جمع ہو جاتا۔ ابھی وہ باہر نکلی ہی تھی کہ جواد کو لان میں ٹپکتے دیکھا تو اس پر جھپٹ پڑی اپنے زہریلے دانت اس کی گردن پر رکھ دیئے وہ بھی تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ وہ وحشی بن چکی تھی بول نمبردار بڑی اکڑی گردن تھی تا تیری۔ بہت چیخا تھا نا۔ ٹکڑے کرنا چاہتا تھا میرے محبوب کے۔ اب بول بتا تیرے جسم کے کتنے ٹکڑے کروں۔ بول جواب دے کیوں چپ ہے۔ کیوں نہیں بولتا؟ کیوں جواب نہیں دیتا؟ مجھ سے ڈرتا ہے ناں۔ مجھ سے خوفزدہ ہے ناں۔ ساتھ ہی چہرے کو نوچنے لگی اور دونوں آنکھیں نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیں۔ نجانے کیا ہو گیا تھا اسے۔ کبھی روتی، کبھی قہقہے لگاتی، شاید اس لئے کہ جتنے ٹکڑے اس نے وفادار کے جسم کے کئے تھے اس سے کہیں زیادہ اس کے اپنے دل کے ٹکڑے ہوئے تھے۔ محبوب کی جدائی نے مار دیا تھا۔ اسے محبوب کی بے پرواہی نے پاگل بنا دیا تھا۔ اسے اس کی باتوں نے محبوب سے ناگن بنا دیا تھا۔ نہیں نمبردار تو نہیں بولے گا۔ تیرے روپ میں کوئی اور بولے گا۔ یہ کہتے ہوئے وہ حویلی سے نکل کر آنکھیں پکڑے بھاگنے لگی۔ پاگلوں کی طرح، دیوانوں کی طرح رات کی تاریکی میں سیاہ اندھیرے میں اسی بل میں جا چھپی جہاں امام دین اور خیر دین نے باتوں

چھلنی ہو چکا تھا۔ خود کو تنہا اور اکیلا سمجھ رہی تھی۔ بدنصیب کہہ رہی تھی لیکن یہ عشق تو پاگل ہوتا ہے۔ دل پر لگنے والی چوٹوں کو بھی اس خیال میں بھول جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے دوبارہ جوڑنے کے لئے آئے گا۔ یہی حال کوئل کا تھا گاڑیاں گھوم رہی تھیں، گھوڑے بھاگ رہے تھے۔ گاؤں والے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور یہ ریگتے ریگتے بہت دور نکل جانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے ریگتے سے پیدا ہونے والی سرسراہٹ سے گولیاں چلنے لگیں۔ گاڑی کا رخ اس کے پیچھے تھا۔ گاڑی اسے کچل دینا چاہتی تھی، ختم کر دینا چاہتی تھی۔ یہ خود کو بچانے کی غرض سے تیز تیز بھاگ رہی تھی اور تیز ریگتے ریگتے رات کے اندھیرے میں ایک جگہ جا چھپی۔ دور سے گاڑی کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ لوگ وہاں تک پہنچ سکتے تھے اس کو ختم کر سکتے تھے۔ جس طرح اس نے نمبردار کے وفادار کے ٹکڑے کیے تھے اسی طرح اس کے جسم کے بھی ٹکڑے ہو سکتے تھے۔ بلکہ اسی طرح اس کا سر بھی تن سے جدا ہو سکتا تھا۔ بلکہ اسی طرح اس کی آنکھیں نکالی جاسکتی تھیں۔ لیکن اب گولیوں سے چھلنی نہ ہو سکتی تھی۔ ان کے ہاتھوں ٹکڑے نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اب محفوظ جگہ پر تھی۔

جاگیردار صاحب اب تو ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ اگر دوبارہ قابو آگئی تو بچے گی نہیں۔ اس کے خون سے بھیکے کپڑے بتا رہے ہیں کہ وہی قاتل ہے لیکن کوئل قابو نہ آئی۔ سبھی لوگ دوبارہ گاؤں آگئے۔ سامنے وہی ٹکڑے پڑے تھے کتنا سر پڑا تھا، میت پڑی تھی۔ وہاب صاحب قتل اسی ناگن نے کیا ہے۔ اس کے کپڑوں پر جما ہوا خون بتاتا ہے کہ اس نے ہی میرے بھائی کو مارا ہے۔ اب کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ بھیا تیری قسم تیری موت کا بدلہ لوں گا میں خود بدلہ لوں گا پھر بھائی کی میت ہاتھ میں پکڑ لی بول بھیا تو کیوں نہیں بولتا بہت گرج تھی تیری آواز میں اب چپ کیوں ہے۔ بتا اس ناگن نے تجھے مارا ہے ناں۔ اسی ناگن نے وفادار کے جسم کے ٹکڑے کئے ہیں ناں۔ اس ناگن نے سر کاٹا ہے ناں۔ اس ناگن نے تیری آنکھیں نکالی ہیں ناں۔ اب کوئی نہیں بچے گا۔ ختم کر ڈالوں گا ایک ایک کو اسی طرح قہر کروں گا ان تینوں کا۔ ساتھ ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ بہت برداشت کر لیا ہے۔ حویلیوں کو خالی کر کے رکھ دیا ہے۔ اوجرام زادو نمبردار حویلی میں سب سے کھڑے نوکروں کی طرف متوجہ ہوا۔ جہاں جہاں سے علم والا ملے جہاں جہاں سے پسیرا ملے اٹھا لاؤ۔ آگ لگا دیں گے آجی مخلوق کو ٹکڑوں میں بانٹ دیں گے، سانپوں ناگوں اور ان تینوں کے سروں کو بھی اسی طرح کاٹیں گے، اس طرح ان کے جسموں کا قہر بنائیں گے۔ نوکر چاکر گاؤں سے باہر بھاگ نکلے اور جواد صاحب کا جنازہ اٹھا

لیا گیا اور جا کر قبرستان میں دفن کر دیا۔

گاؤں والوں پر سکتہ طاری تھا۔ حویلی میں گرجتی آوازیں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ نمبردار جواد کا ایک ملازم گھوڑے پر بیٹھا اور چل دیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا۔ ایک بہت بڑے علم والے کا پتہ معلوم ہوا تھا۔ شاید انہیں بزرگوں کے پاس جانا چاہتا تھا۔ جنہوں نے جکڑی ہوئی کرن کو آزاد کیا تھا کیونکہ اس کا رخ ادھر ہی تھا۔ ادھر کوئل اپنے محبوب کی سوچوں میں گم تھی محبوب کا زخمی چہرہ وہ رہ کر اسے دکھائی دے رہا تھا۔ انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تھی ابھی بہت ساروں کے سر کاٹنے تھے۔ بہت ساروں کے جسموں کو قہر بنانا تھا۔ بہت ساروں کی آنکھیں نکالنی تھی۔ جاگیرداروں، نمبرداروں کی گردن آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اسے تڑپا رہی تھیں اے کم بختو اپنی اپنی زندگی کے لمحوں کو انگلیوں پر گنتا شروع کر دو اور دعا کرو کہ یہ رات ختم نہ ہو کیونکہ رات ختم ہوگی تو تم نہ بچو گے۔ تمہارے جسموں کے ٹکڑے کو گاؤں کے ہر گھر میں بانٹا ہے۔ تمہاری آنکھوں کو جلانا ہے۔ ذہن میں گھومتے ہوئے یہ فقرے کوئل کو تڑپا رہے تھے اور اپنے محبوب کی بھی یاد آ رہی تھی کہ اس کا محبوب وہاں آئے گا اور کہے گا جان تم یہاں ہو، ہم نے دنیا کے کونے کونے میں تمہیں چھان مارا ہے۔ تم دکھائی کیوں نہیں دیں لیکن یہ اس کا وہم تھا خیال تھا کیونکہ وہاں اس کا محبوب کیسے آتا؟ کیسے اسے مصیبت میں پھنسا ہوا دیکھتا؟

زاہد کو بھی کوئل کی یاد آتی تو روتا رہتا۔ وہ اسے بھولا نہ تھا۔ اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ کرن اداسی کے عالم میں دور درخت کے ساتھ ٹیک لگائے لمبی سوچوں میں گم تھی۔ تلاش کرتے کرتے وہ بھی بے بس ہو گئی تھی۔ کسی کو بھی خبر نہ ہوئی تھی کہ کوئل کہاں چلی گئی ہے۔ بزرگ نے بتا دیا کہ کوئل مری نہیں زندہ ہے۔ یہ سنتے ہی زاہد پاگلوں کی طرح دیوانوں کی طرح اپنی کوئل کو تلاش کرنے کی غرض سے بھاگے جا رہا تھا۔ ادھر کوئل کو محبوب کی یاد نے غمگین کر دیا تھا۔ آنکھیں محبوب کی یاد میں بھیک بھیک کر خشک ہو گئی تھی اور حسن ماند پڑ گیا تھا۔ آس پاس بیٹھے سانپوں کو دیکھ کر کوئل چلائی میری حفاظت کرنا چھوڑ دو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ یہاں موت سروں پر منڈلا رہی ہے۔ دشمنوں نے یہ علاقہ دیکھ لیا ہے کسی وقت بھی تم سب کے ٹکڑے کر دیں گے۔ یہ سنتے ہی اپنی ملکہ کی حفاظت کرنے والے بھی بھاگ نکلے۔ کوئل بھی محبوب کو پا لینے کی غرض سے بھاگنے لگی۔ بھاگتے بھاگتے رات ہو گئی تو وہ ایک ناگن سے شہزادی کے روپ میں آگئی۔ ادھر کرن ایک طوفان بنی گاؤں کی طرف بھاگی لیکن کسی جگہ بھی اسے زاہد دکھائی نہ

زاہد وہاں بکھرے ہوئے سانپوں ناگوں کے ٹکڑے ہاتھوں میں پکڑے روئے جارہا تھا۔ کرن کی آنکھیں بھی بہہ رہی تھیں۔ ایک عرصہ بعد تو انہیں کول کے زندہ ہونے کی خبر ملی تھی۔ وہ تو پہلے ہی اسے مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ اگر بزرگ انہیں نہ بتاتے تو شاید یہ دونوں کول کو بھول چکے ہوتے لیکن اب ان بکھرے ٹکڑوں کو دیکھ کر وہ کیسے کول کو زندہ سمجھتے۔ دونوں ہی آنسو بہا رہے تھے۔

نہ کرن زاہد کو چپ کر رہی تھی اور نہ ہی زاہد کرن کو تسلی دے رہا تھا۔ زاہد کو کول کی تمام باتیں یاد آگئی تھیں۔ کہتی تھی کہ زاہد جان اس کول کی زندگی آپ کے دم سے ہے۔ آپ کی خوشی کی خاطر مرے گی۔ آپ کے دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کٹ مرے گی۔ کرن کیوں جدا ہوئی تھی وہ ہم سب سے؟ کیوں اکیلے ہی یہاں نکل آئی تھی؟ وہ کھنڈرات سے کیوں اس جلتی آگ میں جلنا چاہتی تھی؟ سوچا تھا شہر میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں کی رونقوں میں خوشی سے ناچیں گے گائیں گے لیکن شہری زندگی بھی راس نہ آئی۔ وہاں کے لوگوں میں بھی درندگی نظر آئی۔

کول تو بازی لے گئی ہے۔ پیار کو امر کر گئی ہے پھر دونوں نے روتے روتے ایک گڑھا نکالا اور سانپوں ناگوں کے تمام ٹکڑے اس میں دبا دیے۔ ادھر کول بھی بے بس ہو گئی تھی۔ تلاش کرتے کرتے وہ بھی نڈھال ہو گئی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ اب اس کا محبوب اسے لینے کبھی نہیں آئے گا۔ گاڑی میں بیٹھ کر سنی ہوئی باتیں اسے سچ دکھائی دینے لگیں کہ کول تو واقعی ایک سپنا تھی اور سپنے بکھر جاتے ہیں۔ اب تجھے کس کا انتظار ہے۔ کوئی نہیں آئے گا تجھے لینے کوئی نہیں آئے گا تیرے زخموں پر مرہم رکھنے۔ تو نصیبوں جلی ہے۔

آنسوؤں میں بھیگی ہوئی کول ویرانوں سے نکل کر ریل کی پٹری پر چلتی جا رہی تھی۔ کول تیرے حسن کی کرن کے حسن کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ پری ہے اور تو ناگن ہے۔ وہ اڑنا جانتی ہے، ہواؤں کو چیرنا جانتی ہے اور تو صرف رینگ سکتی ہے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ تیرا محبوب تجھ سے نفرت کرتا ہے تیرے وجود سے نفرت کرتا ہے، تجھے ایک سپنا سمجھتا ہے اور تو اپنے محبوب کے الفاظ کو سچ کر دکھا، ختم کر ڈال اپنے وجود کو بکھر جا ایک سپنا بن کر۔ کرن تو بڑے بھاگ والی ہے بڑے نصیب والی ہے بڑی قسمت والی ہے۔ جسے تو نے چاہا نہ پالیا حاصل کر لیا ہے اور جسے میں نے چاہا نہ پاسکی۔ اسے پانے کی خاطر تڑپتی رہی، کسکتی رہی، بکھرتی رہی، ٹوٹی رہی، ریزہ ریزہ ہوئی رہی۔ کرن بہن مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے کوئی گلہ

دیا۔ رات کے اندھیرے میں زاہد بھی دیوانوں کی طرح بھاگے جا رہا تھا۔ تینوں ایک دوسرے کو تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ کرن طوفان بنے محبوب کو تلاش کئے جا رہی تھی۔ کول دیدار محبوب کی خاطر بھاگے جا رہی تھی اور زاہد اپنی پچھڑی کول کو مصیبت سے نکالنے کی غرض سے بھاگا جا رہا تھا۔ گاؤں کا منظر کرن دیکھ آئی تھی وہاں عالموں اور پیروں کو دیکھ آئی تھی۔ جو ناگوں کو پکڑے جا رہے تھے۔ جنات کو جکڑے جا رہے تھے۔ اسے اپنی زندگی کی فکر نہ تھی اسے تو صرف محبوب کی زندگی کی فکر تھی۔ اس کو اگر کچھ ہو جاتا تو وہ طوفان برپا کر دیتی۔ تلاش کرتے کرتے کرن نے بالاخر اپنے محبوب کو دیکھ لیا اور اسے اٹھا لائی اور زاہد کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ کہ گاؤں میں جنات کو جلایا جا رہا ہے۔ سانپوں ناگوں کو پکڑنے کے بعد کاٹا جا رہا ہے۔

ناگ کا لفظ سنتے ہی زاہد چلایا کرن کول کو بچانا ہے۔ وہ زندہ ہے۔ لیکن کچھ دور ہی وہاں چند آدمیوں کو کھڑے دیکھا۔ ان میں جاگیردار وہاب بھی تھا۔ جب قریب عامل کو دیکھا تو کرن زاہد کو لئے غائب ہو گئی اور اسی جزیرے میں آگئی جہاں کول اور زاہد کا ملاپ ہوا تھا، جہاں کرن جکڑی ملی تھی۔

زاہد جان ہر سو دشمن پھیلے ہوئے ہیں۔ جانوں کو خطرہ ہے۔ کسی وقت کسی لمحے کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ جگہ بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہ لوگ یہاں بھی آسکتے ہیں۔ کرن وہ کول وہ لوگ مار دیں گے۔ کاٹ ڈالیں گے اسے۔ سنا نہیں تم نے وہ نمبردار کیا کہہ رہا تھا کہ کول نے جاگیردار حیات اور نمبردار کو مار دیا ہے۔ وفادار کے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ اب وہ ہر کسی کے ٹکڑے کر دیں گے۔ ہر کسی کو ختم کر دیں گے۔ خدا کیلئے کول کو بچاؤ ورنہ وہ کٹ مرے گی۔

کرن کی آنکھیں بھی بہہ نکلیں۔ وہ بھی اسے دیکھنے کو بے تاب تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا اور یقیناً کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہ زاہد کو لئے وہاں گئی۔ اب کی بار وہاں کوئی نہ تھا۔ لوگ واپس جا چکے تھے۔ زاہد بھاگتا ہوا جھاڑیوں ویرانوں میں کول کو پکارنے لگا چیخنے چلانے لگا لیکن وہاں ایک جگہ بکھرے ہوئے سانپوں ناگوں کے ٹکڑے دیکھ کر چیخ چیخ کر رو دیا۔

کرن ظالموں نے کول کو مار دیا ہے۔ کاٹ ڈالا ہے۔ اس کا خوبصورت جسم قیمہ قیمہ بنا دیا ہے۔ اب میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ جلا کر رکھ دوں گا۔ سبھی کو ختم کر دوں گا۔ جس نے میری کول کو مارا ہے انہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔

نہیں ہے۔ یہ تو نصیبوں کی بات ہوتی ہے، قسمت کی بات ہوتی ہے۔ جانتے تیرا محبوب مبارک ہو۔ تیرا پیار تجھے مبارک ہو، تیری چاہت تجھے مبارک ہو۔ اچھا پیارے ساجن اللہ حافظ۔ تو نفرت کرتا تھا اپنی اس کول سے اب یہ تجھے کبھی دکھائی نہ دے گی۔ اگر کبھی یہاں سے گزر ہو تو اپنی کول کے جسم کے بکھرے ٹکڑوں کو دفنا دینا۔ شاید تیرے ہاتھوں کے لمس کی خوشبو میرے جسم کے ٹکڑوں میں رچ جائے اور میری روح معطر ہو جائے۔ یہ سوچتے ہوئے خدا سے دعا کرتے ہوئے کول روتے ہوئے ریل کی پٹری پر سیدھی لیٹ گئی۔ آنکھیں بند کر لیں تھک گئی تھی۔ وہ محبوب کو تلاش کرتے کرتے اب آرام کرنا چاہتی تھی۔ دور سے گاڑی کے ہارن کی چٹخیں فضا میں گونجنے لگیں۔ بار بار وصل دیتی ہوئی گاڑی پوری رفتار سے چلی آرہی تھی۔ شاید وہ جان چکی تھی کہ اس کی پلیٹ میں کوئی آنے والا ہے۔ اس کے نیچے کسی دھکی کے جسم کے ٹکڑے ہونے والے ہیں۔ اسی لئے بار بار شو مچاتی ہوئی، ہواؤں کو چیرتی ہوئی، وصل پہ وصل دیتی ہوئی گاڑی کول کے جسم کو ٹکڑوں میں بانٹنے کے لئے قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی اور یہ محبوب کی یادوں میں کھوئی آنسو بہاتے ہوئے مست لیٹی تھی۔ گاڑی کی وصل فضاؤں میں گونجنے جا رہے تھے اسے کوئی بچانے والا نہ تھا۔ یہ گاڑی نہ تھی موت کا فرشتہ تھا جو لحوں میں کول کو ٹکڑوں میں بانٹ دینے والا تھا اور وہ آنکھیں بند کئے مستی کے عالم میں زاہد اور کرن کی زندگی سے ہمیشہ کیلئے نکل جانے کی خاطر بے سدھ لیٹی رہی۔ نہ گاڑی کے بار بار وصل کا اس پر اثر ہوتا اور نہ ہی وہ اپنی زندگی کو بچانے کی کوشش کرتی۔ وہ مر جانا چاہتی تھی، ٹکڑے ہو جانا چاہتی تھی۔ گاڑی سر پر پہنچ رہی تھی۔ اس کے بار بار وصل سے فضا گونج رہی تھی لیکن یہ مست اور بے سدھ پٹری پر اپنا سر رکھے آنکھوں میں آنسو لیے لیٹی رہی۔

☆.....☆.....☆

گاڑی ہارن پہ ہارن بجا رہی تھی۔ شاید کول کو بھاگ جانے کا موقع فراہم کر رہی تھی لیکن یہ محبوب کی جدائی میں زندگی کی امنگوں کو ختم کئے، آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔ اس سے قبل کہ گاڑی کول کا سرتن سے جدا کرتے ہوئے گزرتی، ایک طوفان آیا جو کول کو اڑا لے گیا۔ گاڑی اپنی رفتار سے ہارن پہ ہارن بجاتے ہوئے گزرتی رہی۔ ریل کی پٹری کے کچھ دور کول کرن کی بانہوں میں جھول رہی تھی۔ کرن کی بھیگی آنکھوں میں پیار تھا، چاہت تھی، محبت تھی، احساس جذبات سے اس نے کول کے مرجھائے ہوئے چہرے کو چومنا شروع کر دیا۔ بوسوں کی بارش شروع کر دی۔

میری بہن کہاں کھو گئی تھی تو، دیکھ تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو گئی ہوں، کیا حالت بنا لی ہے تو نے۔ کیوں اپنے حسن کی دھجیاں بکھیر کر رکھی دی ہیں تو نے۔ نجانے کرن کو آج کیا ہو گیا تھا۔ ایک عرصہ بعد کول کو دیکھ کر اس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

کول بہن! کیوں ہمارے درمیان سے نکل جانا چاہتی تھی، کیوں ریل کے نیچے آکر کٹ مرنا چاہتی تھی، کیوں ہمیں جدائیوں کے زخم دینا چاہتی تھی ترس گئے تھے ہم دونوں تیری پیاری صورت کو۔ کہاں کہاں تجھے نہیں ڈھونڈا کہاں کہاں تجھے تلاش نہیں کیا۔ تجھے کیا ہماری یاد نہیں آئی، اپنے زاہد کی یاد نہیں آئی۔ وہ دیکھ سامنے کون ہے۔

کول کرن کی بانہوں میں جھولتے ہوئے اس کے معصوم چہرے کو دیکھ جا رہی تھی۔ ایک عرصہ بعد اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ جلے نصیبوں والی نہیں ہے، اس کے نصیب میں پیار ہے، چاہت ہے۔ کرن کی بھیگی پلکوں نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا، سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ جب کرن کی آواز پر اس نے سامنے کی طرف دیکھا تو وہاں اس کا محبوب کھڑا تھا۔

وہ محبوب جس کیلئے وہ زندگی کی جنگ لڑتے ہوئے ہار چلی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اپنی تمام زندگی ایک فلم کی مانند نظروں کے سامنے چلنے لگی۔ وہ صرف اپنے محبوب کیلئے ناگن سے

رہا۔

سننے کا نام سنتے ہی کول بلک بلک کر رو دی۔ ”ہاں ہاں میں سنا ہوں۔ وہ سنا جو بکھرنے کیلئے ہوتا ہے جس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔“
یہ الفاظ سنتے ہی زاہد کو گاڑی والی باتیں یاد آ گئیں کیونکہ صرف ایک ہی دفعہ اس نے ایسی بات کہی تھی۔

”کول تم بکھرنے والا سنا نہیں ہو۔ آؤ دکھاؤں تمہیں کئے ہوئے ناگوں کے ٹکڑے۔“ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے روتی ہوئی آنکھوں سے دُفن کیا ان ٹکڑوں کو۔ تم کیا سمجھتی ہو مجھے تیری فکر نہیں پاگل کر دیا ہے تیری جدائی نے۔ بے بس کر دیا ہے تیری تڑپ نے۔ کہاں کھو گئی تھیں تم؟ کیوں میرے تڑپنے کا تماشا دیکھتی رہی ہو۔ اگر تم زندہ تھیں تو پھر میرے پاس کیوں نہ آئیں؟ میرا حال کیوں دریافت نہ کیا؟ کیوں نہ سوچا کہ تیرے زاہد کا کیا حال ہوگا۔ تیرے بنا کیسے جی رہا ہوگا۔ کہاں کہاں تجھے تلاش نہ کیا؟ کہاں کہاں تجھے نہ ڈھونڈا۔ ناگوں کے ٹکڑے دیکھ کر دل کو جھٹکا لگا تھا۔ ایک دل چاہا تھا کہ خود کو ختم کر لوں لیکن نجانے کیوں زندہ رہا۔ بتا کیوں یاد نہیں کیا تم نے اپنے زاہد کو۔ زاہد جذباتی ہو گیا۔

کول کو زاہد کے منہ سے نکلنے والی یہ تمام باتیں سچ لگیں۔ اس کی آنکھوں میں اپنا پیار دیکھ کر وہ بھی کھل اٹھی۔ اپنے دونوں پاؤں اپنے محبوب کے سامنے رکھ دیئے جو زخموں سے خون خوار تھے جگہ جگہ کانٹے گھسے ہوئے تھے۔ ”دیکھ رہے ہیں؟ یہ کول آپ کو بھول نہیں ہے۔ آپ کی تلاش میں تڑپتی رہی ہے۔ پاؤں میں چھالے ہیں، لہو لہان ہو گئے ہیں لیکن اب مجھے ان زخموں کی کوئی پروا نہیں۔ اب میں سنا نہیں ہوں حقیقت ہوں۔ جلتے نصیبوں والی نہیں ہوں خوش قسمت ہوں، کرن جیسی قسمت والی ہوں۔ مجھے میرا جیون، میرا پیا سبھی کچھ مل گیا، اپنی دکھ بھری زندگی کو بھول گئی ہوں۔“

ایک عرصہ بعد کول کے مرجھائے ہوئے چہرے پر آج دوبارہ رونق پھیلی تھی۔ آج دوبارہ مسکراہٹ لبوں پر ابھری تھی، چاہت، پیار اس دیرانے میں چمک رہا تھا۔

کرن ان کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی کیونکہ ایسی منزل اس نے بھی دیکھتی تھی۔ محبوب کیلئے وہ بھی تڑپتی رہی تھی۔ اب ہر لب پر مسکراہٹ تھی، ہر لب پر میٹھے میٹھے قہقہے تھے، ہر لب پھر پیار بھرے گیت تھے۔ لمبی جدائیوں کے بعد اسی دیرانے کو انہوں نے مبارک سمجھا کیونکہ یہاں ملاپ ہوا تھا اور وہ اس دیرانے کو اب کیسے چھوڑ سکتے تھے۔

حسینہ بنی تھی۔ جزیرے میں ایک ساتھ گزارا وقت یاد آنے لگا۔ ایک دوسرے سے کھیلی گئی آنکھ پھولی کے مناظر دکھائی دینے لگے۔ جب کار میں بیٹھ کر سنی ہوئی باتیں یاد آئیں تو چیخ پڑی۔
کرن وہ رعبہ تیرا ہے، وہ تمہیں چاہتا ہے، تیری پوجا کرتا ہے۔ میں کیا ہوں ایک بکھرا ہوا سنا، بنا وجود کے سنا۔

روتی ہوئی کول کو کرن نے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ دونوں کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو زمین کو تر کر رہے تھے۔ ”نہیں کول نہیں۔“ وہ میرا نہیں، ہم دونوں کا ہے۔ تو بھی اس کی دلہن ہے اور میں بھی۔

”تو نے کیسے کہہ دیا کہ وہ میرا ہے۔“ چل اس کے پاس دیکھ اس کی آنکھوں میں تمہیں اس کی آنکھوں میں نفرت نظر آتی ہے یا چاہت۔ ساتھ ہی کرن کھینچتے ہوئے اسے اپنے محبوب کے قریب لے گئی جو کول کو زندہ سلامت کرن کی بانہوں میں دیکھ کر خدا پاک کا شکر یہ ادا کر رہا تھا۔

اس کی آنکھیں بھی بہہ رہی تھیں۔ یہ آنسو جدائی کے بعد ملاپ کی خوشی میں تھے یا چھوڑے کے۔ جدائی کے، بے بسی کے ان لمحات کے جو کول کے بنا گزارے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے میں مگن تھے۔ دونوں کی پلکیں ہیگی ہوئی تھیں، دونوں کی زبانوں پر قفل لگے ہوئے تھے۔ ہونٹ ایک دوسرے سے چٹے ہوئے تھے۔ صرف ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے جدائیوں کی کہانیاں چھیڑے بیٹھے تھے کہ میرے محبوب بھول بیٹھے تھے اپنی کول کو کہاں کہاں تڑپتی رہی ہے یہ کہاں کہاں پھنسی رہی ہے یہ کہاں کہاں ڈھونڈتی رہی ہے اور شاید یہی کچھ زاہد اس سے پوچھ رہا تھا کہ۔ ”کول یاد کرو وہ دن تم کہا کرتی تھیں کہ میری جان یہ کول آپ سے کبھی جدا نہیں ہوگی، کبھی دور نہ ہوگی۔ پھر کہاں چلی گئی تھی تو؟ کیوں چھوڑ گئی تھی اپنے زاہد کو؟ کیوں جدائیوں کے زخم دے گئی تھی؟ کیوں تڑپنے کیلئے چھوڑ گئی تھی؟ کیوں آنکھوں میں آنسو دے گئی تھی؟

کرن ان دونوں کو یوں اس حالت میں دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسی۔ ایسے جیسے فضا میں میں دیرانے مہک گئے ہوں، بہاریں کھل گئی ہوں۔

”کیسی ہیں آپ۔“ بمشکل زاہد نے اپنی زبان کو حرکت دی۔

”آپ کے سامنے ہوں۔“ کول نے بھی اپنے لب ہلائے۔

”کول مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم میرے سامنے ہو۔ کہیں میں سنا تو نہیں دیکھا

ہوش تک نہ رہا تھا لیکن یہ خوشی بھی ان کو راس نہ آئی۔ یہاں بھی حسین شہزادیوں کے جسم آگ میں جلنے لگے۔ ایک جیپ میں سوار جاگیر دار وہاں نمودار ہوا۔ پانچ چھ علم والوں اور سپیروں کے ساتھ۔ علم والوں نے اپنے حساب میں بتا دیا تھا کہ یہ تینوں یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔

باباجی اس حینہ کو زندہ جکڑنا ہے، اسے جلانا نہیں ہے، اسے ہم نے جلانا ہے۔ اس کے ہم نے ٹکڑے کرنے ہیں اور ناگن کو قابو کرو۔ اسے بھی نہیں مارنا، اس کا جسم بھی نہیں کاٹنا، اس کو ہم نے ہی کاٹنا ہے۔ جاگیر دار ہدایات دے رہا تھا۔

علم والوں نے جلانے کے بجائے جن زادیوں کو جکڑنا شروع کر دیا۔ ہر طرف افراتفری برپا تھی۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ سپیرے سانپوں، ناگوں کو پکڑے جا رہے تھے۔ کول کرن زاہد کی ہانہوں میں تھیں۔ زاہد نے دونوں کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ کرن لے اڑو ہمیں یہاں سے ورنہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔

”کیسے سرتاج“ کیسے میں قابو میں ہوں ان کی گرفت میں ہوں۔“ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے، بے بس ہوں۔

یہ سنتے ہی زاہد ان کو پکڑے بھاگنے لگا کیونکہ گاڑی بہت دور کھڑی تھی وہ لوگ ان کو دیکھ نہیں سکتے تھے صرف بھیا تک چنچیں سن سکتے تھے۔ یہ تینوں بھاگنے میں مصروف تھے ان کے چنگل سے بہت دور نکل جانا چاہتے تھے۔ باباجی ان حیناؤں کو پکڑو یہ چہرے وہ نہیں ہیں جنہیں آپ نے جکڑا ہے۔ انہیں جلاؤ، ہمارے ان سے دشمنی نہیں ہے۔ انہیں پکڑو انہیں قید کرو۔ اس کمینہ کو پکڑو اس کی آنکھیں نکالنی ہیں اس خنجر سے اس کے جسم کے ٹکڑے کرنے ہیں بہت مشکل سے انہیں ڈھونڈا ہے۔ اگر اب یہ لوگ بھاگ نکلے تو پھر قابو نہیں آئیں گے۔ وہاب صاحب وہ تینوں ان میں نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو قبضہ میں آ جاتے۔ بھاگ گئے ہیں کہیں دور چلے گئے ہیں۔ ہمارے علم کی حدود سے باہر نکل گئے ہیں۔ علم والے نے جاگیر دار کو ناکامی کے بعد جواب دیا۔

کرن تم کول کو لے کر دور چلی جاؤ، میں خود ان کا مقابلہ کروں گا۔ خدا کے لیے بھاگ جاؤ یہاں سے یہ تمہاری جنگ نہیں ہے کیونکہ تم سچ میں پڑو گی تو ماری جاؤ گی، ٹکڑوں میں ٹکڑے جاؤ گی۔ مجھے تمہاری زندگی چاہئے میں تمہیں مارتا ہوں، جلتا ہوں انہیں دیکھ سکتا۔ تم یہاں سے کول کو لے چلو بھاگ اڑو۔ کرن بھاگ جاؤ، میری فکر نہ کرو مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ کبھی بھی مجھے دیکھ نہیں پائیں گے۔ ایک ایک کر کے میں سبھی کو جلا دوں گا۔

یہاں ہمیشہ رہنے کا انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ اس دیرانے میں انہوں نے اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ یہ ان گاؤں سے بہت دور تھا یہاں ہر طرف سکون تھا۔ اب ایک مرتبہ پھر پیار بھری زندگی شروع ہوئی، ہر رات یہاں آنکھ بھولی ہوئی۔ ہزاروں کی تعداد میں حسن سے لدی ہوئی پریاں اس دیرانے کو مہکا رہی تھیں۔ یہ سیاہ دیرانہ نہ تھا ایک حسین دنیا تھی، مسکراہٹیں بکھیرتے حسین چہرے تھے۔

کول بھی اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھی۔ اپنے محبوب کے پہلو میں رہ کر خوشی سے پھولے نہ سار رہی تھی۔

زاہد جان دیکھ لیا ہے اپنی اس کول کو، گاڑی کے نیچے آ کر کٹ مرنا چاہتی تھی۔ ہمیشہ کے لیے ہماری دنیا سے نکل جانا چاہتی تھی، کرن نے مسکراتی ہوئی کول کو دیکھ کر کیوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

کرن بہن کیا کرتی تہا زندگی کب تک گزارتی، ٹوٹ گئی تھی اندر سے ریزہ ریزہ ہو گئی تھی زندگی کی تمنا نہ رہی تھی جس کے لیے انسان بنی تھی جب وہی پاس نہ رہا تو پھر جی کر کیا کرتی۔

زاہد کول کی زبانی اپنے لیے بے پناہ پیار دیکھ، سن کر خوشی سے پھولے نہ سار ہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹا ایک ایک لمحہ اسے یاد آ رہا تھا۔

کول مان گیا ہوں تیرے پیار کو، تم ایک ایسا ہیرو ہو جو کم لوگوں کی قسمت میں ہوتا ہے، کم لوگ ہی اسے پاتے ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری زندگی اس قدر روشن اور اجلی ہوگی۔ میں تو گھر سے زخمی جسم لے کر نکلا تھا۔ دل میں صرف انتقام کی آگ بجڑ کر رہی تھی کہ جن لوگوں نے میرا خاندان ختم کیا ہے ان کو ختم کر دوں گا۔

مجھے نہیں علم تھا کہ آپ دونوں مجھے ملیں گی، میرے انتقام کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں گی۔ خدا نے میری بہت قریب سے سنی ہے۔ اگر کول گاڑی تمہارے جسم کے ٹکڑے کر کے گزر جاتی تو ہو سکتا تھا کہ زندگی اتنی حسین نہ رہتی۔ تمہاری یاد میں آنسو بہا رہا ہوتا لیکن میں جانتا تھا کہ تم ضرور مجھے ملو گی۔ ضرور میرے قریب آؤ گی۔ یہ میرے دل کی آواز تھی اور دل سے نکلی آواز ضرور پہنچے گی۔ اب ہماری خوشیوں کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ یہاں کبھی بھی جاگیر دار اور نمبردار نہیں آ سکتے۔ اب ہم ایک ساتھ جیس گے ایک ساتھ مریں گے۔

دونوں شہزادیاں اپنے شہزادے کی باتیں اس قدر غور سے سن رہی تھیں کہ زمانے کا

کہا۔

”سرتاج اگر آپ اپنا ورد ختم نہ کرتے، ہمیں اپنے علم میں جکڑے رکھتے تو پھر کوئی دوسرا مجھے قابو نہ کر سکتا۔ میری مخلوق کو قابو نہ کرتا، وہی ہم لوگوں پر قبضہ جمانا جس کے علم کی قوت آپ سے زیادہ ہوتی۔ وہ ہی ہمیں آپ سے چھین سکتا تھا۔“

کرن کی اس بات نے زاہد کے دل میں ہلچل برپا کر ڈالی کہ اسے اپنا علم ختم نہیں کرنا چاہئے تھا۔ کسی وقت بھی اس کی دونوں شہزادیاں موت کے منہ میں جا سکتی ہیں لیکن کرن میں نے تو شیطانی علم سے توبہ کر لی ہے کہ دوبارہ شیطانی نہ کروں گا۔ سرتاج میں آپ کو مجبور نہیں کر رہی ہوں بس بتایا ہے کہ ہماری مخلوق علم والوں کے قبضہ میں ہے۔ ایک ایک کر کے سبھی کو جلا رہے ہیں اور ہم بھی عنقریب ان کے شکنجے میں آنے والے ہیں جس طرح کوئل نے ان کے جسموں کی بوٹیاں کی ہیں جس طرح آپ نے ان لوگوں کو جلایا پکھلایا ہے۔ عنقریب ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہونے والا ہے۔ میں تو جل مردوں کی لیکن آپ کے جسم کے ٹکڑے نہیں سرتاج نہیں میں آپ کے جسم کے ٹکڑے ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔

کرن کی باتیں سن کر کوئل آگ میں چپ رہی تھی۔ سوچوں میں غرق تھی کہ اس نے وہاب اور فواد کو زندہ کیوں چھوڑا۔ انہیں ختم کیوں نہیں کیا۔ اپنے محبوب سے کیا ہوا وعدہ ادا ہوا کیوں چھوڑا۔ اس نے تو کہا تھا میرے محبوب آپ فکر نہ کریں جب تک میں زندہ ہوں میں لوں گی آپ کا انتقام۔ آپ خود کو اکیلا اور تنہا نہ سمجھیں۔

یہ سوچ آتے ہی وہ دریا کی طرف بھاگی لیکن زاہد کی آواز نے اس کے قدم روک دیئے کہاں جا رہی ہو کوئل۔ اب یہ تیرے بس کا کھیل نہیں رہا۔ اب وہ دونوں اکیلے نہیں ہیں ان کے قریب چندہ بیس سپیرے اور بڑے بڑے علم والے ہیں ان کے قریب ہونا موت کے قریب ہونا ہے۔ واپس آ جاؤ کرن نے ہر بات بتا دی ہے۔ کوئل انہی قدموں واپس ہو گئی۔

”سرتاج پھر یہاں سے بہت دور چلے جاتے ہیں جہاں ہمارا کوئی دشمن نہ ہو جہاں صرف ہم ہوں، مہکتی بہاریں، پھلتے ارماں ہوں، کھلتی فضاں ہیں۔“

”ضرور جائیں گے کوئل ضرور جائیں گے لیکن ابھی مجھے اپنی بہنوں کے گلوں میں بندھے ہوئے سرخ پھندے دکھائی دے رہے ہیں۔ میں نے بہنوں کی قبروں پر کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی کہ جب تک ان کے دشمنوں کو ان کی طرح قبروں میں نہ لانا دوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔“

”سرتاج آپ کو اکیلے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہیں دشمنوں کے سچ آپ کو کیسے چھوڑ سکتی ہیں۔ آپ بھی چلیں۔“ کرن نے زاہد کو اٹھانے کیلئے ہاتھ آگے بڑھایا تو زاہد چلایا۔

”کرن یہ سب میری بہنوں کے قاتل ہیں۔ انہیں دیکھ کر اپنی بہنوں کے بندھے ہوئے سرخ پھندے کیسے بھول سکتا ہوں مجھے بدلہ لینا ہے ایک ایک سے بدلہ لینا ہے جس طرح میرا خاندان انہوں نے قبروں میں اتارا ہے اسی طرح انہیں بھی قبروں میں اتارنا ہے۔ خدا کے لیے کرن کوئل کو لیے بھاگ جاؤ غائب ہو جاؤ یہاں سے اپنی زندگی بچاؤ۔“

”نہیں سرتاج آپ کے بغیر رہ کر دیکھ لیا ہے۔ ایک لمحہ بھی سکون سے نہیں گزرا۔ ایک ایک پل دل کو ڈستار ہا ہے۔ اب کبھی آپ سے جدا نہ ہوں گی۔ آپ کو موت کے حوالے کر کے ہم زندگی کی خواہش کریں؟“

نہیں سرتاج اب یہ کوئل آپ سے ایک لمحہ بھی دور نہیں ہوگی۔ آپ کے لیے خود کو قربان کر دے گی۔ اگر وہ آپ کے دشمن ہیں تو وہ ہمارے بھی دشمن ہیں صرف آپ سپرے کو ختم کر دیں باقی سب کو میں سنبھال لوں گی۔ اتنے الفاظ کہنے تھے کہ دور سے بجتی ہوئی بین کی آواز سنائی دی۔ شاید یہ لوگ ان تینوں کے قریب آ گئے تھے۔ بین کی آواز سنتے ہی کوئل تڑپنے لگی مدھوش ہونے لگی۔

یہ منظر دیکھتے ہی کرن نے فوراً کوئل کو اٹھایا، زاہد کو زبردستی پکڑا اور لے اڑی۔ اس جریرے میں آگئی جہاں انہیں پیار ملا تھا جہاں خوشیاں ملیں تھیں۔ زاہد جان اب انہیں میں ختم کروں گی آگ لگا دوں گی۔ تمام گاؤں کو جلا کر رکھ دوں گی۔ چھوٹے بڑوں کو کسی کو معاف نہیں کروں گی۔ آپ دونوں سکون کریں آرام کریں میں ابھی آتی ہوں۔

یہ کہتے ہوئے کرن ایک طوفان بن گئی۔ اتنا بدترین طوفان کسی نے آج تک دیکھا نہ تھا۔ ہر طرف تباہیاں ہو رہی تھیں مکان گر رہے تھے لوگ تلے تلے دبتے چلے جا رہے تھے بھیاں بھیاں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ ایسے جیسے زلزلے پر زلزلے آ گئے ہوں۔ ہر چیز لرز رہی تھی۔ انفرادی تھی شور شرابا تھا۔ جنات بھی جلتے جا رہے تھے اور انسان بھی مکانات تلے دبتے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد کرن دوبارہ جریرے میں آئی۔ آتے ہی بولی۔ ”سرتاج ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔ یہاں بھی وہ لوگ پہنچنے والے ہیں۔ میں نے سبھی کو دیکھ لیا ہے۔“

”آخر تک ہم بھاگتے رہیں گے۔“ زاہد نے کرن کی اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر

سے بہت دور لے چلوں میں جلنا نہیں چاہتا۔ خواب میں سب کچھ دیکھ لیا ہے، خدا نے ہر بات مجھے دکھا دی ہے۔ کوئل میں نے اپنے آپ کو مرے ہوئے دیکھا ہے۔ اپنے کفن کو آگ میں جلتے دیکھا ہے۔ فرشتے آگ سے میرے جسم کو جلا رہے تھے، بھڑکتی آگ میں پھینکنے کے لیے کھینچتے جا رہے تھے اور میرے کانوں سے آوازیں نکلا رہی تھیں۔ کوئی شخص کہہ رہا تھا کہ اس شخص نے شیطانی علم اپنایا ہے۔ دیکھو مرنے کے بعد اس کی قبر سے آگ نکل رہی ہے۔ قبر کی مٹی جل کر سیاہ ہو رہی ہے۔ نہیں کرن، میں اب شیطانی علم نہیں اپناؤں گا، میں ہمیشہ کیلئے بھڑکتی آگ میں جلنا نہیں چاہتا۔ مجھے یہاں سے لے چلو ایسی جگہ جہاں سکون ہو، ٹھنڈک ہو، مہک ہو۔“

انتا کہنے کی دیر تھی کہ کرن دونوں کو اٹھائے ان بستیوں سے بہت دور لے کر جانے غرض سے اڑنے والی تھی کہ یکدم جکڑی جانے لگی۔ چیخنے چلانے لگی۔ ویسے ہی جکڑی گئی جیسے کنویں میں جکڑی پڑی تھی۔ جکڑتے ہوئے اڑتے ہوئے دوسرے کنارے آگری۔ لمحوں میں دریا کنارے شور برپا ہو گیا، کامیابی کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔

”بابا جی، بابا جی اسے جلاتا نہیں ہے، دھواں نہیں بنانا ہے، انہیں عبرتاک سزا دینی ہے۔ ایسا انتقام لینا ہے کہ جو انہوں نے سوچا بھی نہ ہو۔“ جکڑی ہوئی کرن کو دیکھ کر نمبردار چلا رہا تھا۔

”وہ دونوں بھی اس جزیرے میں ہیں۔ انہیں بھی پکڑیں۔ ایک ساتھ انہیں مارنا ہے۔“

جزیرے کے دوسرے کنارے کھڑے زاہد اور کوئل کرن کو بندھے اور چیخنے دیکھ کر آنسو بہا رہے تھے۔ ان کی نظروں کے سامنے ہی ان کی موجودگی میں کرن تڑپنے لگی، کھینچی جانے لگی۔ نہ تو وہ اسے پکڑ سکے اور نہ ہی جکڑنے سے بچا سکے۔ جاگیرداروں کے بچھائے جال میں وہ پھنس چکی تھی۔ یہ دونوں چیخنے ہی رہ گئے۔ اسے پکارتے ہی رہ گئے لیکن وہ تڑپتے تڑپتے دوسرے کنارے جا پہنچی تھی۔ دوسرے کنارے لوگوں میں بیٹوں والے بھی تھے جو کرن کے بعد کوئل کو قابو کرنے کی غرض سے مین بجا رہے تھے لیکن اتنی دور سے وہ انہیں قابو نہیں کر سکتے تھے کیونکہ سپیروں کی بیٹوں کی آوازیں کوئل تک نہیں پہنچ رہی تھیں وہ نہ تو مست ہو رہی تھی اور نہ ہی ان کی لپیٹ میں آ رہی تھی۔

زاہد جاگیرداروں کے اچانک حملوں سے پریشان کھڑا دوسرے کنارے کھڑے

”سرتاج میری بات مان لیں اپنا ختم کیا ہوا درد دوبارہ حاصل کر لیں پھر دیکھتی ہوں کیسے کوئی ہمیں قابو کرتا ہے آپ کے دشمنوں کے سر آپ کے قدموں تلے رکھ دوں گی۔“

”مجھے سوچنے دو۔ زاہد کا دماغ الجھ سا گیا۔“ اگر وہ رد نہیں کرتا تو اپنی شہزادیوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اگر ورد کرتا ہے تو خدا کا منکر ہوتا ہے۔ کبھی شہزادیوں کے حسین مہکتے چہرے دکھائی دیتے اور کبھی ان کے کئے ہوئے سر، بکھرے ہوئے جسم جسے سوچ کر وہ تڑپ جاتا۔ عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ عجیب الجھنوں میں مبتلا تھا۔ رات ہو گئی۔ اندھیرا پھیل گیا لیکن زاہد سوچوں میں الجھا رہا۔

کرن کی مدد والی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ بہت بڑا امتحان تھا اس کے سامنے۔ ایک طرف دو زندگیاں اور دوسری طرف خدا سے کیا ہوا وعدہ کیا کرے کیا نہ کرے، کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ تب خدا کے حضور اپنا دامن پھیلا دیا۔ ”یا باری تعالیٰ تو ہی کوئی راستہ بتائیں کیا کروں۔ کرن کی بات مانتا ہوں تو تیرا مجرم ہوتا ہوں اور اگر نہیں مانتا تو زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان ظالموں کے ہاتھوں بوٹی بوٹی ہو جانا ہے یا خدایا تو ہی راستہ بتا۔“

دعائیں کرتے کرتے روتا رہا۔ شیطانی علم کو اپنا نہیں چاہتا تھا لیکن کرن کی باتیں دماغ میں گونج رہی تھیں۔ روتے روتے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں، بار بار نیند کے جھٹکے لگتے وہ سو گیا۔ تقریباً گھنٹہ بھر بھی نہ سویا تھا کہ ایک چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔ سوتے میں ہی جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

قریب بیٹھی ہوئی اس کی حفاظت کرتی ہوئی دونوں شہزادیاں اپنے محبوب کے منہ سے چیخ سن کر چونکیں۔ ”کیا ہوا سرتاج کیا ہوا لیکن وہ بار بار اپنے جسم کو چھو رہا تھا۔ کبھی سر کو کبھی جسم کو آنکھیں ایسی تھیں جیسے جلتے انگارے ہوں، زبان گنگ تھی۔ ایسے میں جیسے بھیا نک خواب دیکھ لیا۔

نہیں نہیں مجھے نہ مارو مجھے نہ جلاؤ اس کا ساکت جسم حرکت میں آیا تو کرن کوئل کے ذہن میں نمبردار اور جاگیردار کے چہرے آ گئے کہ وہ خواب میں آئے ہوں گے اور اسے جلانے لگے ہوں گے۔ مارنے لگے ہوں گے۔

”کیا ہوا سرتاج کیوں چیخے ہو کیوں آپ کی رنگت بدلی ہوئی ہے، کیوں آپ کی آنکھوں میں خوف بھرا ہے۔“

کوئل کی بات سنتے ہی زاہد روتے ہوئے بولا۔ ”کوئل مجھے نہیں لینا بدلا مجھے یہاں

نمبردار اس کی کمین زاہد کے گلے میں رسر ڈال کر یہاں لانا۔ گاڑی کے پیچھے باندھ کر کھینچ کر گاؤں لے جاتا ہے۔ وہاں اس کے جسم کے ٹکڑے کرنے ہیں ہر گھر میں بوٹیاں بانٹنی ہیں کہ اس لڑکے کے جسم کی بوٹیاں ہیں جس نے آپ لوگوں کو اور حویلیوں والوں کو جلایا کھلایا ہے۔ اس کی بوٹیوں کو اپنے اپنے چلوں میں جلاؤ اور ساتھ ہی قہقہے گونج رہے تھے۔

کوئل نے سانپوں اور ناگوں کو بتا دیا کہ دوسرے کنارے بھاگ جاؤ کیونکہ تمام سپرے کشتیوں میں سوار ہیں اور جا کر علم والوں پر حملہ کر دو کرن کو بچانا ہے۔ یہ کہہ کر خود بھی دریا میں کود پڑی اور پانی پر تیرنے لگی۔

ہر طرف قہقہے تھے۔ پہلے تو یہ تینوں بچ گئے تھے لیکن اب وہ انہیں بچنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ جنات دریا کنارے جل رہے تھے تڑپ رہے تھے چیخ رہے تھے۔

جاگیردار وہاب گرے جا رہا تھا۔ کرن پر بددوق کا باٹ برسائے جا رہا تھا کہ بابا جی اس دیوی کو ابھی آگ نہیں لگانی ہے تینوں کو ایک ساتھ آگ لگائیں گے، صبح ہونے کا انہیں موقع نہیں دیں گے بہت کر لی ہے انہوں نے قتل و غارت۔

آسمان کی طرف چہرہ کئے روتے ہوئے زاہد کے لب ہلے یا خدایا میری مدد فرما، میری شہزادیوں کو بچا۔ میں نے یار رب تجھ سے مدد مانگی ہے اور تو سنتا ہے سننے والا ہے۔ شاید خدا نے اس کی دعا قبول کر لی تھی کہ دریا میں تیرتی ہوئی کوئل نے اپنی زندگی کی پروا کئے بغیر زور سے چھلانگ لگائی اور نمبردار کی گردن کو جا پکڑا یکدم حملے سے نمبردار خود کو سنبھال نہ سکا اور دریا میں گر پڑا۔ اس کی گردن کوئل کے منہ میں تھی اور اسے بچ دریا میں لے جا کر چھوڑ دیا۔ اگر بین بچ رہی ہوتی تو شاید کوئل حملہ نہ کرتی۔ نمبردار کے درمیاں میں گرتے ہی شور شرابا شروع ہو گیا۔

جزیرے پہنچنے والی کشتیاں اپنے سردار کو بچانے کی غرض سے دریا میں انہیں تلاش کرنے لگیں۔

دریا کنارے گرجتے ہوئے جاگیردار وہاب یہ منظر دیکھ کر چیخا۔ ”بابا اس چڑیل کو آگ لگا دو اب کوئی نہ بچنے پائے۔“

بابا اپنے اپنے منتر پڑھ کر اس کے جسم پر پھونک ڈالو اسے جلا ڈالو دھوئیں میں اڑا دو اس کا حسن۔ باقی دونوں کو میں خود قابو کر لوں گا۔

نمک حرامو دریا میں کیوں گھوم رہے ہو جزیرے تک پہنچو اس ذلیل کینے زاہد کے بچے کو پکڑ کر گولیوں سے چھلنی کر ڈالو بابا تم لوگ منتر پڑھ کر اس چڑیل کو جلا ڈالو لیکن ارد گرد پھیلے

لوگوں کو دیکھ رہا تھا جوان تک پہنچنے کے لیے حربے استعمال کر رہے تھے۔ بار بار آسمان کی طرف منہ اٹھاتا خدا سے مدد کی دعائیں کر رہا تھا۔ اپنی جکڑی ہوئی کرن کی آزادی کی دعائیں کر رہا تھا۔ قریب کھڑی کوئل کی سلامتی کی دعائیں کر رہا تھا اور ساتھ ہی اپنے شیطانی علم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر وہ شیطانی علم اپنا کر مارتا تو اس کا کتنا بھیا تک حال ہوتا۔ اس کے جسم سے لپٹا ہوا کفن جلتا قبر سے آگ کے شعلے بھڑکتے قبر کی مٹی جل جل کر سیاہ ہوتی اور وہ آگ کے کپڑے پہنے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ میں جلتا رہتا لیکن اب وہ پرسکون تھا۔ خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو دوبارہ اپنا پیشوا بنانے سے بچ گیا تھا ہو سکتا تھا کہ خدا کی رحمت سے جسم نہ جلتا اس کی قبر کو آگ نہ لگتی۔ قبر کی مٹی جل کر سیاہ نہ ہوتی۔ اپنی پچھلی تمام زندگی نظروں کے سامنے گھوم رہی تھی تو رورو کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگ رہا تھا اور کوئل اپنے محبوب کو دیکھے جا رہی تھی کبھی دوسرے کنارے بندھی ہوئی، جکڑی ہوئی کرن کو دیکھتی اور کبھی زاہد کو۔ اب وہ کیا کرتی کیسے ان دونوں کو بچاتی کیسے دشمنوں کو ختم کرتی اس کی سمجھ نہ آ رہا تھا۔ محبوب سے کیا ہوا وعدہ اسے یاد آ رہا تھا کہ زاہد جان میرے ہوتے ہوئے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں نمٹ لوں گی۔ آپ کے دشمنوں سے میں حفاظت کروں گی آپ کی لیکن اب وہ اپنے محبوب کی کیسے حفاظت کر سکتی تھی وہ تو خود موت کے شعلے میں تھی۔ کرن کی طرح وہ بھی قبضہ میں آنے والی تھی۔

دس پندرہ کشتیاں دریا میں چلنے کے لیے کناروں پر آگئیں ہر طرف گونجتے قہقہے تھے لیکن زاہد کو ان لوگوں کی ذرا بھی پروا نہ تھی وہ تو آنکھیں بند کئے چہرہ آسمان کی طرف کئے روئے جا رہا تھا۔ اپنے گناہوں کی معافیاں مانگے جا رہا تھا اور کوئل جزیرے میں پھیلے ہوئے سانپوں، ناگوں کو اکٹھا کر کے سمجھائے جا رہی تھی شاید انہیں کہہ رہی تھی کہ آج انہیں اپنے جسموں کی قربانیاں دینی ہیں، اس کے محبوب کو بچانا ہے کٹ مرنا ہے لیکن محبوب کے جسم پر خراش نہیں آنے دینی ہے۔

ادھر کشتیوں پر تمام سپرے سوار ہو گئے۔ نمبردار فواد بھی سوار ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا رسر تھا وہ اس رسر کو زاہد کے گلے میں ڈالنا چاہتا تھا اور گاڑی کے پیچھے باندھ کر کھینچتے ہوئے گاؤں تک لانا چاہتا تھا کیونکہ کشتی میں سوار دوسرے کنارے کھڑے جاگیردار وہاب کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو باندھی ہوئی کرن کے بالوں کو کھینچنے منہ پر طمانچے مارتے ہوئے بول رہا تھا۔

نکلے نکلے کر دوں گا اس کے جسم کو۔ کوئل وہاب کی زبانی ان کو جلانے اور اس کے محبوب کے جسم کا قیمر بنانے کا لفظ سنتے ہی سیٹ نیچے بیٹھی تڑپ بھلا اس کے ہوتے ہوئے کس کی مجال تھی کہ اس کے محبوب کو بری نظر سے کوئی دیکھے۔ اس نے تو اپنے محبوب سے وعدہ کیا تھا کہ جان زاہد خود کو اکیلے نہ بھجنا جب تک زندہ ہوں آپ کے ایک ایک دشمن کا مقابلہ کروں گی جس طرح آپ کی بہنیں قبروں میں لیٹی ہیں اس طرح آپ کے دشمنوں کو بھی قبروں میں دبا دوں گی۔

اپنا منہ کھولا اور نیچے ایکسیلیٹر پر رکھے ہوئے جاگیردار کے پاؤں کو زہریلے دانتوں میں لے لیا۔ جاگیردار ایسے تڑپا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ گاڑی بے قابو ہو گئی۔ عامل بابا نے گاڑی میں بیٹھے یہ منظر دیکھ لیا۔ جاگیردار کا پاؤں ناگ کے منہ میں دیکھ لیا۔ ڈوٹی ہوئی گاڑی میں بڑی ہوئی بندوق کو پکڑا اور اس کا رخ کوئل کی طرف کر دیا۔ ابھی گولی نہ چلائی تھی کہ گاڑی ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ بابا گاڑی سے نیچے جا گرا۔

اس سے قبل کہ وہ سنبھلتا کوئل گاڑی سے نیچے کود گئی۔ بابا عامل کی زبان کوئل کے منہ میں تھی۔ زہریلے دانت اس کے گوشت میں پیوست تھے وہ تڑپتا رہا، چیختا چلاتا رہا اور کوئل اپنا زہر اس کے جسم میں اغڑ بیٹی رہی۔ تڑپ تڑپ کر جب ٹھنڈا ہو گیا تو کوئل نے اپنے دانت باہر نکالے۔

کانی دیر تک ان دونوں کو مرے ہوئے دیکھتی رہی۔ منہ سے پہلی زرد جھاگ بہہ رہی تھی۔ درخت سے ٹکرائی گاڑی کے اوپر سنیرنگ پر اپنا سر رکھے وہاب ایسے مست تھا جیسے یہ مرا ہوا نہ ہو بلکہ سو رہا ہو۔ آج وہ بہت خوش تھی پھر اپنے محبوب کا دیدار کرنے، جکڑی ہوئی کرن کو بچانے کی غرض سے بھاگ نکلی۔ اگر وہ ناگن سے شہزادی کا روپ اختیار کرتی تو ہو سکتا تھا کہ پکڑی جاتی، ماری جاتی کیونکہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے لوگ کسی بھی وقت کسی بھی لمحے کو لیبوں سے اس کا جسم رنگ سکتے تھے۔ لوگ جاگیردار وہاب کی تلاش میں وہاں تک جا پہنچے۔ گاڑی میں مرے وہاب کو دیکھ کر کانپ کر رہ گئے۔ رو دیئے۔ ساتھ ہی مرے ہوئے عامل کو پایا تو دونوں کو اٹھا کر چلنے لگے۔

اس دیرانے میں جگہ جگہ شیطانی علم والوں کی بکھری لاشیں پڑی تھیں، سبھی کے منہ سے پیلے رنگ کی جھاگ بہہ رہی تھی۔ درخت سے ٹکرائی گاڑی کو نکالا تمام لاشیں اس میں رکھیں

سانپوں، ناگوں کو دیکھ کر علم والے اپنی جانیں بچانے کی غرض سے بھاگ نکلے۔ اپنے ورد بھول گئے نہ کرن کو جلا سکے اور نہ ہی آزاد کر سکے۔ وہ جکڑی کی جکڑی رہ گئی جتنی تیز وہ بھاگ رہے تھے اتنی ہی تیز ناگ سانپ ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ہر طرف کوئل کا پھیلایا ہوا خوف و ہراس دیکھ کر زاہد کی آنکھیں بھی آگ اگلنے لگیں۔ ایک کشتی کو نشانہ بنا دیا۔ ابھی اس میں آگ بھڑکی ہی تھی کہ باقی کشتیاں بھی واپس بھاگنے لگیں لوگوں کے خون خشک ہو رہے تھے۔ دریا میں ایک طوفان چلنے لگا۔

جنات پھیل گئے تھے کوئل دریا کنارے بڑھتی جا رہی تھی دریا کنارے پہنچ کر وہاب کو پکڑ لینا چاہتی تھی اسے ڈسنا چاہتی تھی جو خنزیرہ تھا۔ دریا میں تیز موجوں سے کشتیاں اٹنے لگیں لوگ ڈوبنے لگے دریا کنارے کھڑے محافظ بھاگنے لگے کوئل دریا کنارے پہنچ گئی۔ وہاب صاحب بھی کوئل کے ہاتھوں بچنے کی غرض سے گاڑی میں بیٹھے ابھی گاڑی سٹارٹ بھی نہ کی تھی کہ ایک چملاگ لگا کر کوئل بھی اس میں بیٹھ گئی وہ بار بار پیچھے دیکھ رہا تھا اسے پتا نہ چل سکا کہ کوئل گاڑی میں ہے وہ گاڑی چلاتے گھومتے ہوئے سانپوں ناگوں کو گاڑی کے ٹائروں تلے کچلتے گاڑی بھگائے جا رہا تھا۔ عامل لوگوں کو پکڑنے کی کوشش میں تھا۔ راستے میں جتنے بھی سانپ ناگ دکھائی دیئے ٹائروں تلے کچلتا گیا۔ اپنے دوست اپنے عزیز اپنے بھائی نبردار کا دریا میں ڈوبنا بار بار نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ دونوں حویلیاں خالی ہو گئی تھیں اب مردوں میں وہاب تنہا تھا جو اکیلا بچا تھا یا پھر جاگیردار حیات کی بیوی جو خالی حویلی دیکھ کر اپنے خاندان کا قتل دیکھ کر سکتہ کے عالم میں تھی۔

حویلی کے کونے کونے سے اسے خوف آتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ باقی لوگوں کی طرح وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ مر جائے گی۔ قبر میں جا پڑے گی۔ بہت دور جا کر جاگیردار وہاب نے گاڑی کے بریک لگائے۔ ایک علم والا دکھائی دیا۔ باقی شاید دیرانوں میں چھپے ہوئے تھے یا بھاگتے ہوئے ناگوں، سانپوں کے زہریلے دانتوں کا نشانہ بن گئے تھے اس عامل کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا۔ آنکھیں خوف سے بھری پڑی تھیں۔ گاڑی دیکھتے ہی اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ بھاگ کر گاڑی میں بیٹھا شاید زمین میں پھیلے ہوئے سانپوں ناگوں سے بچنا چاہتا تھا۔ بابا جی اب حالات کنٹرول میں ہیں۔ ناگن کو میں نے ٹائروں تلے کچل دیا ہے۔ آپ صرف اس چڑیل کو اسی شہزادی کو جا کر آگ لگا دیں اب کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا۔ چڑیل کو آگ لگاتے ہی وہ کمی کمین اکیلا رہ جائے گا اور پھر دیکھتا ہوں کیسے بچتا ہے میرے ہاتھوں سے۔

اور گاؤں چل دیئے۔ وہاں ایک کھرام تھا، آہ زاری تھی، ماتم ہونے لگا۔

جاگیردار حیات کی بیوی چیچی۔ ”خبردار کسی نے حویلی والوں کو مردہ کہا، زبانیں کاٹ دوں گی۔“ عامل لوگوں کے کفن تیار ہوئے۔ شیطانی علم والوں کو کفن پہنائے گئے لیکن خدا کی قدرت سبھی کے کفن جلنے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر لوگ کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔ توبہ توبہ کرنے لگے۔ شیطانوں کو اپنا پیشوا بنانے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

دوسری طرف کوئل ریگتے ریگتے اسی مقام تک جا پہنچتی ہے، جہاں کرن جکڑی ہوئی تھی، بیہوشی کے عالم میں لیٹی ہوئی تھی۔ ویسی ہی بیہوشی والا عالم تھا اس پر کئی سانپ ناگ چلے ہوئے اس کے قریب پڑے تھے جو شاید اس کے جسم سے خونی زنجیریں کاٹنا چاہتے تھے لیکن اس کے جلتے جسم نے انہیں جلا کر راکھ بنا دیا تھا۔

یہاں بیٹھے بیٹھے جب اس نے جزیرے میں ایک آدمی کو چلتے پھرتے دیکھا، ہاتھ میں پکڑی بندوق دیکھی تو تڑپ اٹھی۔ وہ کیسے بچ گیا تھا، کیسے دریا کی ابھرتی ہوئی لہروں سے نکل کر جزیرے تک پہنچا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اسے محبوب کا خیال آیا کہ کہیں اس نے اس کے محبوب کو.....

اتنا خیال دماغ میں گھوما ہی تھا کہ اس نے دریا میں چھلانگ لگادی اور تیرتی ہوئی جزیرے تک پہنچی۔ جاتے ہی دور سے چھلانگ لگا کر اس کی گردن سے لٹک گئی۔ ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ اس چیخ کے ساتھ ہی جزیرے میں گولیوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ جزیرے میں گھومنے والا یہ شخص اکیلا نہ تھا بلکہ کئی لوگ وہاں موجود تھے۔ شاید کوئی کشتی بچ نکلی تھی اور جزیرے آگئی تھی۔

وہ شخص دوبارہ نہ چیخ سکا۔ تڑپتا رہا اور تڑپتے ہی نیچے زمین پر گرا۔ سات ہی کوئل نے اس کی گردن سے زہریلے دانت باہر نکالے اور جھاڑیوں میں جا چھپی۔ گولیوں کی آواز کے ساتھ آٹھ دس آدمی چیخنے والے آدمی کے پاس آئے اور سامنے مرے ہوئے منہ سے جھاگ بہانے والے ساتھی کو دیکھ کر تڑپ گئے۔ اسے دیکھتے ہی ایک شخص بولا میں تو کہتا ہوں یہاں سے بھاگ چلو کہیں ہم بھی.....

کیسے بھاگ چلیں، ہمیں جاگیردار وہاب کا حکم ہر حال میں پورا کرنا ہے۔ ان کا نمک کھایا ہے، نمک حرامی نہیں کرنی ہے۔ موت یہاں بھی ہے اور دوسرے کنارے بھی۔

اگر یہاں سے بھاگ کر دوسرے کنارے پہنچے تو جاگیردار وہاب اپنی بندوق کی

گولیوں سے ہمارے جسموں کو چھلنی کر دے گا۔

نمبردار نوادہ دریا میں ڈوب گیا ہے، ظالم ناگن نے کشتی میں بیٹھے نمبردار کو پانی سے چھلانگ لگا کر دبوچ لیا تھا۔ اگر وہ لڑکھڑاتا ہوا دریا میں نہ گرتا تو وہ ناگن ہمارے ہاتھوں سے کبھی نہ بچتی اور ہم اپنے مالک کو بھی بچا لیتے۔

وہ ناگن اسی جزیرے میں موجود ہے۔ اس نے ہی ہمارے ساتھی کو ڈسا ہے اسے ختم کرنا ہے۔ وہ زاہد کا بچہ بنجانے کون سے کونے میں جا چھپا ہے۔ ایک ایک کونہ چھان مارا ہے لیکن نظر نہیں آیا۔

یہ سنتے ہی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی کوئل نے ٹھنڈی سانس لی کہ اس کا محبوب مرا نہیں ہے زندہ ہے۔ گولیوں کی آوازیں بھی جزیرے میں گونجن رہی تھیں لگتا تھا کہ یہاں کے تمام ناگ سانپ یا تو بھاگ گئے تھے یا مر گئے تھے۔

کوئی ایک سانپ بھی دکھائی نہ دے پا رہا تھا۔ کوئل نے تو سوچا تھا کہ جاگیردار وہاب کی موت کے ساتھ یہ انتقامی جنگ ختم ہوگئی ہے لیکن لگتا تھا کہ ایسا نہیں ہے اس کے محبوب کی موت کے ساتھ ہی یہ جنگ ختم ہوگی کیونکہ ان لوگوں کی باتیں یہی کچھ بتاتی تھیں کہ زاہد کے گلے میں رسہ ڈال کر گاڑی کے پیچھے باندھ کر لے کر جاتا ہے۔ چلو بکھر جاؤ اس جزیرے میں ایک ایک کونہ چھان مارو ہو سکتا ہے کہیں نہ کہیں سے وہ مل جائے۔ رات گئے تک زاہد کی تلاش ہوتی رہی لیکن وہ انہیں نہ ملا۔ رات ہوتے ہی کوئل جھاڑیوں سے نکلی اور اپنے محبوب کی تلاش کرنے لگی۔ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کیلئے بھی تیار تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھی تھے اور بھڑکتی آگ بھی۔ اسے تو اس کا محبوب ایک عرصہ بعد ملا تھا۔ اگر وہ اسے دوبارہ جدائی دے گیا تو وہ کیسے جی پائے گی۔ کیسے اس کے بنا زندگی گزارے گی۔ تلاش کرتے کرتے ایک جگہ سے اسے پھر ان لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ سونا نہیں ہے جاگتے رہنا ہے کسی وقت بھی وہ ناگن ہمیں ڈس سکتی ہے، کسی وقت بھی وہ ہمیں نکل سکتی ہے۔ جب تک اس زاہد کے بچے کا کٹا ہوا سر لے کر گاؤں نہ گئے یہاں سے نہیں لوٹیں گے۔ لمبی لمبی مونچھوں والا ہر کسی کو ہدایات دے رہا تھا۔ اچھا تم لوگ سو جاؤ میں تمہارا پیہرہ دیتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے ان دونوں میں ایک نہ ایک ضرور چھپا ہوا باہر نکلے گا۔ اگر نہ بھی باہر نکلا تو بھوک سے خود ہی مر جائے گا۔ ہمیں تو صرف کٹا ہوا سر چاہئے۔ اتنا کہتے ہی نو آدمی سو گئے اور دسواں پیہرہ دینے لگا۔ ان کی حفاظت کرنے لگا۔ ابھی انہیں سوئے ایک گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ دور سے سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔

اس سرسراہٹ کی آواز کے ساتھ ہی وہ لمبی لمبی مونچھوں والا وہاں بھاگا اور جا کر گولیاں چلا دیں۔

گولیوں کی آواز سنتے ہی سوئے ہوئے آدمیوں سے کسی ایک کی آنکھ کھلی لیکن جلد ہی دوبارہ سو گیا۔ شاید تھکا ہوا تھا۔ اس لیے اٹھنا گوارا نہ کیا۔ گولیاں گونجتی رہیں جب اسے کچھ دکھائی نہ دیا تو واپس آیا اور دوبارہ اپنے سوئے ہوئے ساتھیوں کا پہرہ دینے لگا۔ رات گزر گئی صبح ہو گئی۔ روشنی پھوٹی ہی تھی کہ پہرہ دیتے ہوئے لمبی لمبی مونچھوں والے کے منہ سے ایک بھیاں نکلی۔ رات گئی اور ساتھ ہی بھاگ کھڑا ہوا کیونکہ سوئے ہوئے تمام ساتھیوں کے منہ سے زہریلی جھاگ بہہ رہی تھی وہ صرف سوئے نہ تھے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کر چکے تھے۔ نجانے کب سانپوں کی فوج نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔

کول تو بیچاری اپنے محبوب کی تلاش میں آنکھوں میں آنسو لیے جزیرے میں بھٹک رہی تھی۔ ایک لمحہ بھی محبوب کی تلاش میں کوتاہی نہ کی تھی۔

کبھی محبوب کی تلاش میں جزیرے میں ریگتی اور کبھی پانی پر تیرتی ہوئی دوسرے کنارے آتی۔ کرن کو دیکھتی کہ کہیں کسی عامل نے کرن کو جلا کر رکھ تو نہیں بنا دیا، کہیں ہمیشہ کے لیے اس سے دور تو نہیں کر دیا، لیکن جب اسے تسلی ہو جاتی تو واپس جزیرے بھاگ جاتی اور محبوب کی تلاش شروع کر دیتی۔ دن گزر گیا نہ اپنے محبوب کو ڈھونڈ پائی اور نہ ہی کرن ہوش میں آئی۔

آنکھوں میں آنسو لیے روتی رہی۔ رات ہو گئی تو چلے چلتے اس گہری کھائی میں جا پہنچی تھی جہاں کرن بیہوش کی حالت میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہاں جا کر دیکھا تو جھاڑیوں کے نیچے دبا ہوا محبوب دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ ناگن سے انسانی روپ میں آئی تمام جھاڑیوں کو اٹھا کر ایک طرف بھینکا، کانٹوں کے چھینے سے کے محبوب کا جسم خون میں بھیگا ہوا تھا جسے دیکھ کر وہ تو ترپ گئی۔ نجانے کیوں اپنے محبوب کی موت کا نقشہ اس کی نظروں سامنے گھوم گیا تھا، کیوں اسے مردہ سمجھنے لگی۔ پاگل پن گئی دیوانی بن گئی۔

وہ اسے جھنجھوڑنے لگی دل پر کان رکھا تو دھڑکن چل رہی تھی وہ مرا نہ تھا، سانس چل رہی تھیں۔ کرن کی طرح بیہوش پڑا تھا۔ اپنی موت دیکھ کر شاید خوف و ڈر سے بیہوش ہو گیا تھا۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اسے اس جزیرے میں پہنچانے والا کوئی نہیں ہے، اکیلا ہی ہے اور اکیلا آٹھ دس آدمیوں کا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا۔

اسے ہوش میں لانے کے لیے کول روتے ہوئے جھنجھوڑے جا رہی تھی لیکن وہ ویسے کا ویسے پڑا تھا۔ یہ ابھی اور بھاگتی ہوئی دریا کی طرف بڑھی تاکہ پانی اس پر پھینکے۔

دریا کی طرف بھاگتے دیکھ کر وہاں چھپے ہوئے آدمی نے دیکھا تو اسے ایسے لگا جیسے وہ بھی موت کے بنیوں میں آ گیا ہو کیونکہ اس نے کول کو پہچان لیا تھا۔ یہ شہزادی نہ تھی بلکہ ناگن تھی۔ جس نے اس کے ساتھیوں کو راتوں رات ہی ڈس لیا تھا اور اب اس کی باری تھی اور وہ اسے پکڑنے آرہی ہے۔

اس کی عقل میں یہ بات نہ آئی کہ گولی کے وار کر کے اسے ختم کر ڈالے بلکہ موت کا بھوت سر پر سوار کئے دریا میں چھلانگ لگا دی شاید خود کو زہریلے دانتوں سے بچانا چاہتا تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ اس کی موت جزیرے میں نہیں ہے بلکہ پانی میں ہے۔ اچھلتی لہروں میں ہے۔ لحوں میں ہی وہ پانی کی گہرائی میں جانے لگا۔

کول کی نظروں میں تو صرف بیہوش پڑے ہوئے محبوب کا چہرہ تھا۔ دریا کنارے پہنچ کر ہاتھوں میں پانی بھرا اور دوبارہ واپس بھاگ پڑی۔ یہ وہی منظر تھا جو زاہد کیا کرتا تھا۔ کرن کو بیہوشی کے عالم میں پڑی دیکھ کر منہ میں پانی ڈال کر لے جاتا تھا لیکن کول کو بار بار بھاگنا نہ پڑا منہ کا تمام پانی زاہد پر پڑا ہی تھا کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے کھڑی بیگنی آنکھوں میں کول کا چہرہ دیکھ کر یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کول یہاں سے بھاگ چلو وہ لوگ ختم کر دیں گے۔ زاہد شاید جانتا تھا کہ کول کو علم نہیں ہے کہ جزیرے میں دشمن چھپے بیٹھے ہیں۔ یہ سنتے ہی کول قہقہے لگانے لگی پھر ہاتھ پکڑے اسے لے کر بھاگنے لگی۔ ایک جگہ لیٹے ہوئے مرے ہوئے آدمیوں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

جان کول ان لوگوں سے خوفزدہ تھے ان لوگوں کی وجہ سے آپ کی آنکھوں میں خوف تھا، دیکھو ان کی طرف نہ ہاتھ ہلا سکتے ہیں نہ پاؤں بے جان ہو گئے ہیں، مردہ ہو گئے، بالکل ساکت ہو گئے ہیں۔

یہ دیکھو کول نے ساتھ ہی ایک آدمی کا بازو پکڑا جان یہ دیکھو ان کا جسم اکڑا ہے۔

ان کی موت دیکھ کر زاہد رویا بھی اور مسکرایا بھی۔

رویا تو اس لیے کہ یہ انسانی اموات تھیں۔ ان سے اس کی دشمنی نہ تھی اور مسکرایا اس لیے تھا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو شاید مالکوں کی فرمانبرداری نبھانے کی غرض سے اسے گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔

جان کوئل آپ کے تمام دشمن اس دنیا سے چلے گئے ہیں اب کوئی زندہ نہیں ہے۔
تمہاری مری بہنوں کا بدلہ میں نے لیا ہے، ایک ایک کو ڈس لیا ہے۔ اگر تمہارا پیار میری رگوں
میں نہ دوڑتا تو ہو سکتا تھا کہ میں کبھی انتقام نہ بنتی۔

کوئل، نمبردار جاگیردار زاہد نے دوبارہ بات دہرائی تو کوئل مسکرائی۔

جان میں نے خود انہیں ڈسا ہے خود ان کو ختم کیا ہے، ان دونوں کے علاوہ تمام
شیطانی علم والوں کو ختم کر دیا ہے۔ سانپوں، ناگوں نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک
ایک کو ڈس لیا ہے۔ لاشوں کی بھری گاڑی گاؤں گئی ہے۔ اب آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں
ہے۔

ویسے سر تاج اچھا ہوا آپ نے دوبارہ شیطانی علم نہ اپنایا۔ ان تمام شیطانی علم والوں
کے بدن سے جیسے کفن خود بخود جلنے لگے تھے۔ ہر دیکھنے والا توبہ توبہ کر رہا تھا۔

میں نے خود ان کی قبروں سے دھواں اٹھتے دیکھا ہے۔ ایسے جیسے ان کی قبروں میں
آگ لگی ہو۔ بھانبر بھڑک رہے ہوں ان کی قبروں کے قریب اگے درخت زرد پھیلے ہو گئے
ہیں۔ قبروں کی مٹی سیاہ ہو گئی ہے۔

یہ باتیں سن کر زاہد پاؤں سے سر تک کانپا، خدا سے شاید اس نے سچی توبہ کر لی تھی۔
تبھی تو خواب میں ہر چیز ہر منظر دیکھ لیا تھا۔

زاہد خوفزدہ کھڑا تھا کہ کوئل بولی سر تاج وہ کرن جکڑی ہوئی ہے، اسے بچانا ہے، اسے
بھی اپنے ساتھ ملانا ہے۔ اس وعدے کو نبھانا ہے کہ ایک ساتھ جیئیں گئے، ایک ساتھ مریں گے
چلو چلیں۔ انہیں بزرگ کے پاس ایک مرتبہ پھر ان سے کرن کی زندگی کی بھیک مانگتے ہیں۔ خدا
نے انہیں اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر کرن کو خونی زنجیروں سے آزاد کرا دیں
گے۔ چلیں سر تاج کرن کو بچانا ہے۔ چلیں سر تاج۔

زاہد نجانے کیوں صرف کوئل کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا شاید اس کی تمام زندگی نظروں
کے سامنے گھوم رہی تھی۔ وہ منظر یاد آ رہا تھا جب وہ بل کے سامنے منہ رکھے کہہ رہا تھا۔ اے
ناگ میرے دوست باہر مجھے دشمن نہ سمجھ میں تیرا احسان مند ہوں۔

اور جب وہ باہر نکلا تھا تو اس نے کہا تھا میرے دوست میں تمہا ہوں، بہنوں کا بدلہ
نہیں لے سکتا، ان کو مارنے والے بہت اونچے لوگ ہیں اور میں اکیلا ہوں، شیطانی علم اپنا کر
بدلا لینا چاہا لیکن پھر بھی خود کو محفوظ نہ سمجھا اور اس ناگ نے دم کے بل کھڑے ہو کر شاید یہی کہا

تھا کہ میرے محبوب تم اکیلے نہیں ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارے تمام دشمنوں کو ایک ایک
کر کے ڈس لوں گا، ختم کر دوں گا۔ اب وہی منظر اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

کوئل نے ان الفاظ کو سچ کر دکھایا تھا۔ یہ ایک فرشتہ بن کر سامنے آئی تھی۔

”کیا دیکھ رہے ہیں سر تاج۔“ کوئل شرما سی گئی۔

کوئل میں نے تمہارا انتخاب کر کے غلطی نہیں کی تھی۔ مجھے فخر ہے تم پر تم نے صرف
اپنے پیار کو ہی نہیں بچایا بلکہ اس کی بڑبڑی ہوئی زندگی کو پرسکون بنا دیا ہے۔

کوئل خدا تعالیٰ واقعی اکڑی گردنوں والوں کو زمین پر اکڑا کر چلنے والوں کو پسند نہیں
کرتا جو دوسروں کو معمولی انسان سمجھیں، ان سے جو چاہیں سلوک کریں یہ پسند نہیں فرماتا اور کسی
نہ کسی کو اس ظلم کو ختم کرنے کے لیے ضرور بھیجتا ہے۔

ایسا شروع سے چلتا آیا ہے۔ کوئل تم بھی ایک فرشتہ بن کر آئی ہو تم نے وہ کام کر
دکھایا جو شاید میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ آج ذہن پرسکون ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ میں آزاد ہو گیا
ہوں۔ دشمنوں سے پاک ہو گیا ہوں۔ اب کوئل مجھے ان آتش آتکھوں کی ضرورت نہیں ہے،
اب میری کسی سے دشمنی نہیں ہے، مجھے صرف تمہارا پیار چاہئے، کرن کا ساتھ چاہئے۔

کرن کا نام منہ پر آتے ہی بولا چلو کوئل جلد کرو ان بزرگ کے پاس چلیں، اسے بھی
آزاد کرائیں، پھر ہندوستان کی اس سر زمین پر ایک نیا گلشن بنائیں گے، جہاں بہاریں ہی
بہاریں ہوں گی، مسکرائیں ہی مسکرائیں ہوں گی، مہکیں ہی مہکیں ہوں گی۔ چلو دریا کے دوسرے
کنارے چلتے ہیں۔

یہ کہہ کر دونوں دریا کنارے آئے۔

کوئل ناگن بنی زاہد نے اسے مضبوطی سے پکڑا اور تیرتا ہوا موجوں کو چیرتا ہوا
دوسرے کنارے آیا

کرن بیہوشی کے عالم میں زنجیروں میں جکڑی ہوئی خون میں لت پت پڑی تھی
کرن کو دیکھ کر دونوں کی آنکھیں بھل گئیں۔ کافی دیر تک اسے دیکھتے رہے۔

کرن تمہارے جسم پر جکڑے ہوئے یہ خونی زنجیر بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔ ہم جا
رہے ہیں تمہیں آزاد کرانے یہ کہتے ہی دونوں اسی بزرگ کی تلاش میں اس مقام تک پہنچنے کے
لیے چل پڑے۔ فضاؤں میں دونوں کے حق تعالیٰ کو بخ رہے تھے۔

دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لیوں پر مسکرائیں بکھیرے بھاگے جا رہے تھے۔ اب

کرن کو جلا دے گا، آگ لگا دے گا، اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم دونوں سے جدا کر دے گا۔“
کول نے نجانے کیوں تم دونوں کے بغیر خود کو ادھورا سمجھتا ہوں۔ جب تم دکھائی نہیں دیتی ہو تب بھی
پاگل ہو جاتا ہوں اور جب کرن جدا ہوتی ہے تب بھی ٹوٹ جاتا ہوں۔ تم دونوں نے ہی تو
میری زندگی کی حفاظت کرنی ہے، تم دونوں نے ہی تو میرے خاندان کا انتقام لیا ہے۔

”ہاں جان آپ سچ کہتے ہیں۔ کرن کی زندگی کو واقعی خطرہ ہے۔ صبح ہوتی ہے تو
دوبارہ بزرگ تلاش کرتے ہیں۔ آپ آرام کریں دیکھیں کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی ایک لمحہ بھی
آپ کی زندگی کو سکون نہیں ملا۔ نجانے کب تک ایسا چلتا رہے گا، کب تک ہم لوگ پریشانوں،
انجھنوں، دکھوں میں الجھے رہیں گے۔“

کول بولے جا رہی تھی اور زاہد آنکھیں بند کئے نجانے اپنی شہزادیوں کے بارے
میں سوچتے سوچتے سو گیا۔

کول نے اپنے دکھی شہزادے کے ماتھے پر بوسہ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں
ہی اس ویرانے میں سو گئے۔ صبح ہوئی تو زاہد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کول پہلے سے بیدار تھی وہ سوئی
ہی نہ تھی۔ پوری رات اپنے محبوب کی نگرانی کرتی رہی تھی۔ اٹھتے ہی کول کو زاہد کی بھیگی آنکھیں
دکھائی دیں۔

”کیا ہوا سرتاج آپ کی آنکھوں میں آنسو۔“

”کول بڑا بھیا تک خواب دیکھا ہے۔ کوئی تمہیں مجھ سے چھین کر لے گیا ہے اور
میری آنکھوں کے سامنے ہی تمہیں کلباڑیوں سے چھلنی کر دیا ہے۔ کول تم میرے سامنے تڑپتی
رہیں، چینی چلاتی رہیں اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ کول اس ذلیل نے پھر تیرا سر کاٹا اور تیرے جسم
پر کلباڑیوں کے پے در پے وار کر کے قیہ بنانے لگا۔“

یہ سن کر کول مسکرائی۔ ”اچھا ہے نا آپ کی وجہ سے میں ٹکڑے ٹکڑے ہوتی ہوں۔“
خدا آپ کا خواب سچا کرے۔ میں تو خود چاہتی ہوں کہ آپ کے سامنے مروں، آپ کے
ہاتھوں میں آخری سانس لوں اور آپ مجھے اٹھا کر دور بہت دور لے جائیں۔ کول مسکراتے
ہوئے بولے جا رہی تھی لیکن زاہد نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیئے، نہیں کول تمہیں مجھ سے
کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں ختم کر دوں گا، جلا ڈالوں گا سبھی کو، کول یہاں سے بھاگ چلیں دور،
بہت دور بھاگ جائیں۔ آؤ کرن سے کہتے ہیں کہ ہمیں اڑا کر لے جائے دور بہت دور لیکن
کرن تو خود بے بس ہے زخموں سے چور ہے، خون میں لت پت ہے، چلو کول بزرگ کو

ان راہوں سے انہیں کسی قسم کا خوف نہ آ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ آزاد ماحول میں گھوم رہے
ہوں۔ بھاگتے بھاگتے بہت دور نکل گئے۔ بزرگ کو تلاش کرتے رہے لیکن وہ بزرگ اپنی جگہ
چھوڑ چکے تھے۔

وہ ٹھکانہ بالکل خالی اور ویران پڑا تھا۔ ایسے جیسے صدیوں سے یہاں کوئی آباد نہ ہوا
ہو۔ یہ دیکھتے ہی ان دونوں کے چہرے اتر گئے۔ اس پاس دیکھا لیکن کچھ دکھائی نہ دیا۔

زاہد جان مجھے کرن کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے اس کے بنا دل کی
دنیا اجاڑ ہو لیکن نجانے زاہد کن خیالات میں گم تھا۔

”جان کہاں کھوئے ہوئے ہو۔“ کول کی بات نے زاہد کو چونکا کر رکھ دیا۔

کول آج خود کو ایسے محسوس کر رہا ہوں جیسے بالکل آزاد ہوں۔ کھلی فضاؤں میں بنا
خوف کے گھوم رہا ہوں اور کول یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے مجھے خرید لیا ہے۔ میرے
پیار کو خرید لیا ہے۔

زاہد جذباتی ہو گیا۔ کول کے ہاتھوں کو پکڑ لیا اور بوسوں کی بو چھڑا کر ڈالی۔ آنکھیں
خوشی سے چمک پڑیں۔ تم نے کول اپنا کیا وعدہ نبھا دیا ہے اور میں نے تمہیں کیا دیا، کچھ بھی
نہیں۔ جدائی دی تھی، تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اگر خدا نا خواستہ اس روز کرن تم کو نہ بچاتی تو
وہ گاڑی آپ کے ٹکڑے کر جاتی اور میں کیسے جی پاتا اودہ جان بچھلی باتوں کو بھول جاؤ۔

جانتی ہوں کہ آپ کے بنا میری دنیا اندھیر ہے۔ میں ادھوری ہوں، کچھ بھی نہیں
ہوں، آپ کے دم سے زندہ ہوں۔ اب کرن آزاد ہوتی ہے تو یہاں سے دور چلے جائیں گے۔
ایسی جگہ جہاں پر فریب نظارے ہوں، مہکتی بہاریں ہوں۔ میں آپ کے دل سے اس
ہندوستانی جگہوں کی تمام یادیں ختم کر دینا چاہتی ہوں۔

”ہاں کول میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ ان راہوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا
چاہتا ہوں۔“ باتیں کرتے کرتے دونوں بہت دور نکل گئے لیکن بزرگ کا کوئی ٹھکانہ دکھائی نہ
دیا۔

”اب کہاں جائیں کہاں سے بزرگ کو تلاش کریں تھک گیا ہوں۔“ چلے چلتے زاہد
نے ایک جگہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

”وہ بچاری نجانے کس حال میں ہوگی۔ ہوش میں آئی ہوگی یا نہیں۔“

”کول کوئی علم والا دریا کنارے پہنچ گیا نہ جائے۔ اگر کوئی وہاں پہنچ گیا تو جکڑی

چلتے چلتے جب قریب آیا تو یہ دونوں ادب سے کھڑے ہو گئے۔ سرخ آنکھوں سے اس نے ان دونوں کو دیکھا۔

گرو بابا کی جے ہو گرو بابا کا نام سنتے ہی زاہد کو پختہ یقین ہو گیا کہ یہ شخص ان کا کام لہوں میں کردے گا تب اپنا مدعا بیان کیا۔

بابا جی ہم مصیبت کے مارے بہت مشکل سے آپ تک پہنچے ہیں اور پھر اپنی اور کرن کی تمام کہانی سنا ڈالی۔ کرن کی خوبصورتی کے متعلق سن کر گرو بابا قہقہے لگانے لگا۔

اتنی حسین شہزادی اور اسے آزاد کر کے تمہارے حوالے کر دیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بہت مشکل سے یہ منتر حاصل کیا ہے۔ پورے 41 دن رخسار باندھ کر ایک پاؤں پر رات بھر کھڑا رہا ہوں تب اس مقام تک پہنچا ہوں قہقہے لگائے جانے لگے۔ میں دیکھوں تو تیری شہزادی کو کتنا حسن ہے اس پر چلو میرے ساتھ دریا کنارے کہاں بندھی ہوئی ہے وہ کہاں جکڑی ہوئی ہے۔

دونوں بابا کے ساتھ چلنے لگے تو بابا بولا۔ ”میں اتنی دور دریا کنارے کیوں جاؤں میرے پاس بہت بڑا منتر ہے لہوں میں اسے یہاں کھینچ لاتا ہوں۔ دیکھنا میرے منتر کی طاقت۔“

جے ہو گرو بابا کی جے ہو کہتے ہوئے بلند آواز میں وہی منتر پڑا جس کا چلا کاٹا تھا یہ پڑھ کر پھونک ماری بیہوش شہزادی کنارے سے اڑتی ہوئی سامنے آگئی ویسی کی ویسی حالت تھی۔ زنجیروں سے جکڑنے سے خون ویسے کا دیا بہہ رہا تھا۔ بیہوش پڑی تھی۔

”بابا جی دیکھو اس کی حالت ختم ہو رہی ہے اس کی زندگی بچا لو اس کو بابا جی ہوش میں لاؤ اسے آزاد کر دو۔“ زاہد منت سماجت کرنے لگا۔

”کیسے آزاد کر دوں اب یہ میرے قبضہ میں ہے اسے آزاد کروں یا اپنے پاس رکھوں مجھے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ میں راجہ ہوں راجہ جو چاہوں کر سکتا ہوں۔“ جے ہو گرو بابا کی جے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اب کبھی بھی اس شہزادی کا نام زبان پر نہ لانا ورنہ تمہیں بھی جلا دوں گا۔

بزرگ دھمکی خیز لہجے میں بولا تو زاہد غصہ میں آ گیا۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ بابا خونزدہ ہو کر لرزنے لگا، جلتی آنکھوں کا نشانہ بن گیا۔ اپنے ہوش کھو بیٹھا اور سیدھا زاہد کی نظروں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اس باجے کا جسم جلنے لگا، چمڑا جسم سے

ڈھونڈیں۔ نجانے کیوں مجھے خوف آنے لگا ہے ان جگہوں سے ان دیرانوں سے کوئل میرے ساتھ رہو ایک لمحہ بھی دور نہ ہونا کہیں میرا خواب سچ نہ ہو جائے کہیں وہ لوگ تمہارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیں مجھ سے چھین کر نہ لے جائیں۔

کوئل زاہد کی نظروں میں اپنے لیے بھرپور پیار دیکھ کر مسکرا دی۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ اس کا محبوب اسے اس قدر چاہتا ہے۔

زاہد کوئل کو اپنی حفاظت میں لیے ہر طرف دیکھتے ہوئے چلتا رہا، بزرگ کو تلاش کرتا رہا۔ آخر دور سے ایک جگہ انہیں ایک لگا ہوا خیمہ دکھائی دیا تو دونوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ کرن کی آزادی کا خیال اور اس کا معصوم چہرہ نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ دونوں اس دور جنگلات میں لگے خیمے کی طرف بھاگنے لگے وہ کرن کے آزاد ہوتے ہی یہاں سے بہت دور چلے جانا چاہتے تھے بہت دور جا کر ایک نئی دنیا بسانا چاہتے تھے۔

خیمے کے قریب پہنچے تو وہاں کوئی بزرگ بھی دکھائی نہ دیا۔ سامان وغیرہ دیکھ کر سمجھ گئے کہ بزرگ یہیں کہیں گئے ہوں گے۔ انتظار کر لیتے ہیں لہذا خیمے کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

نجانے زاہد کوئل کے چہرے پہ کیا چیز تلاش کرنے لگا بار بار اسے دیکھتا اور وہ شرم سے سٹی جانے لگی تھی۔

”سرتاج آپ کا یوں دیکھنا میرے اندر ہلچل برپا کئے ہوئے ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ میں اپنے ہی پسینے میں ڈوب مروں گی۔“

کوئل کی یہ باتیں سنتے ہی زاہد زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ ان قہقہوں کی آوازیں پورے دیرانے میں گونجنے لگیں۔

کوئل شرم سے بھاگ گئی اور زاہد اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ دونوں میں ایک مرتبہ پھر آنکھ پھولی شروع ہو گئی۔ پرانی کہانی دوبارہ دہرائی جانے لگی۔

کوئل زاہد کے ہاتھوں میں آتے آتے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی اور زاہد مسکراتے ہوئے قہقہے لگاتے ہوئے دوبارہ پکڑنے کی کوشش کرتا۔ تھک ہار کر زاہد ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور دور کھڑی کوئل کو گھورنے لگا جیسے آج وہ اسے قابو کر کے ہی رہے گا، پکڑ کر ہی رہے گا۔ اتنے میں دور سے ایک سیاہ رنگت والا نکھرے بالوں والا آدمی خیمہ کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا اسے دیکھنے کے بعد زاہد نے حساب لگا لیا کہ یہ شیطانی علم رکھتا ہوگا کیونکہ شیطانی علم والے ہی ایسے طعنے میں ہوتے ہیں۔

میں چلنے والی سانسیں رکی ہوئی تھیں، دل کی دھڑکنیں بند تھیں جسم کی طرح دھڑکنیں بھی ساکت تھیں۔ روتے ہوئے کوئل کو جھنجھوڑے جا رہا تھا۔

کوئل اٹھو خدا کے لیے اٹھو کیوں خاموش ہو گئی ہو، کیوں اپنے لبوں کو سی لیا ہے، کیوں اپنے محبوب سے بات نہیں کر رہی ہو، کیوں اپنے جسم کو حرکت نہیں دے رہی ہو۔ اٹھو کوئل تم میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتیں نا، اب دیکھو یہ آنکھیں برس رہی ہیں۔ خدا کے لیے کوئل مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ میرا ساتھ نہ چھوڑو ساتھ ہی کوئل کے جسم سے تین گولیاں باہر نکالیں۔

کوئل کو اٹھائے زاہد روتا ہوا کرن کے پاس آیا کرن خدا کے لیے آنکھیں کھولو یہ دیکھو کوئل تیرے سامنے خون میں بھیگی ہوئی پڑی ہوئی ہے۔ کرن یہ کوئل ہے جس نے مجھے بچاتے ہوئے اپنا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے۔ کرن خدا کے لیے ہوش میں آؤ میں اکیلا رہ گیا ہوں، تنہا رہ گیا ہوں، ادھورا رہ گیا ہوں، ٹوٹ گیا ہوں۔

کوئل خدا کے لیے آنکھیں کھولو کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ کوئل مری نہ تھی، ان کی زندگی سے دور نہ تھی، ہلکے ہلکے سانس لے رہی تھی جس کی آواز زاہد سن نہ پا رہا تھا۔ شاید وہ کوئل کی جدائی میں حواس کھو بیٹھا تھا، یکدم کے صدمے سے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

کوئل کے دو بچے کو پھاڑ کر ان تینوں زخموں پر پیٹوں کی صورت میں باندھ دیا تاکہ اس کے جسم سے بہنے والے خون کو روک سکے۔ لیکن کوئل کی سانسیں ایسے چل رہی تھیں جیسے آخری سانس ہوں۔ زندگی سے دور تھی اور موت کے قریب۔ زاہد بار بار کان لگا کر اس کی سانسوں کی آوازیں سنتا رو کر خدا سے اس کی زندگی کی دعائیں کرتا۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا لیکن نہ تو کوئل آنکھیں کھول رہی تھی اور نہ ہی ہوش میں آ رہی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ اب وہ لوگ دوبارہ آئیں گے اور اسے بھی ختم کر دیں گے لہذا وہ خیمہ میں گھسا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خیمہ کے نیچے بہت بڑا گڑھا جس پر لکڑی کے پھٹے رکھ کر خیمہ بنایا گیا تھا اور یہ گڑھا تہہ خانے کا کام دیتا تھا۔ ایک پھٹا اٹھا کر نیچے دیکھا تو بدبو کا ایک جھونکا اس کے جسم میں جا گھسا لیکن یہ ایک اچھی جگہ تھی چھپنے کے لیے اس نے کوئل کو اٹھایا اور اس تہہ خانے میں لے گیا اور خود بھی بدبو دار کمرے میں بیٹھا رہا۔ وہاں ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔

رات ہو گئی لیکن وہاں دوبارہ کوئی نہ آیا وہ باہر نکلا، آنکھیں برس رہی تھیں، کوئل کی

علحدہ ہو کر زمین پر گرنے لگا۔ لحوں میں ہی بابا پھلتے پھلتے بڈیوں کا سانچہ بنے گا تو زاہد چیخا۔

”تو قبضہ کرنا چاہتا ہے میری کرن پر، تو راجہ ہے یا میں دیکھ لیا تو نے اپنا انجام۔ کیسے چھین سکتے ہو تم مجھ سے میری کرن کو، کیسے جدا کر سکتے ہو ہم تینوں کو بھون کر رکھ دوں گا، جلا کر رکھ دوں گا۔“ زاہد کی چیخ کے ساتھ ہی ایک اور چیخ بلند ہوئی۔ یہ چیخ کسی انسان کی نہ تھی بندوق کی گولی کی تھی۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری۔ گولیاں چلنا شروع ہو گئیں۔ فضا میں گونجتی گولیوں کی آوازیں سن کر یہ دونوں سہم گئے کیونکہ یہ تو تمام دشمنوں کو ختم کر چکے تھے، انہیں کیا علم تھا کہ دشمنوں سے یہ تمام جگہ بھری ہوئی ہے۔

کوئل بھاگ کے زاہد کے قریب ہو گئی وہ اسے مرنے نہیں دینا چاہتی تھی اس کی حفاظت کرنے لگی۔ زاہد جان بھاگ جاؤ، چھپ جاؤ، میں منٹ لوں گی ان سب سے، زاہد جان بھاگ جاؤ کیونکہ کوئل کو علم ہو چکا تھا کہ نشانے پر زاہد ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئل کے ہوتے ہوئے کوئی دشمن زاہد پر وار کرتا۔ وہ اپنے محبوب کو بچانے کی غرض سے اس کے سامنے دیوار بنے کھڑی تھی۔ زاہد کو خراش تک نہ آئی۔

زاہد جان بھاگ جائیں، دور بھاگ جائیں۔ زاہد کے ساتھ لگی کوئل اسے بھاگ جانے کو کہہ رہی تھی۔ زندگی بچانے کو کہہ رہی تھی۔ خود بڑبڑ رہی تھی، خون سے بھیگ رہی تھی لیکن اپنے محبوب کی زندگی کی فکر لیے بیٹھی تھی۔

گولیاں ایک ہی بندوق سے برسی تھیں۔ گولیاں برسائے والا سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ سیاہ نقاب میں اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔ کپڑے مردانہ نہ تھے، کوئی عورت تھی، کوئی دشمن نہ تھی جو وار کر رہی تھی۔

کوئل نے اپنے محبوب کو بچانے کی غرض سے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ محبوب کی جگہ اپنا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

زاہد بھی اپنی زندگی کی پروا کئے بغیر اس طرف بھاگنے لگا، اسے لٹکانے لگا لیکن تیز بھاگتے ہوئے سفید گھوڑے کو پکڑ نہ سکا۔ اس کے سوار کو جلانہ سکا، پگھلا نہ سکا۔ واپس بھاگتا ہوا آیا سامنے زمین پر لیٹی ہوئی کوئل کو خون میں لت پت دیکھا جو آنکھیں کھولے فضاؤں کو گھور رہی تھی شاید اپنے محبوب کا انتظار کر رہی تھی، اپنے محبوب کی واپسی کی راہیں دیکھ رہی تھی وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اسے لگا جیسے کوئل اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ جسم بے حرکت تھا، بے جان تھا، جسم

”وہ کرن! ہاں ہاں جان کرن کیسی ہے۔“

”ویسی کی ویسی ہے ذرا بھی ہوش نہیں آ رہا ہے۔ میں اسے آزاد..... کرالوں گا اور

پھر یہاں سے چلے جائیں گے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دور بہت دور۔“

زاہد جانتا تھا کہ وہ لوگ کرن کو اور اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ کوئل کو پہلے ہی مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ اس کا خیال درست تھا۔ تیز بھاگتے گھوڑوں کی آوازیں تہہ خانے میں بیٹھے زاہد کے کانوں کو سنائی دینے لگیں جو قریب سے قریب تر آتی رہیں۔

خیمہ کے پاس آ کر سبھی لوگ رک گئے، بکھرا ہوا خون دیکھ کر ایک شخص بولا ”یہاں کھڑے تھے وہ دونوں۔ ناگن تو یقیناً گولیوں سے چھلنی ہوگئی ہوگی، مرگئی ہوگی لیکن وہ زاہد کا بچہ بھاگ نکلا۔“

مہارانی کا حکم ہے کہ زاہد کو ہر حال میں پکڑنا ہے اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے ہیں، گاؤں والوں میں بوٹیاں تقسیم کرنی ہیں تاکہ وہ چلوں میں جلائیں۔ دیکھا ہے ہے کتنی لاشیں دفن کرنی پڑی ہیں۔

مہارانی کی باتیں سن کر آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے کہ حویلیوں والوں نے اپنی جانوں کے نذرانے دے کر گاؤں والوں کو بچایا ہے۔

واقعی ایسا ہی ہوا ہے۔ دیکھا ہے دونوں حویلیاں خالی ہوگئی ہیں، صرف وہ ہماری خاطر مرے ہیں۔ اب ہمیں مہارانی کا ہر حال میں حکم ماننا ہے۔ ان حویلیوں کو سنسان ویران نہیں ہونے دیتا۔

میری گھر والی بتا رہی تھی کہ مہارانی جاگیر دار حیات کے بیٹے کو جنم دینے والی ہے اور وہ راج کرے گا ان حویلیوں میں۔ یہ حویلیاں کبھی سنسان نہ ہوں گی۔ گاؤں والوں کی خاطر حویلی والے اپنی جانوں کا نذرانہ دیتے رہیں گے اور یہ چڑیل کم بخت اسے گولی لگنے کا اثر نہیں ہوتا۔ کل کتنی گولیاں اتاری تھیں اس کے جسم میں تمام کی تمام گولیاں ہوا کی طرح اس کے جسم سے دوسری طرف اڑتی رہی ہیں۔

یار مجھے تو لگتا ہے کہ یہ ویسے ہی مرچکی ہے نہ ہلتی ہے نہ سانس لیتی ہے نہ جسم کو حرکت دیتی ہے۔

مری نہیں ہے۔ اگر مرنی تو اس کے جسم سے خون کیوں بہتا۔ دیکھو ابھی بھی اس کے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ مہارانی کا حکم ہے کہ چڑیل پر گولی نہیں چلائی کیونکہ وہ صرف علم

مسکراہٹیں، نیلی آنکھیں، حسین کھڑا آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ کوئل تجھ پر وار کرنے والوں سے میں بدلہ لوں گا۔ ایک ایک سے بدلہ لوں گا۔ گاؤں کے گاؤں جلا کر راکھ کر دوں گا۔ پھر کرن کے پاس آیا اسے جھنجھوڑنے لگا۔ ”کرن خدا کے لیے آنکھیں کھولو دیکھو پورا جسم خون میں بیگا ہوا ہے۔ کوئل نہ بولتی ہے نہ دیکھتی ہے ہلکی ہلکی سانس لے رہی ہے تیری طرح بیہوش پڑی ہے۔ جگہ جگہ سے چھلنی ہوئی ہے دیکھ لو کرن لیکن کرن تو ویسی کی ویسی بیہوش پڑی تھی۔ کوئل میں انتقام لوں گا عبرت ناک انتقام۔ تم نے اپنے پیار کا حق ادا کر دیا ہے اب میں تمہاری محبت کا حق ادا کروں گا ترسا ترسا کر ماروں گا تمام دشمنوں کو۔ خوب جی بھر کر رویا۔

”کرن دیکھو..... کوئل ہمارا ساتھ چھوڑ رہی ہے ہم سے روٹھ رہی ہے۔ مجھے بچاتے بچاتے خود مر رہی ہے لیکن میں اسے نہیں مرنے دوں گا۔ کرن تم نے بدلہ لینا ہے، کرن کے زخمی ہونے کا اب کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑنا۔“ صبح ہوگئی تو صبح سویرے ہی اس تہہ خانے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

کوئل کی سانسیں چل رہی تھیں، پلکیں مل رہی تھیں یہ دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔ خدا سے رورو کر مانگنے والی دعاؤں نے اثر دکھا دیا تھا۔ کوئل آنکھیں کھولو دیکھ تیرا زاہد تیرا پیار تیرے سامنے بیٹھا ہے تیرا پیار تجھے پکا رہا ہے میرا ساتھ نہ چھوڑو ورنہ میں مرجاؤں گا، بکھر جاؤں گا اکیلا رہ جاؤں گا۔ تم دونوں ہی تو میری زندگیاں ہو اور تم دونوں ہی مجھ سے بات نہیں کرتی ہو۔

کوئل زاہد کے زور زور سے چلانے کی آوازیں سن کر ہوش میں آ گئی۔ آنکھیں کھولیں سامنے محبوب کو دیکھ کر پھٹکی سی مسکراہٹ مسکرائی۔

”سرتاج آپ ٹھیک تو ہیں آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔“

”نہیں کوئل میں بالکل ٹھیک ہوں یہ کیا کر دیا تم نے کوئل! اپنا جسم چھلنی کر دیا۔“ زاہد رو دیا۔

زخمی کوئل نے زاہد کے ہاتھ پکڑ لیے۔ ”جان یہ کوئل تو صرف آپ کے لیے ہی بنی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی آپ کو زخم دے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں آپ کے لیے اپنی جان تک قربان کر دوں۔“

زاہد نے کوئل کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ ”کوئل مجھے تیری ضرورت ہے تیرے پیار کی ضرورت ہے۔“

ان کے چہرے بتاتے تھے کہ وہ بہت خوش ہیں کیونکہ حویلی کے مالک نے حویلی میں آنکھ کھول دی تھی۔

جاگیردار حیات کا بیٹا جاگیردار جابر حیات پیدا ہو چکا تھا اور اس وجہ سے گاؤں میں جشن کا سماں تھا۔ مہارانی کا حکم تھا کہ حویلیوں والوں کے مرنے پر رویا نہ جائے کیونکہ گاؤں والوں کی خاطر ایک ایک کر کے جان کا نذرانہ دیتے گئے ہیں۔ اب وقت جابر حیات کا آنے والا تھا۔ گاؤں کی تمام عورتوں نے اسے اپنا نیا مالک تسلیم کر لیا تھا اور گاؤں کے مرد گاؤں میں جاگیردار جابر حیات کے نعرے لگاتے رہے تھے۔

ان لوگوں کو دیکھ کر کرن قہقہے لگائے جا رہی تھی۔ ”ایک ایک کر کے تم لوگوں کو ختم کروں گی۔“

”زندہ بچو گی تو مارو گی، اب تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے تم تینوں نے جو کرنا تھا کر لیا اب گاؤں والوں کی باری ہے۔“

مہارانی کا حکم تھا کہ جابر حیات کی پیدائش کی خوشی میں کسی کو قتل نہ کیا جائے ورنہ تمہیں کب کا دھوئیں میں اڑا چکے ہوتے۔ پیچھے گاڑی میں بابا آ رہا ہے۔ لمحوں میں ہی تیرا جلتا جسم ہم دیکھیں گے۔ پہلے تیرے حسن کو بھیا نک بنائیں گے پھر تجھے دھوئیں میں بکھرتے دیکھیں گے۔ بتا تیرا محبوب کہاں ہے، کہاں چھپا رکھا ہے اسے۔

انہیں تم لوگوں نے غائب کیا ہے۔ کرن نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ اگر یہاں ہوتا تو تم سب کو جلا پگھلا کر رکھ دیتا۔ تمہارے جسموں کی کھال اتار دیتا۔ تمہاری ان لمبی لمبی زبانوں کو کاٹ دیتا۔

خاموش رہو ملازم خاص نے آگے بڑھتے ہوئے حسین شہزادی کے بالوں کو پکڑ لیا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق کے بٹ اسے مارنے لگا لیکن وہ ذرا خونزدہ نہ ہوئی ذرا نہ ڈری بلکہ قہقہے لگانے لگی۔

”حرامیو صرف مجھے آزاد ہو لینے دو پھر دیکھنا کیسا طوفان برپا کرتی ہوں، کیسے تمہارے جسموں کو نوچتی ہوں۔ زندہ آگ لگا دوں گی، تڑپا تڑپا کر ماروں گی۔“

کول اور زاہد خیمے میں یہ تمام باتیں سن رہے تھے۔

کول کے اندر ایک پلپل مچی ہوئی تھی اب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ کرن پر ڈھائے جانے والے اس ظلم کا بدلہ لینے کو تیار ہو گئی تھی لیکن خود پر کنٹرول رکھا۔ اپنے آپ کو

سے مرے گی، جلے گی۔ دھواں بنے گی۔

کچھ آدمی شہر گئے ہوئے ہیں علم والوں کو لانے کیلئے۔ یہاں جھونپڑی میں بابا رہتا تھا وہ بھی کافی دنوں سے نظر نہیں آ رہا ہے۔ نجانے کدھر چلا گیا۔ اتنا کہہ کر ایک شخص خیمے میں گھسنے لگا تو دوسرا بولا

خیمہ کو ہاتھ نہ لگانا سنا نہیں وہ بابا کہتا تھا کہ جس نے اس کے خیمے کو ہاتھ لگایا اس کے ہاتھوں کو جلا دوں گا۔ پیچھے ہو جاؤ، چلو اسے تلاش کرو وہ حرام زادہ یہی کہیں چھپا بیٹھا ہے۔

زاہد تہہ خانے میں بیٹھا تمام باتیں سنتا رہا۔ کچھ حوصلہ ہوا کہ ایک تو کرن گولیوں سے مر نہیں سکتی اور دوسرا یہ تہہ خانہ محفوظ ہے یہاں کوئی گھس نہیں سکتا۔ لہذا وہ لوگ تلاش کرتے کرتے واپس لوٹ گئے۔

ایک ہفتہ اس طرح گزر گیا۔ اس دوران کرن ہوش میں آ گئی۔ اپنے سامنے زاہد کو دیکھ کر زیر لب مسکرائی تو زاہد چیخ چیخ کر رو پڑا۔

”کرن ان ظالموں نے کول کو زخمی کر دیا ہے، گولیوں سے اس کے جسم کو چھلنی کر دیا ہے، یہ دیکھو اس کے جسم کا خون ابھی تک میرے ہاتھوں پہ جما ہوا ہے اور میں اس وقت تک اس خون کو صاف نہیں کروں گا جب تک تمام دشمنوں کو آگ نہیں لگا دوں گا۔“

کرن وہ جاگیردار حیات کی بیوی بن چکی تھی اس نے حویلی والوں کا انتقام لینا شروع کر دیا ہے۔ پتہ چلا ہے کہ وہ تمہیں اور مجھے ختم کرنا چاہتے ہیں، ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔ کول کو وہ مردہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ میں بستیوں پر حملہ کر دوں گا، بستیوں کی بستیاں اجاڑ دوں گا، خون کی نہریں چلا دوں گا۔

کول کے زخمی ہونے کی خبر سن کر کرن جکڑی ہوئی رو دی۔

زاہد جان صرف ایک بار مجھے آزاد کرادو پھر دیکھنا کیسے تباہیاں مچاتی ہوں میں۔

لوں کی کول بہن کا بدلا، کتنی بے بس تھی میں کہ اسے زخمی ہونے سے بچا بھی نہ سکی۔ نجانے کتنا تڑپا ہو گیا وہ۔

ایک دن کرن ہوش میں تھی کہ دور سے بھاگتے ہوئے گھوڑوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ کول اور زاہد اندر خیمے میں ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر خاموشی سے سہجے ہوئے بیٹھے گئے کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ کہیں وہ لوگ اندر خیمے میں نہ گھس آئیں اور انہیں دیکھ نہ لیں۔

اگر ایسا ہو گیا تو پھر کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔

کول بھی لمبی لمبی مونچھوں والے اور پرانے وفاداروں کو ڈسنے کے بعد خیمے میں واپس آ گئی اور آتے ہی کہا

سرتاج گاؤں والوں نے اپنے بچاؤ کے مکمل انتظامات کر رکھے ہیں۔ ہر مکان کی چھت پر دو محافظ بندوقس سنبالے پہرہ دیتے ہیں۔ میں تو خود وہاں پھنس گئی تھی۔ بہت مشکل سے ان ذیلیوں کو مارا ہے، ڈسا ہے۔ اب یہاں سے بہت دور چلے جانا چاہئے ہمارے انتقام کی آگ اب ٹھنڈی ہو گئی ہے مجھے اپنی فکر نہیں صرف زاہد جان آپ کی فکر ہے کہ آپ کو کچھ نہ ہو۔

کول تم ٹھیک کہتی ہوں میں کسی بزرگ کی تلاش میں ہوں۔ کرن آزاد ہو جاتی ہے تو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چلے جائیں گے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔

میں آج پھر جاؤں گی مہارانی کو ختم کرنا ہے۔ پس وہی میرا آخری شکار ہے کیونکہ اس نے ہم پر گولیاں چلائی تھیں، ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ آپ اپنا کام کریں اور میں اپنا کام کرتی ہوں۔ یہ کہہ کر کول دوبارہ گاؤں چلی گئی لیکن دوبارہ واپس نہ آئی شاید پکڑی گئی تھی یا ابھی تک مہارانی کو مار نہ سکی تھی۔ اسے ڈس نہ سکی تھی۔

رات ہوئی تو اچانک ایک بزرگ گھوڑے پر سوار آئے اور آتے ہی بندھی کرن کو آزاد کر کے چلے گئے۔ یہ بزرگ کون تھے، دونوں ہی دیکھتے رہ گئے، سوچتے رہ گئے۔

جانتی ہو کرن کول کا جسم گولیوں سے پھلتی ہے، تن کے کپڑے خون سے لابلاب پڑے ہیں، کیسے بھول جاؤں ان لمحات کو جب وہ مجھے بچاتے بچاتے میرے سامنے ہی تڑپ رہی تھی، کہہ رہی تھی میرے محبوب بھاگ جاؤ اپنی جان بچائیں، میری فکر نہ کریں میں آپ کے لیے ہی ناگن سے انسان بنی تھی اور آپ کے لیے ہی مرنا چاہتی ہوں کتنی عظیم قربانی دی ہے اس نے اور میں! ہاں کرن میں بھی اس کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ ایک ایک سے یہ یہاں جتنے سفید گھوڑوں والے آتے ہیں ناں سبھی کو ختم کرنا ہے۔ سبھی کو تباہ کرنا ہے کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا ہے کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا۔ کرن سحر ہونے سے پہلے پہلے تم طوفان بن جانا کرن مسکرائی۔

سحر ہونے قبل ہی طوفان چلنے لگے، زمین لرزنے لگی ایسے جیسے زلزلے برپا ہوں۔ ان دونوں نے کول کو بہت تلاش کیا لیکن وہ نہ ملی شاید گرے مکانوں کے نیچے دب گئی تھی، کہیں سے بھی نظر نہ آ رہی تھی۔ اپنے تمام ٹھکانے تلاش کر لیے لیکن کول دکھائی نہ دی۔

قابو میں رکھا۔ صرف باتیں سنتی رہی۔

اتنے میں گاڑی آ گئی۔ بابا نیچے اترا اور کرن کے قریب آ گیا۔ اسے بغور دیکھنے کے بعد بولا ہم لوگوں کو تنہائی میں چھوڑ دو۔ اگر ابھی اسے ختم کیا تو ہماری جانوں کو بھی خطرہ ہے کیونکہ یہاں چھپی تمام آسپی مخلوق حملہ آور ہو جائے گی۔ یہ پزیر معمولی چیز نہیں ہے اس کے پیچھے بہت بڑی طاقتیں ہیں تم لوگ واپس لوٹ جاؤ۔ صبح تمہیں خوش خبری مل جائے گی۔ اس کے جلنے کی خبر مل جائے گی۔ تمام لوگ بھاگ نکلے کیونکہ وہ اپنے گاؤں کی بربادی پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ کرن ان کے سامنے ایک مرتبہ پھر بے بس کھڑی تھی اور وہ بابا شہزادی کے حسن میں کھویا ہوا تھا۔ گھور گھور کر دیکھ جا رہا تھا۔

اتنے میں زاہد آہستہ آہستہ تہہ خانے سے باہر نکلا اور بغیر آہٹ کے چلتے ہوئے بابا کے کندھے کو جا پکڑا جونہی بابا نے گھوم کر پیچھے دیکھا تو اسے جیسے کرنٹ لگ گیا تھا لرز کر رہ گیا اور پھر زاہد کی جلتی آنکھوں کے نشانے سے بچ نہ سکا۔ پندرہ بیس منٹ میں ہی اس کے جسم کی کھال نیچے گرنے لگی۔ ہڈیاں نظر آنے لگیں جب ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تو زاہد اسے گھینٹے ہوئے تہہ خانے میں لے گیا اور بکھری ہڈیوں میں اس کی ہڈیاں بھی شامل کر دیں لیکن اب تہہ خانے میں کول نہ تھی۔ لمحوں میں وہ غائب ہو گئی تھی وہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی ان تینوں پر ہاتھ اٹھائے۔

زاہد جان گیا کہ وہ ضرور گاؤں گئی ہے۔ دشمنوں کا خاتمہ کر کے ہی آئے گی۔ کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔ وہ لوگ یہاں پھر آ گئے۔ کرن کو زندہ سلامت دیکھ کر یہ بات سمجھ گئے کہ بابا تو بھاگ گیا ہے یا پھر زاہد کی آنکھوں کا نشانہ بن گیا ہے۔

آتے ہی گرج کر بولا کہاں ہے وہ کی کہیں بتا دے ورنہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، خاک میں ملا دیں گے۔ ساتھ ہی گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ کرن جکڑی ہوئی مسکراتی رہی قہقہہ لگاتی رہی۔ بابا اسے لے کر شہر گیا ہے۔ وہاں جائیں مل جائے گا اتنی بات سنی تھی کہ وہ لوگ واپس بھاگ گئے اور دوبارہ یہاں نہ آئے شاید شہر میں ہی زاہد کو تلاش کرتے رہے۔ وہاں ہی اسے ڈھونڈتے رہے۔

زاہد نے خدا کا شکر ادا کیا۔ جلدی سے باہر نکلا کرن کو دیکھا جو مسکرا رہی تھی۔

سرتاج اگر میں ان زنجیروں سے آزاد ہو گئی تو پھر دیکھنا کیسا انتقام لیتی ہوں۔ گاؤں میں لاشیں بکھیر دوں گی، گلیوں مکانوں کو خون سے سرخ کر دوں گی۔

اپنے زہریلے دانت گاڑے جا رہی تھی اور وہ تڑپ رہا تھا۔ جاگیردارنی اپنی جان بچانے کی غرض سے چھپ گئی تھی۔

کرن ایک طوفان بن چکی تھی حفاظت کرنے والوں کے جسم اکھڑ رہی تھی۔ ان کے جسموں کی چیر پھاڑ کر رہی تھی۔ پہلے والا منظر وہاں دیکھا جانے لگا تھا تمام گاؤں کو صفحہ ہستی سے مٹایا جا رہا تھا۔ بزرگ جلتے جلتے ہڈیوں کا ڈھانچہ بننے لگا۔ دوسرا بزرگ تڑپتے تڑپتے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

کول نے ایک نظر کچھ دور کھڑے ہوئے اپنے محبوب کو دیکھا تو اس کی گہری نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے شرم کر رہ گئی۔

زاہد آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا کول کہاں کھو گئی تھی تو کہاں چلی گئی تھی تو، کیوں چھوڑ گئی تھی اپنے زاہد کو یکدم سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔

قید کر لیا تھا جاگیردارنی کے نوکروں نے مجھے پنجرے میں بند کر دیا تھا۔ کہتے تھے ان دونوں کو پکڑیں گے تو تیرے سامنے کلکڑوں کو کتوں کے آگے ڈالیں گے۔ یہ تو امام دین کی مہربانی ہے کہ اس نے مجھے آزاد کر دیا اور میں یہاں چلی آئی۔ یہاں آپ دونوں کو پھنسا ہوا دیکھا تو برداشت سے باہر ہو گئی۔

کرن تو کیسے آزاد ہوئی تیرے جسم سے کیسے خونی زنجیروں اتریں میں تو پنجرے میں بند سوچ رہی تھی کہ ظالموں نے تجھے آگ لگا دی ہوگی تیری زندگی ختم کر دی ہوگی۔

کول تو سچ کہتی ہے۔ اگر میں جکڑی رہتی تو ہو سکتا تھا کہ آگ میں جل جاتی۔ دھوئیں میں اڑ جاتی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بکھر کر رہ جاتی۔ ایک بزرگ گھوڑے پر ہواؤں کو چیرتے ہوئے فرشتہ بن کر آئے چند لمحے گھوڑا روک کر مجھے جکڑے ہوئے اور زاہد کو روتے ہوئے دیکھ کر رکنے اور پھر کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونک ماری۔

جکڑی زنجیریں غائب ہو گئیں میں آزاد ہو گئی۔ ان بزرگوں نے نہ تو مجھ سے کوئی بات کی اور نہ ہی زاہد سے جس رفتار سے آئے تھے اسی رفتار سے آگے بڑھ گئے اور اب آپ کے سامنے ہوں۔

لیکن زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ کہ کوئی شخص ایسا پھر آجائے جو ہم تینوں کو..... کرن کی اس بات نے دونوں کو چونکا دیا۔ کرن ہمیں لے کر بہت دور چلی جاؤ اب یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رکیں گے۔ پہلے مجھے میری بہنوں کی قبروں پر لے چلو تاکہ میں انہیں بتا سکوں کہ میری

تب کرن نے زاہد کو اٹھایا اور لمبی اڑان اڑی اور اس خطے میں آگئی جہاں ہر طرف سکون تھا دلفریب بہاریں تھیں یہ حصہ اب وطن عزیز پاکستان ہے۔

یہاں ہی زندگی گزارنے لگے لیکن زاہد کو یہاں ایک لمحہ بھی سکون نہ ملا۔ کول کو یاد کر کے روتا رہتا۔ اس کے بنا نجانے کیوں دنیا کے نظارے کھوئے کھوئے مرجھائے مرجھائے دکھائی دیتے تھے دو ماہ گزرے ہوں گے کہ زاہد کی حالت خراب ہو گئی۔ کول کی جدائی نے اسے بے موت مار دیا تو کرن سے کہا کہ مجھے وہاں لے چلو شاید وہ مل جائے زندہ ہو۔ کرن زاہد جان کو لے اڑی وہاں وہی خیمہ تھا ویرانہ تھا۔

زاہد بھاگتا ہوا کول کو تلاش کرنے لگا۔ کول کو پکارے جا رہا تھا کہ اس ویرانے میں ایک مرتبہ پھر چینیں گونگیں وہی نقاب پوش خاتون تھی اور یہ مہارانی تھی جو دو بزرگوں اور نوکروں کے ساتھ کھڑی تھی۔

بزرگوں کو دیکھ کر کرن سہمی کھڑی رہی اس کا جسم لرز رہا تھا چہرے کی رنگت بدلی ہوئی تھی۔ سامنے محبوب کو بھیگی آنکھوں سے دیکھ کر جا رہی تھی۔

دیکھ لیا تم نے ہمارا انتقام اس روز اگر ہم لوگ اس ذلیل کی کمین کی تلاش میں شہر نہ گئے ہوتے تو ہو سکتا تھا کہ حویلیوں میں ہم بھی دب کر مردہ پڑے ہوتے لیکن خدا نے ہمیں بچا لیا۔

میں جانتی تھی تم لوگ یہاں ضرور آؤ گے۔ کبھی نہ کبھی اس ناگن کی تلاش میں جو میرے قبضہ میں ہے۔ حویلی میں پنجرے میں بند ہے کیونکہ تم تینوں کو ایک ساتھ مارنا ہے سو تمہارا انتظار کرتی رہی۔ میرے اندر جلتی ہوئی انتقام کی آگ آج تم لوگوں کے خون سے ٹھنڈی ہو جائے گی۔

سنو چڑیل کالی شکل والی حویلیاں مسمار ہوتی ہیں سمنان نہیں ہوتی۔ ویران نہیں ہوتیں انہیں بسانے والا دیکھو یہ مالک ہے۔ ہاں جاگیردار جابر حیات۔ یہ راج کرے گا یہ حکمرانی کرے گا اور نجانے کتنے تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے۔ جلاڈالو اس چڑیل کو ایک مرتبہ پھر بزرگ کے ہونٹ ہلے۔ لیکن دونوں بزرگ اپنا منتر نہ پڑھ سکے۔ نجانے یکدم کول کہاں سے آگئی۔ لمحوں میں ہی وہاں سانپوں ناگوں نے ان سب کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ حفاظت کو آنے والے تمام نوکر چاکر بھاگ کھڑے ہوئے۔ زاہد کی آنکھیں جلنے لگیں۔ بزرگ زاہد کی آنکھوں کی پلیٹ میں آگیا نظروں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کول دوسرے بزرگ کی گردن پر

ایک ساتھ بیٹھ کر وعدہ کیا تھا کہ ہم ایک ساتھ جیں گے اور ایک ساتھ مریں گے۔ اب یوں اس وعدے کو توڑنا چاہتی ہو کیوں اپنے پیار کو کھونا چاہتی ہو دل جلانے والی رلانے والی باتیں آئندہ نہ کرنا۔

زاہد آنکھیں بند کئے نجانے کن سوچوں میں گم تھا ان دونوں کی باتیں سن کر مسکرایا اور بولا اب کوئی نہیں جائے گا کسی کو چھوڑ کر جدائی کی سخت ترین راہیں دیکھ لی ہیں۔ اب ان جدائیوں میں دوبارہ بھٹکنا نہیں چاہتا تم دونوں ہی میری ہو، دونوں ہی میرے دل کی رانیاں ہو۔ کوئل سچ کہتی ہے اور جو کوئل کہے وہی کرتا ہے۔ ویسا ہی کرتا ہے اس نے صرف تمہیں ہی نہیں مجھے بھی جیت لیا ہے۔ میرے پیار کو بھی جیت لیا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ نظروں کے سامنے ہے۔ اس نے میرے خاندان کا بدلہ لینے کے لیے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی ہے۔ کسی سے ڈری نہیں ہے، سینہ تان کر مقابلہ کیا ہے نہ حویلیوں والوں سے خوفزدہ ہوئی ہے اور نہ گاؤں والے اسے بے بس کر سکے ہیں جو اس نے کہا تھا پورا کر دکھایا اور کرن تم میں بھی کیا کمی ہے تم نے بھی ہر کسی کا مقابلہ کیا ہے دشمنوں کو بے بس کیا ہے دونوں نے جاتی ہوئی کرن کو روک لیا، دونوں نے ہی جدائی دینے والی کرن کو روک لیا۔ کرن مسکراتے ہوئے ایک دفعہ پھر کوئل کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ایک دفعہ پھر پیار بھرا بوسہ کوئل کے ہاتھ کا لیا۔

رات گہری ہوتی گئی۔ آج یہ تینوں آزاد فضاؤں میں بیٹھے اپنی اپنی کہانیاں سناتے جا رہے تھے۔ اس چیز سے بے خبر تھے کہ ابھی بھی دشمنوں کی سرزمین میں ہیں ابھی بھی ان کی حدود میں ہیں اور وہ کسی وقت کسی لمحے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ تو دشمنوں سے آزادی پا کر قہقہے لگانے میں مصروف تھے۔ ان کے قہقہوں کے ساتھ قبرستان کے دوسرے کونے سے بھی قہقہے ابھرنے لگے ان دونوں کے قریب بیٹھی کرن آگ میں جھلنے لگی تڑپنے لگی کیونکہ کسی کے منتر کا نشانہ بن گئی تھی۔ لمحوں میں ماحول تبدیل ہو گیا یہ منظر دیکھتے ہی کوئل اور زاہد تڑپ کر رہ گئے۔ نظروں کے سامنے ہی کرن ان سے بہت دور جانے کے لئے جل رہی تھی۔

زاہد چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا۔ کرن کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیوں جدائی دے رہی ہو، کیوں آنسو دے رہی ہو واپس لوٹ آؤ کہہ دو یہ سب جھوٹ ہے، تم نہیں سکتی ہو، جل نہیں سکتی ہو کوئل بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس بزرگ کو ڈسنے کی غرض سے بھاگ رہی تھی جو اپنے منتر سے کرن کو جلانے جا رہا تھا دھوئیں میں اڑائے جا رہا تھا۔

یہ بابا کہاں سے آ گیا تھا، کسی کو خبر نہیں دور سے ہی چھلاگ لگا کر کوئل نے اس

بہنوں! میں نے آج آپ کے تمام قاتلوں کو ختم کر دیا۔ سب اکڑی گردن والوں کو ختم کر دیا ہے جنہوں نے ہمارے تمام خاندان کو اجاڑا تھا۔ ہمیں برباد کیا تھا۔

یہ سنتے ہی کوئل دونوں کے لیے قبرستان آئی زاہد بہنوں کی قبروں پر کھڑا کافی دیر تک روتا رہا اور پھر بولا بہنوں! اگر تم زندہ ہوتیں تو دیکھ لیتیں کہ تمہارے بھائی نے کتنا بھیا تک انتقام لیا ہے۔ کس قدر دشت طاری کی ہے یہ سب تمہارے بھائی، کوئل اور کرن نے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو میرے لیے انمول تحفہ بنا کر بھیجا ہے۔ شاید یہ نہ ہوتیں تو میں بھی تمہاری طرح کسی قبر میں پڑا ہوتا۔ ان خالموں کے ہاتھوں جسم کی ہڈیاں تڑوٹے بیٹھا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے میری غائبانہ مدد کی ہے۔ دوسری مخلوقوں کے ذریعے میرا ساتھ دیا۔

رات کے سیاہ سناٹے میں تینوں دنیا والوں سے بے خبر قبروں کے قریب بیٹھے رہے۔

کرن کوئل کے ہاتھوں کو بوسے دینے لگی، سرمہ چومنے لگی نرم بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

کوئل بہن تم جیت گئی ہو تم نے وہ کام کر دکھایا ہے جو شاید میں بھی نہ کر سکتی تھی۔ زندگی کو داؤ پر لگا کر اپنے زاہد کے دشمنوں کو صفحہ ہستی سے مٹا ڈالا ہے۔ ایک ایسا انتقام لیا ہے جسے شاید زمانے والے صدیوں یاد رکھیں گے۔

میں جانتی ہوں کہ میں طاقت والی ہوں جو چاہے کر سکتی ہوں لیکن بندھی ہی رہی، اپنی طاقت کا کمال نہ دکھاسکی۔ لمحہ بہ لمحہ علم والوں کا سامنا ہوتا رہا۔ لمحہ بہ لمحہ موت کے شکنجے میں پھنسی رہی۔ کوئل تیری محبت انمول ہے، تیری چاہت لا جواب ہے، میں زاہد کے دشمنوں سے نہ ٹکرا سکی۔ اپنے پیار کو پانے کی غرض سے اسے لیے اڑتی ہی رہی بھاگتی ہی رہی۔

کوئل بہن یہ زاہد میرا نہیں تیرا ہے۔ اس پر میرا نہیں تیرا حق ہے، تو ہی اس کی رانی ہے۔ یہ لو اپنی امانت کو سنبھالو، اپنے پیار کو اپنی چاہت کو اپنا لو، میں تم دونوں کے درمیان سے جا رہی ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ باتیں کرتے ہوئے کرن رو دی۔

کوئل نے بھی روتے ہوئے کرن کے ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کرن اتنے مشکل سے تو ہم ایک ساتھ اکٹھے ہوئے ہیں پھر جدائیاں دینا چاہتی ہو، پھر رانا چاہتی ہو۔ یہ زاہد میرا نہیں ہم دونوں کا ہے۔ اس پر میرا ہی نہیں تیرا بھی حق ہے۔ تو بھی اس کی رانی ہے یہ صرف میرا پیار نہیں تیرا بھی پیار ہے تو بھی اس کی داسی ہے۔ وہ وقت یاد کرو جب ہم نے

بابے کی گردن دبوچ لی قبرستان میں نجانے یکدم اتنے انسان کہاں سے آ گئے، کیسے انہیں پتہ چل گیا کہ یہ تینوں قبرستان میں ہیں شاید زاہد کی چیخیں سن کر بھاگے آئے تھے۔ پہلے گولیاں چلیں پھر قہقہے بلند ہونے لگے۔ کوئل اپنا زہر اس بابے میں ڈالنے کے بعد قہقہے لگاتے لوگوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی گولیاں کیوں چلی تھیں، کہیں اس کا محبوب، ان گاؤں والوں نے اسے پکڑ تو نہیں لیا، اسے مار تو نہیں دیا اکیلے میں اسے ختم تو نہیں کر دیا، جسم کا قہر تو نہیں بنادیا۔

ایک سکتہ اس پر طاری تھا، دنیا کی ہوش بھول گئی تھی، سوچوں میں گم ہو گئی تھی۔ کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا سیاہ اندھیرا تھا کچھ خبر نہ تھی کیا ہو رہا ہے۔

چلتے چلتے، ریگتے ریگتے ایک درخت کی اوٹ میں ان لوگوں میں اپنے زاہد کو تلاش کرتی رہی اس کی نظروں کے سامنے ہی ایک شخص نے زاہد کا کٹا ہوا سر اوپر اٹھایا تو وہاں موجود لوگ بھگڑا ڈالنے لگے گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔ ہر طرف قہقہے تھے، خوشیاں اور مسکرائشیں تھیں۔ لوگ تو قبرستان سے باہر نکل گئے لیکن کوئل اپنے محبوب کی بہنوں کی قبروں پر بکھرے ہوئے خون سے اپنے ہاتھوں کو ریت لے گئی۔ صرف وہاں خون ہی بکھرا تھا زاہد کا مردہ جسم بھی نہ تھا وہ بھی لوگ گھیسٹ کر کھینچتے ہوئے ساتھ لے گئے تھے۔ اب وہ کسے پکارتی، کرن بھی جل کر ہواؤں میں بکھر چکی تھی اور زاہد بھی وہ اکیلی تنہا رہ گئی تھی، آنکھوں میں آنسو تھے تو چہرے پر وحشت اب وہ گاؤں والوں کو کیسے چھوڑ سکتی تھی، کیسے معاف کر سکتی تھی جس طرح اس کی دنیا اندھیری ہوئی تھی اسی طرح سب کی دنیا میں اندھیرا کر دے گی۔ ایک ایک کا خون چوس لے گی، ایک ایک کے جسم پر زہر انڈیل دے گی اب اس کے انتقام سے کوئی نہیں بچے گا۔

بہنوں کی قبروں کے سچ بکھرا ہوا زاہد کا سرخ خون دیکھ کر کوئل تڑپ رہی تھی، چلا رہی تھی اس کی تو دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔

ایسے لگتا تھا جیسے یہ دنیا بے رونق ہو لیکن گاؤں میں جشن تھا حوٹلی میں دھالیں ڈالی جا رہی تھیں۔ دیکیں پک رہی تھیں، قہقہے گونج رہے تھے ایک طرف خوشی تھی تو دوسری طرف اداسی، ایک طرف دھال ڈالے جا رہے تھے تو دوسری طرف بھیگی آنکھوں کے ساتھ کوئل ماتم کر رہی تھی، محبوب کی موت پر رو رہی تھی آپیں بھر رہی تھی۔

کرن تو بھی ساتھ چھوڑ گئی ہے اور زاہد تم بھی، کیوں تم دونوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے، کیوں لمبی جدائیوں میں ڈال دیا ہے اب زندہ رہ کر کیا کروں گی کس کے لیے جیوں گی؟

کس کے لیے دنیا گھوموں پھروں گی۔

وہ روتے ہوئے ریگتے ہوئے گاؤں کی طرف بڑھنے لگی۔

گاؤں میں مہارانی گرج رہی تھی کہ اس ظالم انسان نے بہت ستایا ہے، گاؤں والوں کو بہت جلایا ہے، بہت تڑپایا ہے۔ اب اس کا حشر کرنا چاہئے اس کے جسم کا قہر بنایا چاہئے یا جلانا چاہئے۔ حوٹلی میں یہ فیصلہ ہوا کہ جس طرح یہ لوگوں کو جلانا پکھلاتا رہا ہے اسی طرح اس کو بھی جلانا پکھلاتا چاہئے جن تیزابی آنکھوں سے یہ انسانوں کو گھورتا تھا ان آنکھوں کا قہر بنانا چاہئے۔ ایسا ہی ہوا دونوں آنکھیں کسے سر سے نکال دی گئیں اور کوئی سر پر تھپڑ مارنا کوئی چہرہ نوچتا اور کوئی کچھ کرتا۔

گاؤں کی اموات نظروں کے سامنے تھیں، تبھی تو لوگوں کے چہروں پر طیش تھا، آنکھوں میں وحشت تھی، اسے کفن پہنا دیا گیا اور ایک ویران جگہ پر اس کی میت رکھ دی۔ یہ پہلا جنازہ تھا جس کے ساتھ رونے والا کوئی نہ تھا، صرف قہقہے تھے مسکرائشیں تھیں، ہاں دور بہت ایک جگہ اجڑی ہوئی سہمی ہوئی اداسیوں سے لپٹی ہوئی غموں سے غم حال کوئل چیخ رہی تھی رو رہی تھی اس کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔

گولیوں کے زخموں نے اسے بھی تو غم حال اور کمزور کر دیا تھا اپنا بھی تمام خون بہہ چکا تھا۔ اب تو قسمت میں صرف آنسو تھے اداسیاں اور غم تھے دکھ اور درد تھے دور بہت دور اس کے محبوب کی اس کی چاہت کی اس کے پیار کی لاش پڑی تھی اور گاؤں والے اس کی لاش کو آگ لگانے والے تھے جسم کو کھلسا نوالے تھے دنیا سے ایک خوبصورت جسم کو ہڈیوں میں تبدیل کرنے والے تھے پھر یکدم آگ بھڑک اٹھی زاہد کی میت کے گرد لپٹا ہوا کفن جلنے لگا شعلے ابھرنے لگے لاش جلنے لگی جسم پکھلنے لگا..... ہڈیاں نظر آنے لگی جلتے کفن نے زاہد کی لاش کو جلا کر رکھ دیا۔

کفن جلا رہا لاش پکھلتی رہی چھڑا نیچے گرتا رہا دور بیٹھی کوئل کا سکتہ ٹوٹا۔ کرن کی جدائی محبوب کی موت کا مظہر نظروں کے سامنے آیا تو بھڑکی ہوئی آگ کی طرف بڑھنے لگی ریگتے لگی، آنکھوں میں خون اترتا ہوا تھا، چہرے پر وحشت تھی۔

بھلا اس کے محبوب کو مارنے والا کیسے بچ سکتا تھا اس جہنم میں اسے صرف مہارانی کی تلاش تھی اسی کی وجہ سے اس کا محبوب مرا تھا اس کے حکم سے اس کے جسم سے سر کو کاٹا گیا تھا اس کے حکم سے اس کے محبوب کو دفن کرنے کی بجائے جلایا جا رہا تھا۔ جلتے کفن میں محبوب کا جلتا ہوا

چہرہ دیکھ کر چیخی اور ایک چھلانگ لگا کر ہجوم میں سے مہارانی کی گردن کو دانتوں میں دبانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی مہارانی کمزور نہ تھی ہمت والی اور طاقت والی تھی ایک بھری ناگن کا وار ہوشیاری اور دلیری کے ساتھ ضائع کر دیا دوسرا حملہ کوئل نہ کر سکی کیونکہ پہلے ناکام حملے سے ہی وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں جاگری تھی اپنے محبوب کے اوپر جاگری تھی ابھی باہر نکلنے ہی والی تھی کہ آگ میں ہی گولیاں چلا دی گئیں آگ کی تپش اور گولیوں کے نشانے سے تڑپنے لگی خون میں لت پت اپنے محبوب کے ساتھ جلنے لگی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں شاید اپنے محبوب کے دشمنوں کو دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ اس کے محبوب اور اس کی اپنی موت پر کس قدر خوش ہیں۔

ایک ساتھ دو لاشیں جلنے لگیں مرتے وقت کوئل ناگن سے شہزادی بن گئی تھی اور شاید دنیا کو دکھانے والا یہ حسن آخری تھا جو بگڑتا جانے لگا تھا۔

زاہد کی طرح جھلنے لگا تھا نیچے زمین پر گرنے لگا تھا ہر طرف تھقبے تھے گاؤں والوں کو آزادی مل گئی تھی پھر تھقبے کیوں نہ گوئیں کم بختو تمہیں کہا تھا نا کہ حویلیاں مسمار ہوتی ہیں ویران نہیں ہوتیں اجڑتی نہیں مہارانی جلتے پکھلتے زاہد اور کوئل سے مخاطب تھی۔ یہ دیکھو مالک، چوہدری، 'نمبردار'، جاگیردار..... جابر حیات راج کرے گا اپنے باپ کی طرح اپنے دادا پر دادا کی طرح اب اس کی حکومت ہوگی اب اس کا راج ہوگا اب اس کے اشاروں پر ہر کوئی چلے گا ساتھ ہی تھقبے گوئیں گے دونوں دیوانے بھڑکتے ہوئے انتقام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے بعد آہستہ آہستہ بکھرتے رہے خاک ہوتے رہے مٹی بنتے رہے جتنا کفن جل گیا دونوں ہی ختم ہو گئے دونوں ہی خاک ہو گئے وہاں ویرانے میں دو قبریں بنا دی گئیں دو چاہنے والوں کی قبریں 'دو پریوں کی قبریں'۔

یہ دونوں قبریں ایک عرصہ تک لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنیں رہیں۔

ہندوستان کی سرزمین پر یہ دونوں قبریں کافی عرصہ تک نمایاں رہیں پھر نجانے کس حویلی، کس محل، کس بنگلے کی دیواروں کے نیچے دب گئیں۔ ایک اندھا انتقام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ایک عرصہ تک یہ کہانی لوگوں کی زبانی گونجتی رہی کافی عرصہ تک دہشت میں ڈوبی یہ داستان لوگوں کی رگیں خشک کرتی رہی انوکھے انتقام کے بھیا تک واقعات ایک زبان سے دوسری زبان تک آتے رہے اور پھر صدیوں پرانی یہ کہانی آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے دم توڑتے توڑتے بالکل ختم ہو گئی۔

(ختم شد)